عالمی سہ ماہی فلک

کتابی سلسلہ - 6

مدیر

احمد نثار

معاون مدیر

آفرین فاطمہ

اپنی انفرادیت سے اردو جہان میں اپنے تخلیقی دستخط ثبت کر چکے کناڈا میں مقیم **شاہین** کا ساتواں شعری مجموعہ

(غزلیں ۲۰۲۱ء)
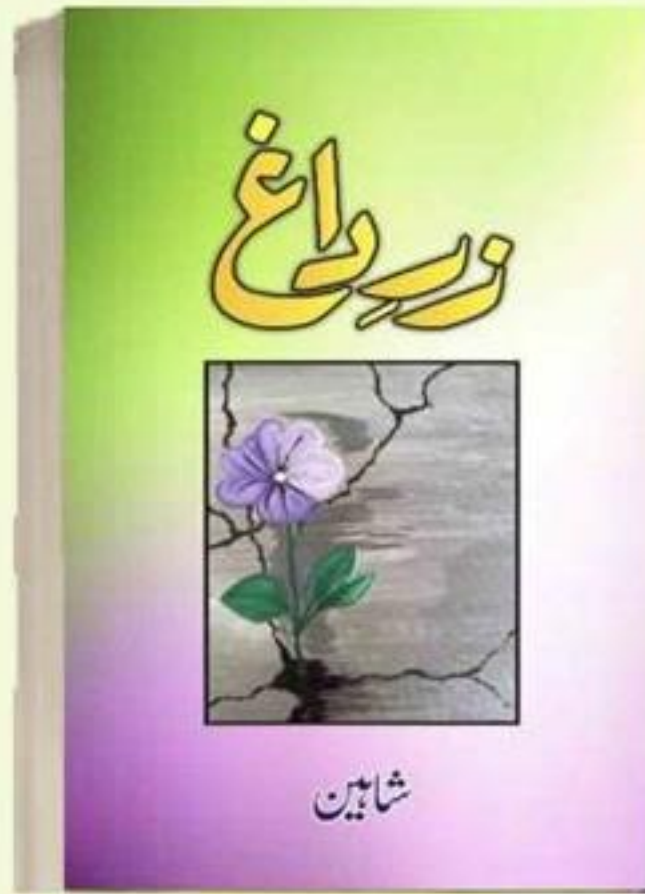
شاہین

شاہین غزل کے اشعار میں اپنے تجربے اور احساس کی فکری و فنی تہوں کو ان کی گہرائی تک کھولتے ہیں۔

موصوف کے دیگر شعری مجموعے

- شب نشین (نظمیں) ۲۰۱۸ء
- پیشتارہ (نظمیں) ۲۰۱۰ء
- کھلا دروازہ (غزلیں) ۲۰۰۹ء
- دہلیز پر پھول (غزلیں) ۲۰۰۵ء
- بے نشان (غزلیں نظمیں) ۱۹۸۴ء
- رگِ ساز (غزلیں نظمیں) ۱۹۶۷ء

زرِداغ کی سافٹ کاپی کے لئے برقی میل پر رابطہ کریں۔

E-mail : washaheen@hotmail.com

سہ ماہی ۔ کتابی سلسلہ۔۶

جلد : ۲ شمارہ : ۶

جنوری تا مارچ ۲۰۲۲ء

ISBN : 978-93-91105-08-2

مدیر : احمد نثار

معاون مدیر : آفرین فاطمہ

e-mail : aalamifalak@gmail.com
Contact No. : 8409242211

خط و کتابت اور ترسیلِ زر کا پتہ :

عالمی فلک، کڈس کیمپس، محمد علی روڈ، سیٹی کالونی، پوسٹ 'بی' پولی ٹیکنک، ضلع دھنباد، جھارکھنڈ-828130 (ہندوستان)
Aalami Falak, Kids Campus, Mohammad Ali Road, City Colony
Post : 'B' Polytechnic, Dhanbad, Jharkhand--828130 (India)

از راہِ کرم چیک یا بینک ڈرافٹ پر صرف Aalami Falak ہی لکھیں۔
Uco Bank, Branch Code : 000997 (Bhuli Branch)
A/c. No. : 09970210001349
IFSC Code : UCBA0000997 (For Money Transfer within India)
MICR Code : 826028008
SWIFT Code : UCBAINBB (For International Banking)
GooglePay, PhonePe : 8409242211

رقم ٹرانسفر کرنے کے بعد درج ذیل وہاٹس ایپ نمبر پر اپنا مکمل پتہ اور موبائل نمبر ضرور ارسال کریں۔

وہاٹس ایپ نمبر : 8409242211

AALAMI FALAK

Urdu Book Series - **6**

January to March - 2022

ISBN: 978-93-91105-08-2

Editor : **Ahmad Nesar** (8409242211)

Sub-Editor : **Aafreen Fatma**

اشاعت	:	جنوری تا مارچ ۲۰۲۲ء	
ہندوستان	:	زر تعاون فی شمارہ	چار شمارے (رجسٹر ڈاک سے)
		300/- روپے	1200/- روپے
امریکہ	:	45 ڈالر	180 ڈالر
برطانیہ	:	15 پونڈ	60 پونڈ
سعودی عرب	:	60 ریال	240 ریال
عرب امارات	:	60 درہم	240 درہم
یورپ	:	12 یورو	48 یورو

خصوصی معاونین/ادارہ جات سے دو ہزار روپے (سالانہ)

کمپوزنگ : پرنٹ ہٹ، واسع پور، بھولی روڈ، دھنباد، جھارکھنڈ- 826001

موبائل : 9852391575

طباعت : مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی ۔۲۵ 9811794822

■ ایڈیٹر، پرنٹر، پبلشر، نثار احمد نے مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی ۔۲۵ سے چھپوا کر محمد علی روڈ، سیٹی کالونی،

■ دھنباد-828130 سے شائع کیا۔

مشمولات

مضامین

فکشن

منظومات

انشائیہ

طنز و مزاح

اور زبانوں کا ادب

بنگلہ کہانی

ہندی نظمیں

اڑیہ نظمیں

تبصرے

مکتوبات

زیب غوری

عطائے خاص ہے یہ شرحِ آرزو بھی تری
ثناء بھی تیری ہے لفظوں کی آبرو بھی تری

ترا کرم ہیں یہ تیری نشانیاں، ورنہ
مری بساط سے باہر تھی جستجو بھی تری

چلا ہے بادِ صبا سے بھی کچھ پتا تیرا
رہی ہے کچھ گل ولالہ سے گفتگو بھی تری

مرے خدا مجھے گردابِ آگہی سے نکال
ڈبو نہ دے کہیں مجھ کو یہ آبجو بھی تری

ترا نشاں ہے فتح و شکست پر غالب
مری پناہ بھی تیری، صفِ عدو بھی تری

نواحِ دل میں کبھی اتنی روشنی تو نہ تھی
بھڑک رہی ہے بہت شمعِ آرزو بھی تری

ہوا میں رنگ ترے لہلہاتے سبزے کا
گھٹا میں روشنیِ موجۂ نمو بھی تری

یہ غم بھی دین ہے تیری یہ چارۂ غم بھی
کہ چاکِ دل بھی ہنر مندیِ رفو بھی تری

میں جس کو پی کے ہوں دونوں جہاں سے آسودہ
اس اک اشک سے سیراب آرزو بھی تری

اِدھر یہ خاک بسر زیبؔ بے ہنر بھی ترا
اُدھر وہ سطوتِ عرشِ ورائے سُو بھی تری

پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی

مدینے کو جو دل مچلے تو پڑھئے ربِّ سلِّم بھی
جو کعبے کے لئے تڑپے تو پڑھئے ربِّ سلِّم بھی
اگر غم حد سے بڑھ جائے تو پڑھئے ربِّ سلِّم بھی
پریشاں دل جو گھبرائے تو پڑھئے ربِّ سلِّم بھی
شبِ غم ، دور منزل ، ہو نہ رہ بر رہ نما کوئی
اندھیرا راہ میں چھائے تو پڑھئے ربِّ سلِّم بھی
انہیں کی شان میں صَلُّو علیہ حق نے فرمایا
خدا کے حکم پر چلئے تو پڑھئے ربِّ سلِّم بھی
اگر دامن میں اپنے رب کی رحمت چاہتے ہیں تو
کوئی افتاد پڑجائے تو پڑھئے ربِّ سلِّم بھی
محبت اور نسبت کا اگر آقا سے دعویٰ ہے
جب ان کا نام آجائے تو پڑھئے ربِّ سلِّم بھی
مناظرؔ کو غلامئ شہہ کونین کافی ہے
خدا کے آپ ہیں بندے تو پڑھئے ربِّ سلِّم بھی

اداریہ

عالمی فلک کا چھٹا شمارہ حاضر ہے۔

زیرِ نظر شمارہ کے مشمولات شعری ہوں یا نثری مختلف النوع موضوعات سے عبارت ہیں۔ یہ موضوعات شعر و ادب کے جن مسائل کی ترجمانی کرتے ہیں ان کی اہمیت سے انکار نہیں کہ یہ عصری پسِ منظر میں ہماری عام فکری روش اور شعوری نہج کی نشاندہی کرتے ہیں۔ تاہم حالیہ برسوں میں دُنیا جس تیزی سے نئے نئے واقعات و حادثات سے دوچار ہوتی رہی ہے وہ آج صرف زندگی کے دیگر شعبوں میں ہی نہیں بلکہ دُنیائے شعر و ادب میں بھی ہماری فکر و عمل کے لیے نئی ضرورتوں کا احساس دلاتے ہیں۔ واقعہ یہ ہے کہ ہم آج ایک ایسے بحرانی دور سے گزر رہے ہیں جس میں سب کچھ ٹوٹتا بکھرتا جا رہا ہے۔ تاریخی حقائق مسخ کر کے پیش کیے جا رہے ہیں۔ جمہوری اور سیکولر فکر و نظر کی جگہ ماضی کی فرسودہ قبائلی اور جاگیردارانہ قدروں اور ہماری گنگا جمنی تہذیب کی جگہ 'ہندوستانی تہذیب و تشخص' کے نام پر غیر حقیقی مذہبی اخلاقیات کو ہمارا 'عظیم قومی ورثہ' بتا کر نافذ کرنے کی سعی کی جا رہی ہے۔ قومی سے لے کر عالمی سطح تک پر سماجی انصاف کی دھجیاں چاروں طرف بکھری پڑی نظر آتی ہیں۔ انسانی حقوق کے تحفظ کے لیے بنائی گئی تنظیمیں سیاسی مفادات کا شکار ہو کر یا تو جانبدارانہ انداز و عمل اختیار کر چکی ہیں یا خاموش رہنے کو ہی مصلحت سمجھنے لگی ہیں۔ ویتنام اور کوریا کی جنگ کو ختم ہوئے اگرچہ ایک عرصہ گزر چکا ہے لیکن عراق، افغانستان اور لیبیا کے خلاف امریکہ کی حالیہ جنگ بھی آخری نہیں سمجھی جا سکتی۔ شام اور فلسطین میں آج بھی جنگ جاری ہے۔ دنیا سامراجی ممالک کے استحصالی فکر و عمل اور آپسی مفادات کے ٹکراؤ میں پھنس کر رہ گئی ہے۔ روس اور یوکرین کی تازہ ترین جاری جنگ کے پیچھے بھی سامراجی ممالک کے طبقاتی مفادات اور اُن کے آپسی تضادات ہی اصل محرک رہے ہیں جو تیسری دنیا کے حاشیے پر پڑے عوام پر اُن کے استحصال، دبدبے اور اجارہ داری کو برقرار رکھنے کی مذموم سعی کے علاوہ اور کچھ نہیں۔ جنگ خواہ کہیں ہو جنگ کسی مسئلے کا حل نہیں ہو سکتی۔ یہ صرف تباہی اور نئے مسائل کو ہی جنم دے سکتی ہے۔ ماضی میں دو عالمی جنگوں کے نتائج ہمارے سامنے ہیں

۔لیکن سوال یہ ہے کہ ایسی جنگوں کو کون روکے گا؟ دنیا کے باشعور عوام دوہرے معیارِ انصاف کو دیکھ کر حیرت زدہ ہیں۔ایک جو اپنی جنگ کو دہشت گردی کے خاتمہ کے لیے اور آزادی و انصاف کا ترانہ بنا کر پیش کرتا ہے وہی دوسرے کی ویسی جنگوں کو انسانیت کش اور جنگی جرائم پر محمول قرار دیتا ہے۔انصاف کون کرے گا ؟ایک طرف آج غریبی ،مہنگائی ،سماجی نا انصافی ،بے روزگاری اور طبقاتی استحصال کے ایجنڈے کی یا تو واقع ہوتی ہوئی موت یا مار ڈالنے کی شعوری کوشش تو دوسری طرف جنگ کے نتیجے میں لاکھوں کروڑوں افراد کے بے گھر و بے در ہو جانے کے واقعات سماج کے سنجیدہ و حساس ذہن کے سامنے یقیناً سوالات کھڑے کرتے ہیں۔اس صورتِ حال میں کیا ہماری حسیت اور شعور و ادراک کے محاسبہ کی کوئی ذمہ داری ہم پر عائد نہیں ہوتی؟ سوال یہ بھی ہے کہ گذشتہ برسوں میں ہم اپنے اطراف کی دُنیا کے بنیادی مسائل سے نظریں چرا کر رفتہ رفتہ اپنی ذات کے خول میں کیوں سمٹتے چلے گئے ہیں؟ ہم سطحی مظاہر میں الجھ کر صورتِ واقع کے اندرون کی حقیقت سے دور کیوں ہوتے گئے ہیں؟ ہماری معاشرتی فضا میں فکری خلاء پیدا کرنے والے لوگ کون ہیں اور ان کا مقصد کیا ہے؟ شاعر و ادیب سماج کے حساس ترین افراد ہوتے ہیں۔ان سوالات پر اُن کے لیے سنجیدگی سے غور کرنا آج وقت کی اہم ضرورت ہے۔کیونکہ زندگی سے وابستہ روشن اقدار اور عصری صداقتوں کی ترجمانی کرنے والا ادب ہی نیا اور زندہ ادب قرار پائے گا اور تب ہی اپنی اہمیت و معنویت کے سبب آنے والی صدیوں میں بھی پڑھا جاتا رہے گا۔تاہم اس کے لیے ہمیں اپنے قلم کو مصلحت پسندی کی زنجیروں سے آزاد کرنا ہوگا۔ہمیں سنجیدگی سے سوچنا ہوگا کہ ہم کیا لکھ رہے ہیں اور کس کے لیے لکھ رہے ہیں؟ نئے سماج کا ڈھانچہ کیسا ہوگا؟ اور نئے سماج کی تخلیق میں شعراء و ادبا کا کردار کیا ہوگا ؟ان سوالوں پر غور و فکر اور بحث و مباحثے کے بغیر بڑے ادب کی تخلیق ممکن نہیں۔

احمد نثار

ادب، دربار اور عصرِ حاضر

ڈاکٹر سرور حسین

یہ واقعہ ہے کہ شعر و ادب کا درباروں سے ایک زمانے تک گہرا تعلق رہا ہے۔ لیکن یہ ان دنوں کی بات ہے جب شعراء و ادباء کی سرپرستی براہ راست بادشاہوں، نوابوں اور رئیسوں کے زیرِ سایہ ہوا کرتی تھی۔ قدیم عہد میں شمالی ہند میں مگدھ اور جنوبی ہند کی ریاستوں میں شعراء، ادباء و تاریخ نویسوں کی درباروں سے وابستگی کے علاوہ عہدِ وسطیٰ میں ابوالفضل، فیضی اور عبدالرحیم خان خاناں جیسے اہلِ قلم اکبر کے نورتنوں میں شامل تھے تو خود ذوقؔ کو آخری مغل بادشاہ بہادر شاہ ظفر کے استاد کا درجہ حاصل تھا جس سے چڑھ کر ہی مرزا غالبؔ نے انھیں طنز سے نوازتے ہوئے کہا تھا ع

ہوا ہے شہ کا مصاحب پھرے ہے اتراتا

لیکن ۱۸۵۷ء کی جنگِ آزادی کی ناکامی، مغل حکومت کے زوال اور انگریزوں کے پوری طرح برسرِ اقتدار آ جانے کے بعد حالات میں جو نمایاں تبدیلی پیدا ہوئی اس کے سبب نہ تو درباروں کی وہ حیثیت باقی رہی اور نہ فراغت و طمانیت کا وہ ماحول رہا جس میں درباری ادب فروغ پا سکتا تھا۔ چنانچہ درباروں میں پرورش پانے والا شعر و ادب بدلے ہوئے حالات میں فرد کی نجی رہائش گاہوں، سماجی محفلوں، ادبی انجمنوں اور عوامی جلسہ گاہوں کو اپنے وجود کی روشنی سے منور کرنے کی طرف مائل ہو گیا۔

عالمی سطح پر بھی اٹھارویں صدی میں یوروپ میں سماجی نظام میں جس نئی تبدیلی کا آغاز ہوا اور جس کے تحت زمیندارانہ نظام کے خاتمے اور جمہوری نظام کے آغاز کے ساتھ قوم اور قومیت کے تشخص کے خیال نے فرد پر مخصوص جغرافیائی حدود کے اندر مشترکہ روایات، ان کے عمل و ردِّعمل میں پائی جانے والی یکسانیت، سماجی و مذہبی تقریبات میں شرکت، سماجی و معاشی مفادات کے مشترکہ تجربات اور ایک مخصوص زبان و ادب سے وابستگی کی قدیم روایات کے احساس کو مستحکم کیا۔ اس صورتِ حال نے سماج کی مختلف اکائیوں کے آزادانہ فروغ کی راہ ہموار کی تو زبان و ادب کے بھی آزادانہ فروغ کے امکانات روشن ہوئے۔ قومی تشخص کے فروغ کے عمل میں سماج کی مختلف اکائیوں کی طرح لسانی اکائیوں کے بھی آزادانہ فروغ کی اہمیت واضح ہوئی۔ سماج کے دیگر امور کی طرح شعر و

ادب کی تخلیق بھی کسی مطلق العنان حکمراں کی خواہش یا رضا کی مرہونِ منّت نہ رہی۔ بلکہ فکر و نظر اور تحریر و تقریر کی آزادی کے تصور نے تخلیقی عمل کو فرد اور معاشرے کی بقا اور فروغ سے وابستہ کر دیا۔ جمہوری نظام میں قومی تشخص کی تکمیل کے لیے سماج کی ہر اکائی کی آزادانہ مسابقت اور ارتقاء کی شرط لازمی ٹھہری۔ ماضی میں درباروں میں طے پانے والے شعر و ادب کے موضوعات اب کھیتوں، کھلیانوں، کل کارخانوں، دفتروں اور تعلیمی اداروں میں طے کیے جانے لگے۔ یہ مکمل طور سے ایک نیا عہد تھا جس نے ہر اس روایت کا خاتمہ کر دیا جو کسی حکمراں کی انفرادی خوشیوں کی ضمانت دیتی تھی اور ایسی روایات کی بنیاد ڈالی جو مشترکہ سماجی مفادات کے فروغ کی ضامن بنی۔ لہٰذا جمہوری ممالک میں سماج کی دیگر اکائیوں کی طرح زبان و ادب کے بھی آزادانہ ارتقا کی راہ روشن ہوئی۔

تاہم قومی سطح پر ہمارے ملک میں آزادی کے بعد جس معاشرے کی تشکیل عمل میں آئی وہ نئے تقاضوں کی تکمیل سے یکسر قاصر رہی۔ آزاد ہندوستان کے دستور سازوں نے ہمارے آئین میں جمہوری قدروں کے نفاذ اور فروغ کی بات ضرور کہی لیکن عملی طور پر ہم ماضی کی زمیندارانہ فکر و روایات سے خود کو آزاد نہیں کر سکے۔ چنانچہ آزادی، مساوات اور بھائی چارے کے تمام تر بلند بانگ دعووں کے باوجود ماضی کی وہ قدریں جو اب فرسودہ ہو چکی ہیں ان سے ہمیں آج تک نجات نہیں مل سکی ہے بلکہ ہمارا سماجی و سیاسی نظام ان فرسودہ اقدار و روایات پر 'ہندوستانی یا مشرقی تہذیب و تمدن' کا لیبل لگا کر اس کی حفاظت میں گزشتہ پونے ایک صدی سے مسلسل مصروف رہا ہے۔ قوم اور قومیت کا جو تصور مغرب کے جمہوری نظام نے پیش کیا ہمارے سماجی نظام میں اس کی وضاحت نہیں ملتی۔ مغرب میں جمہوریت آزادی فکر و نظر، مشترکہ مفادات اور مساوی حقوق کی جس ضمانت کی بات کرتی ہے ہمارے عصری سماجی و سیاسی نظام میں اس کے برخلاف یہ تنگ نظری، مفاد پرستی اور عدم مساوات کے اصولوں کی ہی ترجمانی کرتی ہے۔ جمہوریت اور قومیت کا بھی ایک دوسرے کے ساتھ گہرا تعلق تسلیم کیا گیا ہے۔ قومیت کا فروغ ایک جمہوری نظام میں ہی ممکن ہوسکتا ہے۔ جمہوریت ماضی کے زمیندارانہ نظام اور تہذیب و روایات سے یکسر مختلف ایک نئے سماجی نظام و تمدن کا نام ہے۔ تاہم یہ المیہ کہا جائے گا کہ قومیت کا تصور ہمارے عصری نظام میں 'مٹی پوجا' سے زیادہ کچھ نہیں رہا ہے۔ جمہوریت کے جو ستون بظاہر نمائش کے لیے کھڑے بھی کیے گئے تھے وہ گزشتہ ستر پچھتر سال کے دوران ایک ایک کر کے زمیں بوس ہوتے گئے ہیں۔ کھیتوں کھلیانوں، زمینوں، کل کارخانوں اور ملک کے روزگار کے وسائل پر عوام کے اختیارات کے علاوہ ایک جمہوری سماج عوام کی پسند و ناپسند، کھانے پینے، اٹھنے بیٹھنے، پہننے اوڑھنے کے ذوق و شوق سے لے کر اس کی زبان اور ادبی روایات کے فروغ کی جو آزادی دیتا ہے ہم اس سے محروم

ہوتے چلے گئے ہیں۔ سماجی تسلط کا یہ عمل ایسی صورتِ حال میں دیگر ذرائع کی طرح زبان وادب کو بھی ریاستی مشینری کے لیے عوام کے استحصال کا ہتھیار بنا دیتا ہے۔ کیونکہ یہ ریاستی اقتدار پر بیٹھے ہوئے طبقوں کے مفاد میں ہے کہ وہ مختلف اور کثیر اکائیوں میں بٹے ہوئے سماج کو واحد اکائی بتاتے ہوئے اپنے طبقے کے زبان وادب کو قومی لسانی اکائی کے طور پر سماج کی تمام اکائیوں پر نافذ کردے تاکہ سماج کی دیگر اکائیوں کے آزادانہ وجود کے دعووں کو دبا دیے جانے کی راہ ہموار ہوسکے۔

یہ واقعہ ہے کہ ہندوستان ایک کثیر القومیتی ملک ہے۔ یہاں چھوٹی بڑی سیکڑوں قومیتیں بستی ہیں اور ہر قومیت ہندوستانی ہونے کے علاوہ اپنی منفرد اور آزادانہ شناخت پر بھی اصرار کرتی ہے۔ اس میں اس کی دیگر ثقافتی سرگرمیوں کے علاوہ اس کی زبان اور اس کا ادب بھی شامل ہے۔ جمہوری تاریخ اس بات پر زور دیتی ہے کہ قومیتوں کی یہ کثرت آزادانہ ومساویانہ بنیاد پر ارتقا کے تاریخی مراحل سے گزرنے کے عمل میں ہی قومی وحدت کی شکل میں تبدیل ہوسکتی ہے۔ ایسی صورت میں اگر مروجہ سماج ان مختلف ومنفرد اکائیوں کے آزادانہ ارتقا کی راہ میں حائل ہو جائے تو سماج کے ساتھ اکائیوں کے ٹکراؤ کا عمل ناگزیر طور پر نہ صرف وقوع پذیر ہونے لگتا ہے بلکہ سماجی سطح پر انتشار اور نفاق کو جنم دے کر قومی فروغ کے عمل کو پیچھے دھکیل دیتا ہے۔ ہمارے قومی تشخص کی تکمیل کی ناکامی یا ادھورے پن کی وجہ بھی یہی ہے۔ ایسی ہی صورتِ حال میں جو معاشرتی، تہذیبی اور اخلاقی زوال جنم لیتا ہے اس کے نتیجے میں ایک طرف اگر سماجی تبدیلی کی ضرورت پر سماج کے باشعور طبقے کا یقین مستحکم ہوتا ہے تو دوسری طرف ایسی ذہنیت بھی فروغ پانے لگتی ہے جس میں ضمیر فروشی، دروغ گوئی، مفاد پرستی اور اقتدار میں حصہ داری کی خواہش کو پروان چڑھنے کا موقعہ ملتا ہے۔ اس کی کئی مثالیں ہمارے سامنے ہیں۔ اسّی کے عشرے میں پاکستان میں کتنے ہی مستند ادیبوں نے اپنے ذاتی مفاد کے حق میں جنرل ضیاء الحق کی خوشنودی حاصل کرنے کے مقصد سے پاکستان کی تاریخ کے اس بدترین عوام دشمن جابر حکمراں کے سامنے سرِ تسلیم خم کر دیا تھا۔ جس کے بعد یہ شعراء وادباء عوام کے درمیان 'درباری ادباء' کے لقب سے موسوم کیے جانے لگے تھے۔ پاکستان کے قیام کے ابتدائی دنوں میں بھی اردو کو پاکستان کی قومی زبان بنائے جانے کے پاکستانی حکمرانوں کے فیصلے کے خلاف 'اردو اور بنگلہ دو قومی زبان' کے نعرے کے ساتھ مشرقی پاکستان کے عوام سڑکوں پر اتر آئے تھے اور بالآخر اپنے مطالبات کو منوانے میں کامیاب رہے تھے۔ لیکن پاکستانی حکمرانوں کے اس عوام دشمن عمل نے عوام کے دلوں میں نفرت کا جو بیج بو دیا تھا اس کا نتیجہ آگے چل کر ملک کی جس تقسیم کی صورت میں ظاہر ہوا اس سے ہم سب واقف ہیں۔ ہمارے یہاں بھی ایمرجنسی کے دور میں اندرا گاندھی کے بیس

نکاتی پروگرام کی شان میں مدح سرائی اور نوے کے عشرے میں 'لالو چالیسا' لکھے جانے کی روایت رہی ہے۔ حالیہ برسوں میں ہمارے ملک کے اردو داں ادیبوں کے حلقے سے بھی آتی ہوئی ایسی آوازیں سنی جاتی رہی ہیں جو ہمیں حیرت زدہ کر دیتی ہیں، جس میں نہ صرف ہندی کو ملک کی قومی زبان بتانے بلکہ اسے ہندوستانی تہذیب کی واحد علامت قرار دیے جانے کا دعویٰ بھی شامل رہا ہے۔ بعض ایک نے تو اپنی منفرد دانشوری کا مظاہرہ کرتے ہوئے اسے دفعہ ۳۷۰ کے حوالے سے کشمیر کے طرز پر بزور شمشیر نافذ کر دیے جانے کا مشورہ بھی حکومت کو دے ڈالا۔ حال ہی میں کسی اہلِ نظر کی طرف سے قدیم 'ہندوستانی ثقافت' کے علمبرداروں کی سُر میں سُر ملا کر یہ بھی کہتے ہوئے سنا گیا کہ ہندی ملک کی مختلف تہذیبی اکائیوں کو ایک دھاگے میں پرو کر رکھنے والی واحد زبان ہے۔ جب کہ حقیقت ان تمام دعوؤں کو جھٹلاتی ہے۔ ہندی بے شک ملک کی دوسری تمام زبانوں کی طرح ایک اہم زبان ہے اور اسے بھی دوسری زبانوں کی طرح فروغ کا مساوی حق حاصل ہونا چاہیے۔ لیکن حقیقت یہ ہے کہ ہندی اس وقت ملک کی محض سرکاری کام کاج کی زبان ہے، قومی قطعی نہیں۔ جہاں تک ہندی کے ہندوستانی تہذیب کی واحد علامت ہونے کی بات ہے تو پہلی بات تو یہ ہے کہ ہندوستانی تہذیب کی جو تعریف ہمارے مقتدر طبقے کی طرف سے کی جاتی رہی ہے وہ ایک مخصوص مذہبی فکر و نظر کی ہی عکاسی کرتی ہے۔ جس سے اتفاق کیا جانا بے شمار مذاہب، عقائد، رسوم و روایات اور علم و منطق کی اہمیت سے آشنا مختلف تہذیبی اکائی والے ہمارے ملک میں ممکن نہیں۔ یہ بھی واقعہ ہے کہ تہذیب و ثقافت کوئی جامد شئے نہیں۔ بلکہ یہ ارتقاء پذیر ہوتی ہے اور بدلتے ہوئے وقت کے ساتھ نئے تقاضوں کی طالب ہوتی ہے۔ دوسرے 'ایک دھاگے میں پرو کر رکھے جانے' کی سچائی کے لیے بیسویں صدی کے پانچویں عشرے کو یاد کر لیا جانا چاہیے جب ہندی کو بطور قومی زبان نافذ کرنے کے مقصد سے بھارتی پارلیامنٹ میں بحث شروع ہوئی تھی تو اس کے ردِ عمل میں پورا جنوبی ہندوستان سلگ اٹھا تھا اور وہاں ہندی کے سیکڑوں بورڈ نذرِ آتش کر دیے گئے تھے۔ ابھی چند سال قبل بھی عوام کے شدید مطالبے پر بنگلورو کی ریلوے انتظامیہ کو وہاں کے ایک ریلوے اسٹیشن سے ہندی کے بورڈ کو انگریزی کے بورڈ سے تبدیل کر دینا پڑا تھا۔ ان حالات سے ہمارے دانشور یقیناً واقف ہوں گے۔ پھر بھی اگر وہ ایسے مشورے دے رہے ہیں تو اس کا مطلب ہے کہ یا تو قوم اور قومیت کی تفہیم اُن پر واضح نہیں یا کوئی ایسا مفاد اُن کے پیشِ نظر ہے جو بشمول اردو ملک کی دیگر علاقائی و قومی زبانوں کے حق میں قطعی نہیں۔ ظاہر ہے مقتدر طبقے کی ہر ایسی فکر و نظر سے اتفاق جو عوامی مفاد پر ضرب لگاتا ہو درباری رجحان کے فروغ میں معاون ہوگا۔ تاہم عصری جمہوری نظام زبان و ادب کی دربار سے وابستگی کی اجازت قطعی نہیں دیتا۔

کہیں کچھ کم ہے

علی احمد فاطمی

مضمون کے شروع کرنے سے قبل شہریار کا ایک شعر پیش کرتا ہوں۔

زندگی جیسی توقع تھی نہیں کچھ کم ہے
ہر گھڑی ہوتا ہے احساس کہیں کچھ کم ہے

زبیر رضوی جو نظم کے اچھے شاعر تو تھے ہی ایک اچھے رسالہ کے مدیر بھی تھے۔ اپنے رسالہ ذہن جدید کا نظم نمبر شائع کیا تو اس کے اداریہ میں لکھا۔

''اس سناٹے کو محسوس کر کے ایک ہول سا اٹھتا ہے کہ نظم جس کے آج اور کل میں بھی بڑی شاعری کی جاسکتی ہے وہ مابعد جدیدیت کے برسوں میں تخلیقی سرخوشی ہی تربتر ہونے کو کیوں ترس گئی؟''

اسی شمارے میں ممتاز نقاد اور شاعر فضیل جعفری تو یہ تک لکھ گئے۔

''میری ناچیز رائے میں آج کا دور شاعری کا دور ہی نہیں ہے۔ یہ نثر نگاری کا دور ہے۔ فی زمانہ اردو میں جو بھی دو چار سو قاری ہیں وہ شاعری کے مقابلے سوانح نگاری، خاکہ نگاری، فکشن نگاری سے زیادہ دلچسپی رکھتے ہیں۔''

فضیل جعفری تو پھر بھی سنیئر ہیں۔ ہمارے عہد کے نظم کے مقبول شاعر عبدالاحد ساز نے بھی ایک جگہ لکھا۔

''ادب پر جمود طاری ہے۔ شعری حالت ابتر ہے۔ بلاتفریق نظم وغزل تخلیقی شاعری کے راستے کے نئے مسافر خال خال ہیں۔''

ہم سب واقف ہیں کہ اردو شاعری میں صنف نظم کی طول طویل اور صحت مند روایت اور تاریخ ہے جس نے غزل کے متوازی اپنی مستند حیثیت قائم کی اور مخالفین سے بھی منوائی۔ ہر عہد کی شاعری میں تاریخی وتہذیبی مواد رہتا ہے جو تخلیق کے آہنگ کے ساتھ فکری وشعوری آہنگ سے دربستہ ہو کر اپنی شناخت قائم کرتا ہے۔ لیکن اس شناخت کا رشتہ یک لخت روایت وکلاسیکیت سے منقطع بھی نہیں ہوتا۔ پھر اس میں نیا

کیا ہے اور نئے پن کی تلاش کس طرح ہو، یہ اپنے آپ میں ایک سوال ہوتا ہے۔

۱۹۷۲ء میں ممتاز شاعر نقاد خلیل الرحمٰن اعظمی نے نئی نظم کا سفر ترتیب دیا تھا تو لفظ نئے کے بارے میں اپنے مقدمے میں لکھا۔

''جب ہم نئی نظم کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ یہ کسی پرانی نظم کا اعادہ یا تکرار نہیں ہے۔ اعادہ یا تکرار میکانکی یا مشینی عمل ہے مگر تخلیقی عمل اعادہ نہیں ہوتا۔ یعنی جب کوئی نیا تجربہ یا کیفیت شاعر کو نظم لکھنے پر آمادہ کرتی ہے تو تخلیقی عمل اس کے لئے نئی صورت یا ہیت مہیا کرتا ہے۔ اس طرح نظم کو ایک نئے وجود کی حیثیت مل جاتی ہے۔''

نیا تجربہ، نئی حسیت، نیا وجدیہ غور طلب عناصر ہیں جو غور طلب سے زیادہ بحث طلب ہو جاتے ہیں اس لئے کہ تجربہ کا تعلق سماج اور افراد سے ہوتا ہے۔ زندگی کے بدلتے ہوئے اقدار، رویّوں اور طور طریقوں سے ہوتا ہے لیکن کچھ لوگ اس سے اختلاف بھی کرتے ہیں وہ ادب اور ادبی اصناف و تخلیق کو خود مکتفی کرنے کی غرض سے کہیں سے کہیں چلے جاتے ہیں انہیں تجربات و تغیرات سے کچھ لینا دینا نہیں ہوتا۔ احتشام حسین نے ایک جگہ لکھا ہے۔

''ہر زمانے میں نیا ہو یا پرانا کچھ انسانی مسائل ایسے رہے ہیں جنہیں شعراء نے اپنا موضوع بنایا ہے۔ یہ مسائل اپنی ذات سے متعلق بھی ہو سکتے ہیں اور ذات سے باہر ان باتوں سے بھی۔ ذات جن کا ادراک کر سکتی ہے۔ یہ مسائل گوناگوں اور لاتعداد ہیں اور ذاتی تجربے اور شعور کی رنگارنگی سے طرح طرح سے ظاہر ہوتے ہیں۔ جنہیں ہم مختلف علوم کی مدد سے یا جذبات کی نوعیت کے لحاظ سے کچھ موٹی موٹی قسموں میں بانٹ لیتے ہیں اور انہیں کی بنیاد پر رائے قائم کرتے ہیں کہ شاعری کے موضوعات کیا ہیں جو ہر عہد میں نئے حالات کے ماتحت جذباتی یا ذہنی تحریک پیدا کرتے رہیں گے۔''

(جدید شاعری) جدید ادب منظر پس منظر

یہ بات غلط ہو یا صحیح لیکن سچ ضرور ہے کہ شعر و ادب کی نئی گفتگو ترقی پسندی، جدیدیت اور مابعد

جدیدیت کے اصطلاحی مرغولوں سے باہر آچکی ہے لیکن کچھ انسانی اور سماجی قدریں بہر حال ہمارا پیچھا نہیں چھوڑتیں اور اس کے فکریاتی زاویے بھی تخلیق سے الگ نہیں ہوتے۔ ہم کتنا ہی نیا تلاش کریں لیکن سارا کہ سارا نیا ہو ایسا ممکن نہیں لیکن یہ بھی سمجھنا چاہئے جو نیا ہے وہ پرانے سے ہی پیدا ہوا ہے۔ البتہ وہ اپنے زماں و مکاں میں ڈوب کر اپنے حالات وتغیرات سے متاثر ہو کر ایک نئی حسیت کے ساتھ وجود میں آتا ہے تب کچھ بدلا بدلا نظر آنے لگتا ہے لیکن ایسی مثالیں کم ہی نظر آتی ہیں۔ میری نظروں کے سامنے کچھ تازہ ترین شعری مجموعے اور رسالے ہیں انہیں کے حوالوں اور مثالوں کے ذریعہ گفتگو کو آگے بڑھاؤں گا۔

پہلا مجموعہ شعیب نظام کا ہے عکسِ گم گشتہ جس میں غزلیں زیادہ ہیں لیکن نظمیں بھی ہیں۔ شعیب نظام کی تربیت اگرچہ جدیدیت کے سایے میں ہوئی لیکن تازہ ترین صورتوں میں ان کی نظموں میں ایک نئے جہانِ معنی کی آرزو دکھائی دیتی ہے۔

مدت گذری
صدیاں بیتیں
آج بھی ہم بنجارے ہیں
سارے جنگل اور گپھائیں
اب بھی ہم میں زندہ ہیں
لیکن یہ اسرار ہے کیسا
ہم میں پھر وحشت ہے کیسی
کس خوشبو کا پیچھا کرتے
جنگل کی مانوس فضا سے
شہر کی جانب بھاگ رہے ہیں
سوئے ہیں یا پھر جاگ رہے ہیں (وحشت)

ایک اور نظم سرگوشی کا یہ اقتباس دیکھئے۔

ہاتھ میں تیغ ہوس آنکھ میں امید لئے
اپنے خوابوں کا محافظ بن کر

وار پر وار کیئے جاتا ہوں

پھر بھی یہ جنگ ہے جانے کیسی

سر تو ہوتی ہے یہ فیصل نہیں ہونے پاتی

اپنے بچپن سے ضعیفی کی حدوں تک میں بھی

بر سرِ جنگ ہوں دیکھو اب تک

اک ذرا ہاتھ جوڑ کتا بھی ہے ستانے کو

کوئی سرگوشی سی کر دیتا ہے

کم نظموں میں بھی نظام کا فکری نظام ظاہر ہو جاتا ہے۔

تازہ ترین مجموعوں میں ایک مجموعہ خالد عبادی کا ہے۔مگر ہم نثری نظموں کو نظم مان لیں تو چند نظموں کے ٹکڑے دیکھیے۔

نیم روشن شام میں ،نیم سیاہ دودھیا آسمان

مائیں، فاختائیں ،فرشتوں کی طرف ہمکتے بچے

بارش کے بعد دھندلا دھندلا منظر

ہوس نثاری، عشق گزیدگی ، زہر پیتی معرفت

ٹوٹی پھوٹی سڑکیں

کیچڑ نصیب گلیاں

ریزگاری سے بھڑکتی ہوئی قوم

سرشاری میں ڈوبی ہوئی یادیں

یادوں میں ڈوبا ہوا دل

مسجد ،مندر ،گرجا گھر ،گردوارہ حبشہ کی شراب

ایک محل پیشہ سفید پوش باپ اور کبھی کبھی ہو بہو بے سرو قد ماں کی شیشہ گداز بیتی

بدحال بج بجاتا ہوا اکثریت زدہ آبائی قبرستان

آس پاس دو چار پانچ دس

جھگی جھونپڑیاں (بہ خوش بہ خوشی)

نظم کے محض ایک اقتباس میں پوری زمینی حقیقتیں سمٹ آتی ہیں۔ ان حقیقتوں کے پیچھے ''کیچڑ نصیب گلیاں'' اور ''ریز گاری سے بھڑکتی ہوئی قوم'' اس سے نظم کا کینوس بڑا ہوتا ہے اور قاری کی تفہیم کی رینج بھی بڑھتی ہے۔ایک اور نظم کا یہ ابتدائی ٹکڑا دیکھئے۔

زندگی اس نظم کی طرح ہے

جو بغیر موسیقی

بغیر برش

بغیر تپش

اور بغیر حسن کے نہیں لکھی جاسکتی

اس اقتباس سے جمالِ کائنات کی تصویر تو ابھرتی ہی ہے ساتھ ہی شاعر کے تصورِ شعری کی بھی ابھرتی ہے۔گذشتہ دنوں ممتاز شاعر قمر صدیق کا شعری مجموعہ شب آویز نظر سے گذرا۔غزلیں زیادہ ہیں لیکن چند نظمیں متوجہ کرتی ہیں ایک نظم ہے جیون کیا ہے؟ اس نظم کا سوالیہ عنوان ہی شاعر کے متجسس ذہن اور زندگی کی رمزیت کا اشارہ کرتا ہے۔

جیون کیا ہے

آگ ہوا پانی اور مٹی

ان چیزوں کا کھیل ہے سارا

سانسوں کا سانسوں کا رشتہ

پل دو پل کا میل ہے سارا

اور نظم ختم ہوتی ہے

ہم عاشق ہو جائیں

کچھ مٹی کی بھینی بھینی خوشبو پر

سوالیہ نظم تو اپنے آپ سنجیدہ روپ لے لیتی ہے لیکن یہ چھوٹی سی نظم مزید سنجیدگی کے بجائے آرزومندی میں تبدیل ہو جاتی ہے۔ بڑے شہر کے شوروغل اور کانکریٹ کے جنگل میں سانس لینے والے

شاعر کی کچی مٹی کی بھینی بھینی خوشبو کی خواہش اسے ایک نیا روپ دے دیتی ہے۔ایک اور سوال نما نظم دیکھئے۔

کہاں گئے وہ سارے جنگل

ہاتھی گھوڑے لومڑی چیتے

رامو بندر رجھا موسیار

کہاں گئے وہ سارے شیر

لیکن سوال کے ساتھ جواب اور جواب میں طنز ملا ہے۔

شہر بذاتِ خود جنگل ہے

کوڑا کرکٹ ہریالی ہے

کمپیوٹر کے پردے پر

ہاتھی گھوڑے سب آتے ہیں

اب تو ماڈل بن بیٹھے ہیں

شہر کی ہنگامیت ، بھاگا دوڑی ، امن وسکون سے دوری، ان دنوں اردو شاعری کے اہم موضوعات بنے ہوئے ہیں۔ بلاشبہ یہ آج کی حقیقت ہے یوں بھی اردو شہری زبان ہے اس لئے اس میں شہر کا در آنا فطری ہے لیکن یہ فطری عمل، فکری عمل، وتخلیقی عمل بن جائے اچھی بات تو ہے لیکن شاعر کا ذہن اور وژن اسے کتنا بڑا تخلیقی تجربہ بناتا ہے اور زندگی کے بڑے تصور سے جوڑتا ہے اور نظم کتنی گہرائی ، نفسیاتی و جمالیاتی عمق وافق سے گذرتی ہے، اصل مسئلہ یہ ہے۔

اب میں دو نہایت جانے مانے سنجیدہ وسینئر شاعروں کی دو ایک نظمیں پیش کروں گا۔ ان میں سب سے پہلے ش ک نظام ہیں۔ نظام کی نظموں کے دو ایک اقتباس ملاحظہ کیجئے۔

تعبیروں کی خاطر ہم نے

کب دیکھے ہیں

خواب

تعبیریں دنیا دیکھے گی

ہم دیکھیں گے

خواب!
اگر ہو سکے تو نئے خواب دیکھیں
پرانی کتابوں کے بوسیدہ پنوں پہ تحریر
تعبیریں
سچ ہیں لیکن
نئے خواب کی بھی پرانی ہو تعبیر
ممکن نہیں
ہے
تعبیر پڑھنا بھی اچھا ہے لیکن
آخر انہیں ہم کہاں تک پڑھیں گے
اگر ہو سکے تو نئے خواب دیکھیں

زندگی اور وہ بھی پرُ آشوب زندگی میں خواب دیکھنا ہر اعتبار سے روشن فکر اور ذہن کی کشادگی کو ظاہر کرتی ہے۔ایک بار ممتاز افسانہ نگار اور دانشور عابد سہیل نے راقم سے کہا تھا کہ اگر سچا ترقی پسند ادیب بنا ہے تو خواب دیکھنا بند مت کرنا۔ جاگتی آنکھوں کے خواب۔ پھر میں نے یہ بھی دیکھا کہ ساد کے ایک مجموعہ کا نام ہے''آؤ کہ کوئی خواب بنیں'' سردار جعفری کا بھی ایک خواب اور۔لیکن ان خوابوں میں ایک سماجی تفکر تھا۔انسان اور انسانی معاشرہ کے تئیں فکر مندی اور بے چینی۔اس کے برعکس نظام کے خواب میں درویشانہ صفت ہے۔ دنیا سے بے نیازی اور دوری جو درویشی اور فقیری کا وصفِ اول ہے جس سے ایک مخصوص صوفیانہ تیور وآہنگ بنتا ہے اور اسی تیور سے ہی یہ مصرے ایک خاص معنی خیز آہنگ میں ڈھلتے ہیں۔

تعبیریں دنیا دیکھے گی
ہم دیکھیں گے خواب

خواب دیکھنے کے تئیں جو تیقن ہے اس میں تفکر بھی ہے اور تصوف بھی اور یہی نظام کو ایک منفرد شاعرانہ رنگ دیتی ہے اور نظم میں معنی خیز اعتماد، نظام کی نظموں کا یہ مخصوص آہنگ کبھی کبھی فلسفانہ رنگ اختیار کر لیتا ہے۔ایک اور نظم کا اقتباس دیکھئے۔

بیاضیں

جن کے سینے میں

سمندراورسورج کی عداوت کے تھے افسانے

پرندوں اور پیڑوں کے

رقم تھے

باہمی رشتے

ہمارے ارتقا کی الجھنیں

جن سے منور تھیں

بیاضیں کھوگئی ہیں

اب لفت ہم سے پریشاں ہے

سمندر اور سورج، پرندوں اور پیڑوں کے رشتے ، ارتقا کے سلسلے اور تُفث کا پریشان ہونا یہ سب ایسے تلازمے ہیں جن سے نظم میں تاریخ ،تہذیب ،فطرت ،فلسفہ سبھی شیروشکر ہوگئے ہیں ۔لفت کی پریشانی تو موجودہ علم و ادب کی پریشاں خاطری کا ایسا خوبصورت استعارہ بنتی ہے جو تازہ ترین ادب و سائنس کو اپنے گھیرے میں لے لیتی ہے۔

آبجو نظام کی ایک ایسی نظم ہے جس میں فطرت کے حوالے سے نظم کے خلق ہونے کا عمل نظام کا قدرت سے فطری لگاؤ کو فنکارانہ طور پر پیش کرتا ہے ۔ یہ ذکر اس لئے ضروری ہے کہ ان دنوں نظموں سے فطرت غائب سی ہوگئی ہے۔ ایسے میں فطرت کا استعارہ نظم میں شرارہ بھردیتی ہے۔آگ ، پانی ،سمندر، جنگل ایک درویش نما شاعر کے یہاں ہی جگہ پاسکتے ہیں۔ پھر محبت کا یہ پیغام۔

ایک دف ہوتم

دف ایک میں بھی یوں

لفظ کیوں نہ ہوجائیں

یہاں لفظ صرف لفظ نہیں رہ جاتا۔غور سے دیکھئے تو محبت بن کر پوری کائنات میں پھیل جاتا ہے۔

اب ممتاز شاعر شارق کیفی کی نظموں کے دو اقتباسات دیکھئے۔

مگراس بار اشکوں نے

دریا کے پانی نے مجھے دھوکہ دیا ہے

وہی سسکی

اگر کانوں تلک آنے سے رہ جائے
جسے سننے کی خاطر جان دیدیتا ہے کوئی
تو دم سانسوں کے رُکنے سے نہیں
کانوں کے شاید بند ہو جانے سے گھٹتا ہے
یہ مرنا ہے موت سے بڑھ کر ہے کچھ
جس میں
کسی کی آنکھ کو تو سب کچھ دکھائی دے رہا ہوتا ہے
گہرے پانیوں میں ڈوب کر بھی
مگر اس کو سنائی کچھ نہیں دیتا (گہرے پانی کا دھوکہ)

بھیڑ نہیں یہ آنکھیں ہیں
اور ان آنکھوں میں
کسی کے چشمے کا نمبر بڑھ جاتا ہے تو
میں دھندلا ہو جاتا ہوں
مجبوری ہے میری
رشتے رکھنا کچھ اچھی آنکھوں سے
گرم ہاتھوں سے
سچ تو یہ ہے
میرا ہونا بجا تب ثابت ہوتا ہے جب
کوئی مجھ کو دیکھے
مجھ کو ہاتھ لگائے
بھیڑ نہیں یہ وہ آنکھیں ہیں
جن سے ہوں میں (بھیڑ نہیں یہ آنکھیں ہیں)

ان نظموں میں آج کی زندگی کا وہ شور و غل ہے جو انسان کو گونگا بہرا بنا رہا۔ اس کا شدید احساس اور پھر یہ مصرعہ ''یہ مرنا موت سے بڑھ کر ہے کچھ'' ''کوئی مجھ کو دیکھے مجھ کو ہاتھ لگائے'' نازک احساسات سے سجی نظمیں

ذات کے کرب میں سمائی ہوئی ہیں لیکن بقول شمس الرحمٰن فاروقی :

''ان نظموں میں قدم قدم پر روزانہ زندگی کی چیزیں کبھی علامت بن کر کبھی کسی کی سوانح کا حصہ بن کر کبھی کسی تمثیل کا اشارہ بن کر سامنے آتی ہیں۔ بظاہر روزمرّہ میں رچی بسی ہوئی یہ نظمیں درحقیقت بہت دبیز ہیں۔''

اب کچھ نظمیں تازہ ترین رسالوں سے ۔

تمہیں بھی ان گھنی آبادیوں میں
زندہ رہنا ہے
مجھے بھی خواہشوں کے
زرد جنگل سے نکلنا ہے
تمہیں بھی خواب کے
ٹوٹے ہوئے ٹکڑے اٹھانے ہیں
مجھے بھی اپنی آنکھوں میں
نئے سپنے سجانے ہیں

بڑی لمبی مسافت ہے
ابد تک مجھ کو جانا ہے
تمہارے پاس آنا ہے (مسافت از شاہد عزیز، استفسار ۲۰)

ہم کہ تازہ واردانِ زندگی
سرابِ رُخِ افق کی تابشوں میں جب نہائے تو
دبیز گرد تہہ بہ تہہ ہمارے جسم و روح پر جمی
دل و نگاہ و درک کے
سب آئینے گرد پوش ہو گئے
وہ گرد جو کہ دن بدن
یوں مہین سے مہین تر ہوئی ہمیں

کہ آئی نہ کبھی نگاہ میں
اسی کی تہہ میں ہم
اپنے آفتاب و ماہتاب ڈھونڈتے رہے

مکمل (سفراز آصف رضا استفسار ۲۰)

مجھے کچھ کہنا ہے شاید
غزل کے شعروں کی یا نظم کی تخلیق کیوں ہے
یہ کیسا پیشِ خیمہ ہے
یہ میری روح میں گہرا گھنا گہرا خلا کیوں ہے

نہ کوئی رقص لفظوں اور خیالوں کا
کہ شاید
روح کے گہرے خلا سے کچھ نہیں ہوتا (شہپر رسول، عالمی فلک ۔۳)

موت کی خواہش باندھ کے دل سے
پیار محل کے اونچے در سے
کوئی دوانہ کود گیا
اور زمانے بھر سے توڑ لیا رشتہ
لیکن پھر بھی زندہ ہے
سوچو کیسے؟
گھور اندھیرا کوما کا
پچھلے دس برسوں سے
اس کی ماں کی آس کو
تھامے بیٹھا ہے (آس بھرا کوما از شارق عدیل، عالمی فلک ۔۳)

پرندے زندگی کو گنگانے کا
سلیقہ جانتے ہیں
پرندے زندگی کو بوجھ کی صورت نہیں ڈھوتے
پرندے جستجو میں آب ودانے کی
خلاؤں میں بھٹکتے ہیں
مگر یہ جذبۂ نغمہ سرائی کو
کبھی مجروح تک ہونے نہیں دیتے
مگر یہ طائرانِ خوش نوا جب بھی
قفس کی بے خطر آزادیوں کو اوڑھ لیتے ہیں
تو اپنے سارے نغمے بھول جاتے ہیں۔ (پنجرہ از شارق عدیل نیا ورق/۵۵)

کالے جنگل میں ایک بڑا سانپ
مرے رستے میں پڑا تھا
وہ اژدھا تھا
برسوں وہ چپ چاپ
پڑا رہتا تھا

میں نے سمندر پار نہیں کیا اب تک
اور جنگل کا خوف
بھلا نہیں پایا ہوں
لیکن اب یہ سمندر کیسے پار کروں
کوئی جزیرہ کوئی ساحل
مجھ کو نظر نہیں آتا (جنگل کا خوف از جمال اویسی، نیا ورق/۵۵)

جو ازل ہے تا ابد

فلک پہ ٹہلتی ہوئی

نجات مانگتی ہوئی

نفس نفس کے شور سے

وہ ایک سرمئی سی چپ

تو چپ کو اپنی توڑ دے (سرمئی چپ از عادل رضا منصوری، کاروانِ ادب ۶۷)

ان نظموں کو بالخصوص شارق عدیل کی نظم پرندے اور جمال اویسی کی نظم جنگل کا خوف بغور ملاحظہ کیجئے۔

کسی اور سجی ہوئی نظموں میں زندگی کا نغمہ سنائی دیتا ہے۔ یہ نغمہ پرندوں کا کم زندگی کا زیادہ ہے اور جب زندگی علامتوں اور استعاروں میں سج کر نظم میں ڈھلتی ہے تو پھر وہ شاعر کی ذات سے نکل کر کائنات میں ڈھل جاتی ہے......لیکن ایسی نظمیں کم ہی پڑھنے کو ملتی ہیں۔

نئی نظموں کا ایک اور رنگ دیکھئے جسے آپ تانیثی رنگ بھی کہہ سکتے ہیں یا اس سے آگے کا رنگ۔

دیئے کی تو کو تھرتھرا رہی ہے

یہ شام غم ہے کہ آفتوں کی سحر ہوئی ہے

فصیل شب پر اداس جگنو

کسی مسافر کی راہ تک کر

لٹا چکا ہے تمام روشن بہار اپنی

پرندے اڑنے کو مضطرب ہیں

اذان صحن چمن میں دیتا ہے مرغ ایسے

کسی کو جیسے کوئی فسانہ سنا رہا ہے

اٹھ! اندھیرا بہت ہے لیکن

چراغ لے کر تلاش کرنا ہے تم کو سورج

دیئے کی لَو تھرتھرا رہی ہے (دیئے کی لو)

ایک اور نظم کا ایک اقتباس دیکھئے۔

خیالات کے بے کراں

اور گھنے جنگلوں میں

یہ انسان ہیں یا ہیولے ہیں ان کے
سوالات کی جن پہ یلغار ہے
یہ کوشاں رہے ہیں جوابات کی چاہ میں
زمیں آسماں شہر کی بستیاں
درد کی تتلیاں گھر سے اٹھتا دھواں
بچپنے کی ہمکتے خوشی کے سوال (سوال)

خلاؤں میں بکھرے ہوئے چاند سورج
ستاروں سے پوچھا ہے میں نے
بتاؤ کہ ہے کون کس کی تمنا میں سرگرداں
کس کے لئے کون ہے بے قرار
بتاؤ کہ کس کے تعقب میں ہے کون
کس نے پرویا ہے دھاگے میں تم سب کو
کس عشق میں کون ہے اشک بار
خلاؤں کی سَن سَن میں سب ہنس پڑے
دیر تک یونہی ہنستے رہے
(نامکمل) (محبت کا کوئی بھی مرکز نہیں ہے از شہناز نبی، امروز/۱۸)

عجب سی سند ہے
گہری بہت گہری
سب اعضا شل پڑے ہیں
کہ آنکھیں ہی نہیں
سوچوں کے سارے در بھی خفتہ ہیں
دریچہ خواب کا جیسے مقفل ہے
یہ کیسی نیند ہے

کہ اپنے ہونے کے کسی احساس کی حدت نہیں ملتی
شرارہ سا کہیں کچھ جھلملاتا ہے
چراغ جاں نہیں بنتا
جو گہری دھند کو چیرے
کڑے جادو کو توڑے
کہ اپنے نو شگفتہ پھولوں کی خاطر
ہمیں تو جاگنا بھی ہے (چراغ جاں از کہکشاں تبسم، کاروانِ ادب/۶۸)

میں نے ان شاعرات کا ذکر بطور خاص کیا ہے کہ عموماً شاعرات کو تانیثیت کے حوالے سے ہی دیکھا جاتا ہے۔ تانیثیت جزوی صداقت ضرور ہو سکتی ہے لیکن اب یہ تحفظات رفتہ رفتہ دور ہو رہے ہیں اور خواتین کی شاعری بھی زندگی کی شاہراہ پر آ گئی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ فطری نسائیت و نزاکت ان میں ہنوز برقرار ہے اور اس میں کوئی حرج بھی نظر نہیں آتا کہ اسی سے ان کی شناخت میں معاوفت ہوتی ہے لیکن صاف لگتا ہے کہ رفتہ رفتہ زندگی کے انسانی مسائل جلد ہی اس نزاکت کو بھی دور کر دیں گے۔ مثالیں اور بھی دی جا سکتی ہیں۔ نظروں سے کچھ نظمیں ایسی بھی گذریں جن میں پُر زور احتجاج ہے کہیں دلت اور آدی باسیوں کے مسائل ہیں لیکن ایسا خال خال ہی ہے ورنہ زیادہ تر نظمیں احساس واضطراب تک محدود ہیں۔ فکر و شعور کی رمق بھی ہے لیکن اس کا ریخ زیادہ بڑا نہیں دکھائی دیتا۔ یہاں میں ایک رنگ کا ذکر اور کرنا چاہوں گا جو اردو نظموں کا تازہ ترین رنگ ہے اور وہ ہے شعر و ادب میں داخل تازہ اور گرم کرونائی رنگ...... گذشتہ سال دو سال میں کرونا کی جان لیوا وبا نے پوری دنیا پر اثر ڈالا ہے۔ انسانوں کی بے شمار اموات نے خوف و دہشت کی فضا قائم کر دی اس سے شاعر و ادیب بھی متاثر ہوئے ہیں۔ اس مختصری مدت میں بھی اتنی نظمیں، افسانے، یہاں تک کہ ناول شائع ہوئے ہیں جس کی اُمید نہیں کی جا سکتی تھی جس کو دیکھ کر ان فنکاروں کی زندگی اور زمین سے وابستگی قابلِ حیرت ہے اور قابلِ مدح بھی۔ اس نئے قسم کے درد و کرب اور اس کی نا قابلِ بیان حسیت سے اظہار خیال میں جو ندرت آئی ہے اس نے انسانی وجود اور زندگی کے بدلتے ہوئے روپ پر بے شمار سوالات قائم کر دئے ہیں۔ اس حساس موضوع پر بھی بے شمار نظمیں شائع ہو رہی ہیں یہاں صرف چند مثالیں دے کر گفتگو کو اختتام کی طرف لے جاؤں گا۔

کاروانِ ادب کے تازہ شمارہ (۶۷) میں کینڈا کی ممتاز شاعرہ شاہدہ حسن کی ایک لمبی نظم کے ابتدائی اقتباسات ملاحظہ کیجئے

کیسی لگے گی یہ دنیا

کرونا کے بعد

یہ عقدہ کون کھولے گا

پھیلتی جارہی ہے وبا کی وحشت

نظم آگے بڑھتے ہوئے اس مقام پر ختم ہوتی ہے۔

کسی دانشور نے کہا تھا

جس لمحے طاقتوں کا غیر متوقع ملاپ ہورہا تھا

وہی انسانی تاریخ کے

رُخ بدل دینے کا

لمحہ ہوتا ہے

دیکھیئے بیماری کو کس طرح زرداری اور طاقتوری میں بدل کر اسے انسان کی بدبختی سے جوڑ دیا ہے۔ بڑا ذہن چھوٹے موضوع کو بھی بڑے سیاق وسباق میں دیکھتا ہے اور پھر وہ موضوع اور تخلیق دونوں بڑے ہوجاتے ہیں۔اسی طرح خورشید اکرم نے اس وبا کو روز کے معمولات میں دیکھ کر اچھی نظم کہی۔

اب جو ہم ملیں گے تو

اپنے اپنے ہاتھوں میں

شک کا سانپ لے کر

سانس میں یقیں نہیں گھٹن لے کر

اتنے فاصلے پر

کہ سرگوشیوں کا دم گھٹ جائے

لبوں میں خون کی گرمی نہ ہوگی

پتھر کا جمود ہوگا

بدن کچی مٹی کے ہوں گے......

(وبا کے دنوں میں ایک ملاقات) (نامکمل)

یہ انسانی واخلاقی اور تخلیقی کمٹ منٹ ہی ہے جس نے وبائی درد وکرب کو شدت سے محسوس کیا اور ایک افسانہ نگار شاعر بن گیا جذبہ وفکر کے حادثے یوں بھی ہوتے ہیں۔مشتاق احمد ایک افسانہ نگار اور ایک رسالہ کے مدیر ہیں لیکن گذشتہ دنوں ان کا شعری مجموعہ ''آئینہ حیران ہے'' منظرِ عام پر آیا جس میں کرونا سے ہونے والی موتوں و

حادثوں ،غریب انسانوں اور مزوروں سے متعلق نظمیں ہیں ۔خود لکھتے ہیں ۔

''آئینہ حیران ہے'' میری تیس نظموں پر مشتمل ہے اور مشمور تمام نظمیں کورونا کے لاک ڈاؤن یعنی خود ساختہ بندی کے عرسے کی تخلیق ہے ۔ یہ نظمیں ایک عہد ساز کی تخلیق ہے اس لئے ان نظموں کے متون کی زیریں لہریں تک رسائی ہی ذہنی آسودگی کا سامان ہو سکتی ہے ۔''

اب صرف دو نظموں کے اقتباسات دیکھئے

ایک مرئی کو غیر مرئی کا خوف
کوئی ہمدم نہ کوئی غم شناس
ایک دوجے کو ہے دوریوں کا احساس
مگر ہے زندگی جینے کی آس
کہ ان آنکھوں نے دیکھا ہے
برسوں بعد یہ نیل گوں آسمان
اب اخبار میں مر رہے ہیں
صرف اور صرف انسان
اور لباس کسی کی پہچان نہیں
کسی کے ہاتھوں کسی کی جان نہیں (نیا عہد نامہ)

دنیا کیا ہے؟
میرے ذہن میں کوند رہا ہے
نہ جانے کب سے یہ سوال
کہ جواب میں نے
جو پڑھا اور سنا تھا
وہ ایک معمہ تھا
اور تم نے بھی تو کہا تھا
کہ یہ سب فلسفے ہیں

اک پہیلیاں ہیں
مگر آج میں
جب دیواروں سے ہم کلام ہوں
نگاہیں ٹکٹکی لگائے دیکھ رہی ہیں
چھتوں میں عنکبوت
تو مجھے ایسا لگ رہا ہے
میری الجھنیں ختم ہوگئی ہیں (عنکبوت)

مرگِ ناگہانی، دنیائے فانی صرف واقعے وحادثے نہیں ہوتے بلکہ فلسفے ہوتے ہیں تحیر وتفکر کی اونچی اونچی دیواریں کھڑی ہوجاتی ہیں تو نظم میں فلسفہ نما سوال اپنے آپ اٹھانے لگتا ہے۔عنکبوت ایسی ہی ایک نظم ہے۔ لیکن سوال اگر سادگی سے اٹھے تو آواز دور تک جاتی ہے اور مانوس سی بھی لگتی ہے۔مثلاً اسلم الہٰ آبادی کی نظم ''اپنی دنیا آج کل بیمار ہے''۔

زندگی اور موت میں تکرار ہے
اپنی دنیا آج کل بیمار ہے

مندر ومسجد ہو یا ہو گرجا گھر
سونے سونے سب کے ہیں دیوار و در
اتنا گہرا ہے کرونا کا اثر
اب قریب آنے میں سب کو عار ہے
اپنی دنیا آج کل بیمار ہے
مسکراہٹ جگمگاہٹ بند ہے
دوستو ہر گھر کی چوکھٹ بند ہے
کھڑکی دروازے کی آہٹ بند ہے
بے بسی اپنے گلے کا ہار ہے
اپنی دنیا آج کل بیمار ہے

کوئی کہہ سکتا ہے کہ یہ ہنگامی نظمیں ہیں ان میں لمحاتی کیفیت ہے، کل جب یہ لمحہ ختم ہو جائے گا نظمیں بھی ختم ہو جائیں گی۔ ہوسکتا ہے یہ سچ ہو، مجھے یہاں کسی کا دفاع کرنا ہے نہ اعتراض لیکن شعروادب کے ایک سنجیدہ طالب علم کی حیثیت سے صرف اتنا عرض کرنا چاہوں گا کہ ہر شاعری لمحۂ موجود میں ہی جنم لیتی ہے۔ ہر شاعر اپنے عہد کے ہی نغمے سناتا ہے۔ نظموں میں شامل انسانی اور آفاقی قدریں ہی انہیں دور تک لے جاتی ہیں۔ ان نظموں میں جو تصورات ہیں۔ جو سوالات ہیں اور جو فلسفے ہیں اُسے آپ لمحاتی یا مقامی کیسے کہہ سکتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ مقامیت سے ہی آفاقیت کا سفر طے ہوتا ہے جو جہاں کا ہے اگر وہیں کا نہیں ہے تو پھر کہیں کا نہیں ہے۔ ایلیا البرن برگ کے جملے یاد آرہے ہیں۔ کہتا ہے۔

> ''ایک ادیب کے لئے یہی ضروری نہیں کہ وہ ایسے ادب کی تخلیق کرے جو مستقبل کی صدیوں کے لئے ہو۔ اسے ایسے ادب کی تخلیق پر ہی قدرت ہونی چاہئے جو صرف ایک لمحے کے لئے ہو اگر اس ایک لمحے میں اس قوم کی قسمت کا فیصلہ ہونے والا ہے۔''

اس مختصر سا مقالہ میں مختلف مثالوں کے ذریعہ نئی نظموں کے جو کچھ رنگ دکھائے گئے ہیں جو قطعی نامکمل ہیں اس لئے اس عدم تکمیلیت کی رو سے کوئی نتیجہ خیز گفتگو کرنے کی پوزیشن میں کم از کم میں نہیں ہوں لیکن ایک سوال پھر بھی گونجتا ہے کہ ان تمام رنگوں کو ملا کر کیا جدید اردو نظم کا کوئی بڑا رنگ بڑا خاکہ اور بڑی پہچان بن رہی ہے؟ جسے اقبال جوش فیض راشد میراجی، اختر الایمان، مجید امجد کی روایت کی توسیع کہی جا سکے؟ یہ سوال صرف میرا نہیں۔ میرے عہد کے بعض دیگر سنجیدہ قارئین و ناقدین کا بھی ہے۔ کچھ مثالیں مضمون کی ابتدا میں پیش کر چکا ہوں دو ایک مثالیں اور ملاحظہ کیجئے۔ پروفیسر قاضی جمال حسین اردو نظم پر اچھی نگاہ رکھتے ہیں اپنے ایک مضمون ''معاصر اردو نظم، تنقیدی تناظر اور شناخت کا مسئلہ'' میں صاف طور پر سوالات کرتے ہیں۔

> ''معاصر نظم کے امتیازات کیا ہیں؟
> معاصر نظم کے فکری رویوں نے نظم کی جمالیاتی تنظیم میں کیوں کر
> اپنے نمود کے امکانات دریافت کئے ہیں؟''

اور یہ بھی۔

> ''منظر نامہ بدل چکا ہے۔ نظم گو شعراء کی ایک معتدبہ تعداد سامنے آئی ہے اور بلاشبہ بعض اچھی نظمیں بھی کہی گئی ہیں لیکن سوال یہ ہے کہ اس میں کتنی نظمیں ہیں جو ادبی معاشرے کے حافظے میں جگہ پا سکیں یا اپنے عہد کا حوالہ بن سکیں؟''

پروفیسر عتیق اللہ نے بھی ایک جگہ لکھا۔

''کیا وجہ ہے کہ ہندی اور دوسری علاقائی زبانوں کی شاعری میں جلتے سلگتے ہندوستان کا نقشہ ہر اور چھور سے دیکھا جا سکتا ہے اور......''

اور یہ بھی۔

''حقیقت سماج، دنیا اور زندگی جیسے الفاظ کے استعمال سے ہماری تنقید نے محض اس بنا پر گریز کیا تھا کہ ترقی پسند تنقید کو یہ بے حد عزیز تھے۔ تنقید کے اس چھوا چھوت والے کردار نے ہمارے تخلیق کاروں کو بہت گمراہ کیا۔ افسوس کا مقام یہ ہے کہ یہ گم رہی اس وقت بھی برقرار ہے۔'' (ایک بے مرکز سماجی تشکیل اور جدید اردو نظم)

عتیق اللہ نے تو پوری سماجی تشکیل کی لامرکزیت کو بحث میں لا کھڑا کر دیا ہے جو بے حد غور طلب ہے۔

کوئی عتیق اللہ کے ان خیالات سے اختلاف کر سکتا ہے ضرور کرے کہ ان دنوں سنجیدگی سے اختلافات بھی نہیں ہو رہے ہیں۔ اگر آپ تھوڑی دیر کے لئے وارث علوی کو بھی نظم کا نقاد مان لیں تو ندا فاضلی پر طویل مضمون لکھتے ہوئے انہوں نے بھی ایک جگہ کہا۔

''نظریاتی جکڑ بندیوں سے آزاد ہونے کے بعد توقع تھی کہ شاعری کو نئی جولان گاہیں میسر آئیں گی سوائے ایک دو یا تین شاعروں کے اس ضمن میں کسی بھی شاعر کی کارکردگی غیر معمولی تو کیا اطمنان بخش بھی نظر نہیں آتی۔ ایسا لگتا ہے کہ ان کے پاس شاعری کے موضوعات ہی نہیں۔''

اس مختصر گفتگو کا مطلب یاس و ناامیدی نہیں۔ گذشتہ بیس پچیس برسوں کے نظمیہ سفر کے بارے میں ابھی کچھ فیصلہ کرنا قبل از وقت ہوگا۔ یوں بھی تخلیق اور تبدیلی دونوں ہی خطِ مستقیم پر نہیں چلتیں وہ مسلسل تصادمات اور تغیرات سے نبرد آزما رہتی ہیں۔ ہمیں پہلے ان تبدیلیوں اور کروٹ لیتی ہوئی سماجی اور تہذیبی صورتوں پر نگاہ رکھنی ہوگی اس لئے کہ بقول احتشام حسین۔

''فن کار انہیں کی عکاسی کر کے زندگی کی قدروں کی تخلیق اپنے طور پر کرتا ہے۔ یقیناً کبھی کبھی ایسا بھی ہوتا ہے کہ ان تبدیلیوں میں کوئی ریاضیاتی تناسب نہیں ہوتا کبھی کبھی تو یہ رفتار نہایت تیز اور بہت سست ہو جاتی ہے اور کبھی اچانک جست کی صورت میں ظاہر ہوتی ہے۔''

لیکن احتشام حسین یہ بھی کہتے ہیں اور یہ بات زیادہ توجہ سے سننے کی ہے۔

''(عمدہ شاعری) کے لئے قومی اور بین الاقوامی سماجی کشمکش کا مطالعہ ضروری ہوگا جو شاعری اس کشمکش کو نہ سمجھے گی اس کا مستقبل بہت اچھا نہیں ہوسکتا۔ ......بغیر اعلیٰ نصب العین ،فنی حسن کاری اور خلوص کے شاعری زندہ نہ رہے تو تعجب نہیں کرنا چاہئے ......'' (نئی شاعری کا پس منظر)

فراق گورکھپوری نے بھی اپنے ایک مضمون حقیقی شاعری کیا ہے؟ میں کہا تھا کہ شاعری کرنا جس قدر آسان ہے شاعری میں روحِ شاعری پیدا کرنا اتنا ہی مشکل ہے اس کے لئے شعور علم سے زیادہ شعور کائنات کی ضرورت ہوا کرتی ہے۔ آل احمد سرور نے بھی ایک جگہ کہا تھا...... ''عوامی احساس صرف ہندوستان کے احساسات کی نمائندگی نہیں کرتا وہ اپنے دور کے عالمی احساس کی بھی ترجمانی کرتا ہے۔ کہنہ مشق سنئیر جدید شاعر مصحف اقبال توصیفی نے اپنے تازہ ترین مجموعہ ''رات خیالوں میں گم'' کے دیباچہ میں لکھا۔

''شاعر آئینہ میں ہمیشہ اپنا عکس ہی نہیں دیکھتا۔ کبھی تو کسی تخلیقی لمحے میں آس پاس کے کچھ چہرے یا بہت دور کے کچھ منظر بھی اسے نظر آجاتے ہیں اگر ہم اس آئینے کا زاویہ ذرا بدل دیں تو ناممکن نہیں کہ یہ آئینہ ماضی حال اور مستقبل تینوں زمانوں کو بہ آسانی قید کرلے۔''

شاعری میں حیات وکائنات۔ زماں ومکاں رومان وحقیقت ،مشاہدہ وتجربہ وغیرہ سب کہ سب شعری حسیت اور تخلیقی تجربہ بن کر ابھرتے ہیں لیکن اس کے لازوال نقوش انسانی دردمندی اور فنی ہنرمندی کے بغیر ممکن نہیں۔ یہ وہ نسخۂ کیمیا ہے جس نے اقبال ، جوش ،فیض ،راشد ،اختر الایمان جیسے شاعروں کو پیدا کیا اور ایک تاریخ رقم ہوگئی۔ اگر آج کے شعراء کو اپنی اور اپنے عہد کی تاریخ لکھنی ہے اور تاریخ میں اپنی مخصوص ومنفرد شناخت بنانی ہے تو اسے زندگی کی مشینی رفتار سے زیادہ انسانی سروکار۔ جذبات واحساسات وغیرہ کو سمجھنا ہوگا جو پورے طور پر سیاست، مصارفیت اور جاریت کا شکار ہو چکے ہیں۔ میں ایسا نہیں مانتا کہ آج کے شعراء کی ان پر نظر نہیں ہے، نظر تو یقیناً ہے لیکن شاید نظریہ نہیں ہے۔ ان کی راہ اور چاہ کچھ اور لگتی ہے۔ یہ کچھ اور کیا ہے اس کی شکلیں کم ازکم مجھ پر واضح نہیں ہیں تاہم ابہام واشکال کے باوجود اچھی شاعری بھی ہو رہی ہے لیکن وہ کہیں بازار وواد کے شور میں دب سی گئی ہے۔ سائنس اور ٹیکنولوجی نے اسے اور بھی دور کردیا ہے۔ اس لئے آج کے سنجیدہ ومعیاری شاعروں کو ان سب کے خلاف بھی جنگ لڑنی ہوگی۔ شاعری کو بازار ، کاروبار اور نمائش واظہار سے دور عبادت اور وحدت کا درجہ دینا ہوگا۔ زندگی سے بیزار نہیں پیار کرنا ہوگا اس کی گہرائیوں میں ڈوبنا ہوگا۔ صرف سوال کرنا کافی نہیں تلاشِ جواب میں سرگرداں ہونا ہوگا۔ آل احمد سرور نے جو بات کل کہی تھی وہ آج بھی درست لگتی ہے...... ''محض بیزاری یا مایوسی سے کام نہیں چلتا اس

کے پیچھے ان قدروں کی بھی تنقید ہونی چاہئے۔ایک منفی رجحان بھی ایک دوسرے مثبت رجحان کی طرف قدم ہے مگر مثبت رجحان کا احساس بھی بیحد ضروری ہے۔''

صرف مایوسی سے نہیں نشاط سے بھی۔صرف اطلاعات سے نہیں تجربات کے زخموں سے اور بازار کے آپ (Public Culture) سے نہیں خونِ جگر کا گل سے شاعری کے سبزۂ گل کھلانے ہوں گے زندگی کا زہر پی کر آپ حیات تلاش کرنا ہوگا۔

اقبال نے غلط تو نہیں کہا تھا۔

رنگ ہو یا سنگ رخشت جنگ ہو یا حرف وصوت
معجزہ فن کی ہے خونِ جگر سے نمود

میں یہ باتیں نصیحت کے طور پر نہیں بلکہ خلوص ومحبت کے طور پر عرض کررہا ہوں۔یہ سب شعراء میرے ہم عصر ہیں۔میں ان کی دل سے قدر کرتا ہوں۔یہی کیا کم ہے کہ اینٹی شاعری کے دور میں تمام خطرات اور چیلینجز کو قبول کرتے ہوئے یہ شاعری کررہے ہیں۔جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ نئی شاعری کے بارے میں آج فیصلہ کرنا تنقید کی شریعت کے خلاف ہے تاہم آج قارئین اور بالخصوص ناقدین کا یہ کام تو ہے ہی کہ وہ اپنے زمانے کی تخلیقات کو سمجھے۔اپنے دور کے اقدار کو سمجھے۔مسائل اور موضوعات کو سمجھے طرزِ احساس اور طرزِ گفتار کو سمجھے اور مخلصانہ ومفکرانہ آراء کا اظہار کرے لیکن اظہارِ خیال کے وقت یہ خیال ضرور رہے بقول خلیل الرحمٰن اعظمی۔

''یہ توقع رکھنا کہ شعروادب کی تاریخ میں کوئی ایسا زمانہ آئے گا جب صرف اچھے شاعر پیدا ہوں گے یا کوئی شاعر صرف اعلیٰ درجہ کی چیزیں لکھے گا یا کسی شاعر کی ہر نظم یا ہر غزل میں یکساں کامیابی ہوگی۔نہ صرف ناجائز بلکہ فضول اور مہمل توقع ہے۔''

(کچھ نئی شاعری کے بارے میں)

عصری زندگی کا احساس جلوۂ صد رنگ میں بدلتا ہوا آہنگ ہوا کرتا ہے جس میں تشکیک کے ذریعہ نئے یقین وامکان کی تلاش ہوتی ہے اور یہ تلاش ایک نئی آرزو کی تلاش ہوتی ہے۔اس تلاش کو سراہنا چاہئے لیکن تلاش کو ہی منزل سمجھنے کی نادانی بھی نہیں کرنی چاہئے اس لئے کہ زندگی ادب شاعری سبھی میں حسن کی بوقلمونی بھی ہوتی ہے اور حیات کی بوالعجبی بھی۔جس کی کوئی آخری منزل نہیں ہوتی۔

اقبال کے تضادات

ڈاکٹر رؤف خیر

فکر وفن میں تبدیلی کے ساتھ فن کار کا فکری گراف بھی اونچ نیچ کا شکار ہو تو یہ کوئی تعجب کی بات نہیں قرآن وسنت سے تو ثابت ہے کہ ایمان بھی گھٹتا بڑھتا رہتا ہے نیکو کاروں کی صحبت میں مومن کا ایمان بڑھ جاتا ہے اور اگر بدکاروں کی صحبت اختیار کرتا ہے تو ایمان خطِ صفر Zero Level پر آجاتا ہے۔ جو لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ ایمان نہ گھٹتا ہے نہ بڑھتا ہے تو وہ دراصل اربابِ خطِ سفر Zero Level والے ہیں علم وفن میں اضافے کے ساتھ ساتھ تدبر و تفکر کے نتائج میں خیالات بدل جاتے ہیں۔ ہر ذہین آدمی پر مدلل اجتہاد کے دروازے کھلے ہوتے ہیں۔ اقبال پر بھی یہ دروازے بند نہیں کیے جاسکتے۔ البتہ ان ذہنی تبدیلیوں کا علمی جائزہ لینے کا اختیار بھی قاری کو ملنا چاہیے۔

ابتدائی زمانے میں اقبال نے ''نیا شوالہ'' جیسی نظم بھی لکھی تھی جو قومی یک جہتی کا نمونہ تھی۔

سچ کہہ دوں اے برہمن گر تو برا نہ مانے ۔۔۔ تیرے صنم کدوں کے بت ہو گئے پرانے

اپنوں سے بیر رکھنا تو نے بتوں سے سیکھا ۔۔۔ جنگ وجدل سکھایا واعظ کو بھی خدا نے

تنگ آ کے میں نے آخر دیر وحرم کو چھوڑا ۔۔۔ واعظ کا وعظ چھوڑا۔ چھوڑے ترے فسانے

پتھر کی مورتوں میں سمجھا ہے تو خدا ہے

خاک وطن کا مجھ کو ہر ذرہ دیوتا ہے

1905 میں لکھی ہوئی اس نظم سے پتہ چلتا ہے کہ اقبال اس وقت تک سیکولر نظریات رکھتے تھے پھر اس نظریے میں تبدیلی آئی۔ خاک وطن کے ہر ذرے کو دیوتا سمجھنے والے اقبال کہنے لگے۔

ان تازہ خداؤں میں بڑا سب سے وطن ہے ۔۔۔ جو پیرہن اس کا ہے وہ ملت کا کفن ہے

ایک دور وہ بھی تھا کہ اقبال اپنے ''ترانہ ہندی'' (اگست 1904ء) میں فرماتے ہیں:

سارے جہاں سے اچھا ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ ہم بلبلیں ہیں اس کی یہ گلستاں ہمارا

پھر وہ دن بھی آئے کہ اقبال کے نظریے میں تبدیلی آئی اور وہ ''ترانہ ملی'' گانے لگے

چین وعرب ہمارا، ہندوستاں ہمارا ۔۔۔ مسلم ہیں ہم، وطن ہے سارا جہاں ہمارا

توحید کی امانت سینوں میں ہے ہمارا　　　　آساں نہیں مٹانا۔نام ونشاں ہمارا

خواجہ حافظ شیرازی کے تعلق سے اقبال کی فکر نے کروٹ بدلی۔''اسرارِ خودی'' میں ابتداًا قبال اُس کے تعلق سے اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔حافؔظ کے فکروفن سے قوم کو دور رکھنا چاہتے تھے مگر اپنی دوست عطیہ فیضی سے اقبال یہ بھی فرماتے ہیں:

''جب میرا ذوق جوش پر آتا ہےتو حافظ کی روح مجھ میں حلول کر جاتی ہےاور میں خود حافظ بن جاتا ہوں۔''

''خدوخال اقبال'' میں امین زبیری نے انکشاف کیا تھا کہ'' 1914 میں مجلّہ عثمانیہ کے لیے لکھی ہوئی اپنی نظم میں اقبال کہتے ہیں:

عجب مدار زسر مستیم کہ پیر مغاں　　　　قبائے رندیِ حافظ بقامتِ من دوخت

صبا بہ مولدِ حافظ سلامِ ما برساں　　　　کہ چشمِ نکتہ وراں خاکِ آں دیار افروخت

ہماری سرمستی کا وہ عالم ہے کہ پیر مغاں حافظ کی رندی کی قبا ہمارے قامتِ زیبا کے مطابق سلاتا ہے۔ ہمارا سلام اے صبا حافظ کے مولد تک پہنچا کہ نکتہ وروں کی آنکھ کے لیے وہاں کی خاک سرمہء بصیرت بنی ہوئی ہے۔اقبال اِسے خاکِ نجف کا درجہ دیتے لگتے ہیں۔

اسلم جے راج پوری نے خواجہ حافؔظ پر ایک جامع کتاب مرتب کی ہے۔اقبال ان کے نام ایک خط (۱۵مئی 1919ء) میں فرماتے ہیں:

''خواجہ حافظ پر جو اشعار میں نے لکھے ہیں ان کا مقصد ایک لٹریری اصول کی تشریح اور توضیح تھا۔خواجہ کی پرائیویٹ شخصیت یا

ان کے معتقدات سے سروکار نہ تھا مگر عوام اس باریک امتیاز کو سمجھ نہ سکے اور نتیجہ یہ ہوا کہ اس پر بڑی لے دے ہوئی۔

اگر لٹریری اصول یہ ہو کہ حُسن حسن ہے خواہ اس کے نتائج مفید ہوں یا مضر تو خواجہ دنیا کے بہترین شعرا میں سے ہیں۔

بہ ہر حال میں نے وہ اشعار حذف کر دیے وران کی جگہ اس لٹریری اصول کی تشریح کرنے کی کوشش کی ہے جس کو میں صحیح سمجھتا ہوں

لیکن اس مقابلے سے میں خود مطمئن نہ تھا اور یہ ایک ضرور وجہ اشعارِ صدر کو حذف کرنے کی

تھی۔"(بحوالہ "خدو خالِ اقبال" امین زبیری صفحہ 301)

اس سلسلے میں خواجہ حسن نظامی نے اقبال کا بہت پیچھا کیا تھا۔ اقبال جواب لجواب کے چکر میں پڑ کر لایعنی بحث کو طول دینا نہیں چاہتے تھے۔ اس لیے مصلحت اختیار کر لی۔

اس سے پہلے بھی میں نے اپنے ایک لکچر میں اقبال کی خودداری کا تذکرہ کیا تھا کہ علالت و کس مپرسی کے زمانے میں بھی جب اقبال کی امداد کے لیے بھوپال کے نواب صاحب نے اپنی جیبِ خاص سے ماہانہ پانچ سو روپیہ دینا چاہا تو اقبال نے قبول کر لیا مگر ایک ہزار روپے کا ایک چیک حیدر آباد کے سر اکبر حیدری کو لوٹا دیا اور جواباً تین اشعار کا ایک قطعہ بھی لکھ بھیجا:

تھا یہ فرمانِ الٰہی کہ شکوہِ پرویز   دو قلندر کو کہ ہیں اس میں ملوکانہ صفات

مجھ سے فرمایا کہ لے اور شہنشاہی کر   حُسنِ تدبیر سے دے آنی و فانی کو ثبات

غیرتِ فقر مگر کر نہ سکی اس کو قبول   جب کہا اس نے یہ ہے میری خدائی کی زکات

علامہ اقبال کی خوداری کے سلسلے میں یہ اشعار بھی پیش کیے جا سکتے ہیں:

در جہاں جز دردِ دل درماں مخواہ   نعمت از حق خواہ از سلطاں مخواہ

از غمِ ہستی مئے گل فام گیر   نقدِ خود از کیسۂ ایام گیر

فطرتے کو بر فلک بندد نظر   پست می گردد زِ احسان دگر

مشت خاکِ خویش را از ہم مپاش   مثل مہ رزق خود از پہلو تراش

کارِ مردان ست تسلیم و رضا

بر ضعیفاں راست ناید ایں قبا

دنیا میں دردِ دل کا درماں نہ مانگ اور اگر علاج دردِ دل چاہتا ہی ہے تو اللہ تعالیٰ سے چاہ نہ کہ کسی بادشاہ سے۔ کسی کا احسان اسے اپنی ہی نظر میں گرا دیتا ہے۔ غم ہی کو بادۂ گل فام بنا لے اور خود کو زمانے کی جھولی میں اہم ثابت کر۔ مردوں کو شیوۂ تسلیم و رضا ہی اختیار کرنا بہتر ہے کہ یہ قبا کم زوروں کے لیے نہیں ہے۔

مگر اقبال بھی انسان ہی تھے۔ انھوں نے مہاراجا کشن پرشاد کے قصیدے لکھے، ہائی کورٹ کی ججی کی امیدواری میں سر علی امام کی بھی مدح کر ڈالی اس توقع میں کہ وہ نظام کی سلطنت کے صدرِ اعظم بن کر ہائی کورٹ کے جج کے تقرر کا اختیار رکھنے والے ہیں۔ نظام کے تعلق سے عطیہ فیضی کے نام خط میں یہ لکھنے کے باوجود کہ "کسی

ہندوستانی والیِ ریاست کی قدردانی کی مجھے کیا پرواہو سکتی ہے جب کہ کوئی اطالوی حسینہ مجھ سے میری نظمیں انگریزی ترجمے کے ساتھ طلب کر رہی ہے۔''

اس کے باوجود یہی اقبال نظام دکن میر عثمان علی خاں کی شان میں قصیدہ بھی پیش کرتے ہیں جو''زمورِ بے خودی'' کی زینت ہے،جس میں نظام کو آسماں پر چڑھاتے ہیں:

(تفصیل ''اقبال کے کردار کے چند پہلو'' میں دیکھئے)

اقبال نے قدرے تضاد سے کام لیا ہے تو اسے نظر انداز کیا جاسکتا ہے ضرورتاً یا مصلحتاً بڑی بڑی شخصیتوں نے یہ روش اپنائی ہے۔جیسے سر سید احمد خان نے اسباب بغاوت ہند یا سرکشی بجنور مسلمانوں کو انگریزوں کی نگاہوں میں بے قصور ٹھیرانے کے لیے لکھی تھی۔غالب نے اپنے وظیفے کی بحالی کی خاطر دل پر جبر کر کے سہی انگریزوں کے قصیدے لکھے تھے۔بعض وقت عقیدت کی بنیاد پر غلو سے کام لیتے ہوئے اپنی ممدوح ہستی کا رتبہ کسی دوسری ہستی سے بڑھا دیا جاتا ہے۔توحید کا دم بھرنے والے اور رسول اللہ سے عشق کا دعویٰ کرنے والے علامہ اقبال کبھی یہ کہتے ہیں:

عشق دمِ جبرئیل، عشق دلِ مصطفیٰ — عشق خدا کا رسول،عشق خدا کا کلام

شوق مری لے میں ہے،شوق مری نے میں ہے — نغمہءاللہ ہو میرے رگ و پے میں ہے

وہی اقبال انگلستان جاتے ہوئے(سرکاری ملازمت سے)معطل شدہ اپنے بھائی کا خیال رکھنے کے لیے دہلی کے نظام الدین اولیا کو سونپ جاتے ہیں یہ کہتے ہوئے:

فرشتے پڑھتے ہیں جس کو وہ نام ہے تیرا — بڑی جناب تری،فیض عام ہے تیرا

تری لحد کی زیارت ہے زندگی دل کی — مسیح و خضر سے اونچا مقام ہے تیرا

(التجاے مسافر۔بانگِ درا)

بزرگانِ دین کے ساتھ ساتھ اقبال کو حضرت علیؓ،حسنینؓ،حضرت فاطمہؓ سے بھی گہری عقیدت رہی ہے۔ہم سب مسلمانوں کو اہلِ بیت سے عقیدت ہے ان کی شان میں گستاخی ایمان سے نکل جانے کے مترادف ہے۔(اہل بیت کا مطلب ہے رسول اکرم ﷺ کی تمام گیارہ بیویاں،چاروں بیٹیاں اور ان کے تمام بچے) اللہ تعالیٰ نے بعض پیغمبروں کو بعض پر فضیلت ضرور دی ہے یہ اللہ کی مرضی لیکن ہمیں اجازت نہیں کہ کسی پیغمبر کا رتبہ

گھٹائیں۔اسی طرح صحابہ کا معاملہ ہے۔سارے صحابہ وصحابیات ہمارے لیے محترم ہیں۔ان کے اپنے اعمال کے سبب ان کے درجات کا تعین کرنا اللہ کا کام ہے۔ہماری اوقات ہی کیا ہے کہ ہم انھیں ایک دوسرے پر فوقیت دیں۔ اگر کسی صحابی یا صحابیہ کی فوقیت دکھائی گئی ہے تو یہ تو اللہ اور رسول اللہ نے بتائی ہے۔ہمیں تقابل کرنے کی اجازت نہیں۔

اپنے فارسی مجموعہ کلام ''رموزِ بے خودی'' میں ایک نظم بہ عنوان ''در معنی ایں کہ سیدۃ النساء فاطمۃ الزہرا سوۂ کاملہ ایست برائے نساء اسلام::میں اقبال نے حضرت فاطمہؓ کا حضرت مریم علیہا السلام سے تقابل کر کے ان کی تین فضیلتیں دکھائی ہیں۔چند بنیادی اشعار پیش ہیں۔

مریم از یک نسبتِ عیسیٰ عزیز — از سہ نسبت حضرتِ زہرا عزیز

نورِ چشمِ رحمۃ اللعالمین — آں امامِ اولین و آخرین

بانوے آں تاج دارِ ھل اَتیٰ — مرتضیٰ مشکل کشا شیرِ خدا

بادشاہِ کلبہء ایوانِ او — یک حسام و یک زرہ سامانِ او

مادرِ آں مرکزِ پرکارِ عشق — مادرِ آں کارواں سالارِ عشق

پہلی فضیلت یہ ہے کہ حضرتِ فاطمہؓ رسول اللہ ﷺ آخری نبی کی صاحبزادی ہیں جو رحمۃ للعالمین بنا کر مبعوث فرمائے گئے تھے۔بقول اقبال جو ہمارے پہلے اور آخری امام ہیں اور ان سے ہٹ کر کسی کی اقتدا جائز نہیں۔یہ تو ہمارے ایسے امام ہیں جو امام الانبیا بھی ہیں۔

دوسری فضیلت یہ ہے کہ یہ حضرت علی مرتضیٰؓ کی شریکِ حیال ہیں جو ایسے بادشاہ تھے جس کے گھر میں ایک تلوار اور زرہ بکتر کے سامان کے علاوہ کچھ نہ تھا۔

تیسری فضیلت یہ ہے کہ وہ پرکار و سالار عشق (حضرت حسنؓ) اور نیکوکاروں اور حریت پسندوں کے سردار (حضرت حسینؓ) کی والدہ محترمہ ہیں۔

جنت میں عورتوں کی سرداری کی حامل حضرت محمد ﷺ کی چہیتی صاحب زادی، کسی لونڈی یا غلام کی خدمات کے بغیر روکھی سوکھی کھا کر بھی شکر بجالانے والی انتہائی وفادار بیوی حضرت فاطمہؓ کی جتنی تعریف وفضیلت بیان کی جائے کم ہے مگر حضرت مریم علیہا السلام سے تقابل کی اقبال کو پتہ نہیں کیوں سوجھی۔تعریف بغیر کسی تقابل کے بھی کی جاسکتی تھی۔

جہاں تک مریم علیہا السلام کے شرف کا معاملہ ہے کلام مجید گواہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے پوری ایک سورۃ مریم علیہا السلام کے نام پر قرآن میں نازل فرمائی۔

دوسری بڑی فضیلت یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ نے معجزہ دکھانے کے لیے انھیں چن لیا کہ انھیں بغیر مرد کی قربت کے ماں بننے کا انوکھا اعجاز بخشا۔

تیسری فضیلت یہ کہ وہ پیدائشی پیغمبر حضرت مسیح کی ماں ثابت ہوئیں۔

چوتھی فضیلت یہ کہ جھولے میں سے شیر خوار نے اپنی ماں مریم کی پاک دامنی کی شہادت دی جو دنیا کی بے مثال گواہی ہے۔

پانچویں فضیلت یہ ہے کہ ان کی کوکھ سے ایسے فرزند نے جنم لیا جو پیدائشی اندھوں کو آنکھیں، لاعلاج کوڑھیوں کو بھلا چنگا کر دیتا تھا۔ یہاں تک کہ مُردوں کو

قُم باذن اللہ کہہ کر جلا دیتا تھا۔ مٹی سے بنے پرندوں میں جان ڈال کر اُڑا دیا کرتا تھا۔

چھٹی فضیلت یہ کہ دورانِ حمل حضرتِ مریم کے لیے اللہ تعالیٰ کی طرف سے بے موسم کے پھل بھیجے جاتے تھے۔

ساتویں فضیلت یہ کہ بے موسم پھل مریم کے حجرے میں دیکھ کر نوے برس کے بوڑھے پیغمبر زکریاؑ نے اولاد کے لیے دعا کی تو دعا قبول ہوئی اور

اللہ نے انھیں یحییٰؑ سے سرفراز فرمایا گویا مریم علیہا السلام ہی یحییٰؑ کے عالمِ وجود میں آنے کا ذریعہ ثابت ہوئیں۔

آٹھویں فضیلت یہ ہے کہ مریم علیہا السلام ایک ایسے فرزند کی ماں قرار پائیں جس کا موت بھی کچھ بگاڑ نہ سکی۔

نویں فضیلت یہ ہے کہ حضرت مریم کے فرزند کو اللہ تعالیٰ نے آسمان پر اٹھالیا اور زمین پر کسی قسم کا گزند انھیں چھو تک نہ سکا۔

دسویں سب سے بڑی فضیلت یہ ہے کہ حضرتِ مریم کے بیٹے عیسیٰؑ پر صحیفہ انجیل نازل ہوا۔

گیارھویں فضیلت یہ بھی ہے کہ اللہ کے حکم سے مریم علیہا السلام نے جب زمین پر ایڑیاں ماریں تو پانی کا چشمہ پھوٹا۔

افسوس کہ ابنِ ملجم نے مولائے کائنات حضرت علیؓ کو شہید کرڈالا، کسی نے حضرت حسنؓ کو زہر دے کر ہلاک کیا اور کربلا میں حضرتِ حسینؓ کا سر قلم کردیا گیا۔

(اس مرحلے پر ہماری نظم مریم علیہا السلام ملاحظہ فرمائیے)

اقبال کے تضاد کے کچھ اور پہلو بھی ہیں۔ عطیہ فیضی، ایما ویگے ناسٹ جیسی شریف خواتین کے علاوہ یہاں امیرن کا ذکر بھی مناسب ہے جس سے اقبال کو بڑا لگاؤ تھا۔ مشہور و معروف صحافی و قلم کار شورش کاشمیری نے عبدالمجید سالک پر خاکہ لکھتے ہوئے بر سبیلِ تذکرہ اپنی کتاب ''اس بازار میں'' اقبال اور امیر (طوائف) کے تعلقات پر سالک کے حوالے سے یہ واقعہ بیان کیا ہے۔ ان ہی کی روایت کے مطابق ''اس بازار میں'' فحاشی کی تاریخ ہے جو ان کے پرچے ''چٹان'' میں ایک فیچر سے شروع ہوئی تھی۔ اسی سلسلے میں شورش کاشمیری امیرؔ سے بھی ملے تاکہ اقبال سے اس کے تعلقات کی تفصیل معلوم ہو سکے مگر وہ طرح دے گئی۔ انھوں نے لاکھ پچکارنا چاہا مگر وہ ٹال گئی۔ ہزار جتن کیے لیکن کسی طرح بھی ڈھب پر نہ آئی۔ جب انھوں نے سارے داؤ استعمال کرلیے تو خدا کا واسطہ ڈالا لیکن اس کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ اب آگے کا حال بھی شورش کاشمیری ہی کی زبانی سنیے:

''واپس آکر میں نے (عبدالمجید) سالک صاحب سے اس کا ذکر کیا تو وہ امیرؔ کے ذکر سے ششدر رہ گئے۔ پوچھا! ابھی تک زندہ ہے؟ عرض کیا جی ہاں۔ پھر ایک (پرانا) واقعہ سنایا کہ مولانا گرامیؔ لاہور تشریف لائے تھے۔ مجھے دفتر سے اٹھا کر علامہ اقبال کے ہاں لے گئے۔ علامہ اُن دنوں بازارِ حکیماں میں رہتے تھے۔ علی بخش سے پتہ چلا کے بیمار ہیں۔ دھسہ لے کر لیٹے تھے۔ ڈاڑھی بڑھی ہوئی، چہرہ اترا ہوا، آنکھیں دھنسی ہوئیں، گرامیؔ دیکھتے ہی آب دیدہ ہوگئے۔ پوچھا: خیریت ہے؟ معلوم ہوا کہ امیرؔ کی ماں نے میل ملاقات بند کرادی ہے۔ پچھلے تین روز سے ملاقات نہیں ہوئی۔ گرامی کھل کھلا کر ہنس پڑے۔ پنجابی میں کہا:

''او چھڈ یار توی نے غضب کرنا ایں۔ او تینوں اپنی ہنڈی کس طرح دے دیں۔'' (چھوڑو یار تم بھی غضب کرتے ہو۔ بھلا وہ تمھیں اپنی ہنڈی کیوں کردے دے)۔

علامہ اقبال بے حد غم گین تھے۔ گرامیؔ نے علی بخش سے کہا گاڑی تیار کرو۔ مجھے (سالک کو) ساتھ لیا اور اس بازار کو روانہ ہوگئے۔ امیرؔ کے مکان پر پہنچے۔ دستک دی۔ امیرؔ کی ماں نے گرامیؔ کو دیکھا تو خوش دلی سے خیر مقدم کیا۔ ''آپ اور یہاں! اھلاً و سھلاً۔ گرامیؔ نے امیرؔ کی ماں سے گلہ کیا کہ تو نے ہمارے شاعر کو ختم کرنے کی ٹھانی ہے؟ اُس نے کہا مولانا شاعروں کے پاس کیا ہے۔ چار قافیے اور دو ردیفیں۔ کیا میں اپنی لڑکی ہاتھ سے دے کر فاقے

مرجاؤں؟ آپ کا شاعر تو ہمارے یہاں نقب لگانے آتا ہے۔ میری لڑکی چلی گئی تو کون ذمہ دار ہوگا؟ گرامی نے اجلی ڈاڑھی کا واسطہ دیا اور دو گھنٹے کی شخصی ضمانت دے کر امیر کو ساتھ لے آئے۔ میں (سالک) علی بخش کے ساتھ، گرامی امیر کے ساتھ، گھوڑا دوڑ کی میں چلا آ رہا تھا۔ علامہ کے ہاں پہنچے تو گرامی نے جھنجوڑتے ہوئے کہا: اٹھو جی۔ آ گئی امیر۔ سچ مچ۔! علامہ نے حیرت سے پوچھا۔ امیر سامنے کھڑی تھی۔ دفعتاً اُن کا چہرہ جگمگا اٹھا۔

سالک صاحب نے یہ واقعہ سناتے ہوئے کہا: زندگی میں اس قسم کی آرزوئیں ناگزیر ہوتی ہیں۔ انسان کو ان راستوں سے گزرنا ہی پڑتا ہے۔''

(خاکہ عبدالمجید سالک اور شورش کاشمیری۔ سلسلہء مطبوعات انجمن ترقیِ اردو ہند اردو گھر دہلی 110002۔ بحوالہ ''اردو کے منتخب خاکے'' مرتب یوسف ناظم والیاس شوقی اشاعت دوم 2008۔)

آخر میں ہم اقبال کے ایسے اعتقادات کا ذکر کرنا مناسب سمجھتے ہیں جو اقبال ہی کی تحریروں سے اخذ کیے گئے ہیں۔ اقبال کے لکچرس پر مشتمل انگریزی کتاب Reconstruction of Religious Thought in Islam جو آکسفورڈ یونیورسٹی پریس سے 1934 میں شائع ہوئی تھی جس کا نذیر نیازی نے اردو

میں ترجمہ کیا تھا۔ یہ دراصل ادق انگریزی کا مشکل اردو میں ترجمہ ہے۔ شاید مقصد یہ رہا ہو کہ صرف ایک نام نہاد روشن خیال طبقے تک ہی یہ محدود رہے جو اقبال سے خوش اعتقادی رکھتا ہو۔ اس کتاب کے چوتھے لکچر ''انسانی خودی، آزادی اور لافانیت'' میں اقبال صاحب فرماتے ہیں:

''Heaven & Hell are states, not localities'' جنت و دوزخ دراصل مقامات نہیں بلکہ صرف ذہنی کیفیتوں یا حالتوں کا نام ہے۔

جب کہ اقبال نے خود کہا تھا:

الجھی روز و شب میں الجھ کر نہ رہ جا   کہ تیرے زمان و مکاں اور بھی ہیں

سارا قرآن مجید جنت و دوزخ کے مقامات کے ذکر سے بھرا پڑا ہے۔ اقبال جس ہستی سے عشق کا بڑا دعویٰ کرتے ہیں اس ہستی مبارک کو معراج کی رات جنت دوزخ دکھائی گئی تھی۔

مرزا غالب نے بھی تو کہا تھا:

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت لیکن   دل کے بہلانے کو غالب یہ خیال اچھا ہے

''اقبال خاندانی منصوبہ بندی سے متعلق قانون سازی کے حق میں تھے'' ملاحظہ ہو جسٹس جاوید اقبال (فرزند اقبال) کی سوانح ''اپنا گریباں چاک'' صفحہ 282۔

جب کہ اللہ نے کہا اولاد کو رزق کی تنگی کے ڈر سے ہلاک نہ کرو ہم تمھیں بھی رزق دیتے ہیں تمھاری اولاد کو بھی دیں گے۔

''اپنا گریباں چاک'' ہی کے حوالے سے عرض ہے اقبال ایک سے زائد شادیوں پر شرعاً امتناع کو جائز قرار دیتے تھے (جب کہ انھوں نے خود تین شادیاں کر رکھی تھیں) اقبال کے خیال میں اسلامی ریاست کا سربراہ کسی بھی قرآنی حکم یا اجازت کی تعویق (التوا)، تحدید یا توسیع کر سکتا ہے۔ (صفحہ 282) نعوذ باللہ۔

جسٹس جاوید اقبال نے اپنی کتاب ''اپنا گریباں چاک'' میں یہ بھی انکشاف کیا کہ ''مولانا شبلی (نعمانی) کی طرح اقبال بھی مسلمانوں میں فری مارکیٹ اکانومی کے فروغ کی خاطر بنکوں کے منافع کو ربوا (سود) کے زمرے میں نہیں لاتے تھے۔ حالانکہ اللہ نے ہر قسم کے سود کو حرام قرار دیا ہے۔

اقبال کے خیال میں انسان موت کے بعد اگر چاہے تو حیات کا تسلسل ختم کر کے ہمیشہ کے لیے نیست و نابود ہو سکتا ہے۔ ایسی روحانی خودکشی کا اُسے اختیار ہے (ملاحظہ ہو اپنا گریباں چاک صفحہ 318)۔ جس دین میں جسمانی خودکشی ہی کی اجازت نہیں وہاں روحانی خودکشی کا فلسفہ سمجھ سے باہر ہے۔

راسخ العقیدہ مسلمانوں کو اقبال کے یہ تضادات ممکن ہے کھل جائیں مگر اقبال بے انتہا پڑھے لکھے، فلسفی و شاعر تھے۔ ان کے یہ اجتہادات اُن کی علمیت کے نتائج ہو سکتے ہیں جو ضروری نہیں کہ دوسروں کے لیے قابل قبول بھی ہوں۔

دور ہے کہ قریب ہے

غضنفر

سنجیدہ قیافہ، شریفانہ جامہ، بردبارانہ طبع، مفکرانہ سوچ، منطقیانہ اپروچ، دانشورانہ تیوراور مدبرانہ نظر والا شخص تھا تو میرا دوست مگر میں اس کے یا وہ میرے ساتھ اس طرح بے تکلف نہ ہو سکا جس طرح دوست ہوا کرتے ہیں۔فقدانِ بے تکلفی کا سبب تھا ہمارا میلانِ طبع۔ایک طرف غازۂ متانت ضرورت سے زیادہ گاڑھا اور دوسری جانب گردِ آوارگی حد سے زیادہ۔اس تضاد کے باوجود میں اس سے بندھا رہا کہ اس کی شخصیت کا منفرد طور مجھے اپنی طرف کھینچتا رہا۔

اس کی کشش کا پہلا محور جس پر توجہ مرتکز ہوتی تھی، بالوں کے اوپر جے برف کے گالوں کا وہ گولا تھا جسے بن موسم کی برف باری نے جما دیا تھا مگر عجیب بات یہ کہ سفیدی پیری کی غماز بننے کے بجائے جوانی کی بڑاقی کا اشتہار بن گئی تھی۔

کشش کا دوسرا مرکز اس کی سنجیدہ مزاجی کا وہ مظہر تھا جو آئے دن لوگوں کے مشاہدے میں آیا کرتا تھا۔ شعبے کے کوری ڈور یا یونیورسٹی کیمپس کی کسی ڈگر پر کسی نے اسے سلام کیا تو جواب میں اس کے لبوں سے وعلیکم السلام کے علاوہ کوئی اور لفظ نہیں نکلا۔نہ ہی لہجے میں کوئی کھنک پیدا ہوئی اور نہ ہی نگاہوں میں کوئی چمک۔جو سماعتیں سلام کے جواب میں وعلیکم السلام کے علاوہ، مزاج شریف، مزاج اچھے ہیں؟ کیسے ہیں؟ کیا احوال ہیں؟ وغیرہ فقرے سننے اور آنکھیں سلام کا اثر چہرے پر دیکھنا چاہتی ہیں، انھیں برا بھی لگتا تھا یا کم سے کم اچھا نہیں لگتا تھا مگر اتنا میں دعوے کے ساتھ کہہ سکتا ہوں کہ اس کی یہ سنجیدگی اوڑھی ہوئی نہیں تھی جیسا کہ عموماً پروفیسری مل جانے کے بعد اوڑھ لی جاتی ہے۔یہ متانت اس کے مزاج کا حصہ تھی۔اس میں تکبر یا غرور کا کوئی عمل دخل نہیں تھا۔

اس کی جانب متوجہ ہونے کا ایک سبب یہ بھی تھا کہ وہ دانشورانہ تیور بھی رکھتا تھا۔اس تیور کو تیج دینے اور تند و تیز کرنے میں اس کے جذبۂ حصولِ علم اور شوقِ مطالعہ کا سب سے زیادہ ہاتھ رہا۔جب وہ کیمپس میں داخل ہوا تھا تو اتنا دانا و بینا نہیں لگتا تھا اگر چہ بصیرت کا چشمہ اس کے چہرے پر جب بھی موجود تھا، مگر بعد میں اس کے شیشوں سے بصیرت افروز شعاعیں منعکس ہونے لگی تھیں۔اس انعکاس میں اس کے شوقِ مطالعہ نے زبردست کردار نبھایا۔

دانش گاہِ سرسیدی میں اس کا شوقِ مطالعہ اتنا بڑھا کہ وہ دردو داغ سے دریدا، فانی وفراق سے فوکاں اور للّو لال اور ل احمد سے لاراں تک پہنچ گیا۔ قاضی سے کملیشور تک کا سفر اس نے تیزی سے طے کرلیا۔ اسد محمد خاں کے جانی میاں کے عکس سے لے کر اودے پرکاش کی پیلی چھتری تک کا سایہ بھی کچھ اس کے ذہن میں رچ بس گیا۔

علم وادب کا یہ نیا آہنگ صرف اسی کی سماعت تک محدود نہ رہے بلکہ، اس کے شاگردوں کے ذہن میں بھی اس کی گونج سنائی دے۔ یہ دریدائی رنگ ان کے اوپر بھی چڑھ جائے، ان کے لبوں سے بھی ساختیات، پس ساختیات، بین المتونیت وغیرہ کے سُر سنائی دیں۔ وہ بھی مابعد جدیدیت کی تھاپ پر رقص کرسکیں اور ان کے اندر بھی نئے معاشرے کو سمجھنے کی صلاحیت پیدا ہو سکے، اس کے لیے اس نے افلاطونی نشستوں کا بھی التزام کہ اس کے حلقۂ علم وادب سے بھی کچھ ارسطو نکل سکیں مگر شاید وہ یہ بھول گیا کہ پاؤ پاؤ بھر کی بوتلیں ایک ایک کلو روغن کی متحمل نہیں ہوسکتیں۔ اس لیے باقی تیل تو اِدھر اُدھر بہا ہی، اس کی دھار نے بوتلوں کو بھی کمزور کیا۔

مجھے کئی بار اس کے ارسطوؤں کی صف میں بیٹھنے کا موقع ملا۔ میں نے اسے توجہ سے سنا۔ اس کی باتوں میں دانشوروں کو دیکھا۔ استدلال واستفسار میں دانشوری کو محسوس کیا۔ منطقی اظہار اور گل افشانیِ گفتار کا لطف اٹھایا۔ اس کی طلاقتِ لسانی کا قائل ہوا۔ زباں پر داد بھی آئی اور دل سے دعا بھی نکلی کہ اللہ کرے زورِ زباں اور زیادہ مگر جب اس نے ترسیل وابلاغ کا تحریری راستہ اختیار کیا تو حیرت ہوئی۔ اس سے پہلے کہ میں اس کے اس راستے پر آپ کو لے چلوں، اپنے ہمراہ اس کمرے تک لے چلتا ہوں جہاں وہ اپنے ارسطوؤں سے ہم کلام ہوا کرتا تھا۔

یہ وہ کمرہ ہے جہاں ایک دن اس کے کچھ طلبہ کے علاوہ اس کے کئی احباب بیٹھے اسے مبہوت ہو کر سن رہے تھے۔ اسی دوران اس کے اور ہم سب کے بھی ایک چہیتے دوست کمرے میں داخل ہوئے۔ چہیتے وہ اپنی معصوم قسم کی حرکتوں کے علاوہ، اس سنجیدہ عمل کی بدولت بھی بن گئے تھے کہ وہ ہم سے زیادہ پڑھتے تھے۔ ان کا زیادہ تر وقت مولانا آزاد لائبریری میں گزرتا تھا جس کے گواہ نئی پرانی کتابوں کے حاشیے پر پنسل سے بنے وہ گولے ہیں جو ان کی پسند اور ناپسند کی بھی گواہی دیتے ہیں۔

انھیں دیکھتے ہی صاحبِ کمرہ کی توجہ ان کی طرف مرکوز ہوگئی اور بے ساختہ اس کے منہ سے یہ جملہ اچھل پڑا ''یار کچھ پڑھا لکھا بھی کرو۔''

یہ جملہ سنتے ہی نو وارد کے چہرے کا پکا رنگ اور بھی پک گیا۔ وہ ایک دم سے سناٹے میں آگئے جیسے انھیں کسی بچھو نے ڈنک مار دیا ہو۔ کچھ لمحے تک تو وہ کمرے میں بے حس وحرکت کھڑے رہے پھر برق کی سی سرعت

کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گئے۔صاحب کمرہ کی گفتگو کا رُکا ہوا سلسلہ پھر سے جاری ہوگیا۔

کوئی پندرہ بیس منٹ بعد کمرے سے باہر گیا ہوا شخص ایک عجیب سی دھمک کے ساتھ دوبارہ داخل ہوا اور ٹھیک صاحبِ کمرہ کی کرسی کے قریب جا کر اس کے کان میں زور سے بولا ''قبلہ ذرا اپنی دو چار کتابوں کے نام بتا دیجیے میں پڑھنا چاہتا ہوں''۔ نہلے پہ دہلا پھینک کر وہ اسی دھمک کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا۔وہ تو نکل گیا مگر اس کے جملے سے پھوٹے قہقہوں کی گونج سے کمرہ اب بھی گونج رہا تھا۔قہقہہ پھوٹنے کا سبب یہ تھا کہ صاحبِ تقریر کی اس وقت تک صرف ایک کتاب ہی تحریری شکل میں آپائی تھی۔اُدھر صاحبِ کمرہ بھو چکا کہ آخر اس نے ایسا کیا کردیا کہ آکر جانے والا آدمی اتنا بڑا طوفان برپا کر گیا۔کتاب والا طنزِ ملیح اُسے چبھا ضرور مگر اس نے اپنی ٹیس کا ذرا بھی اظہار نہیں کیا اور نہ ہی اپنے اندر کی کیفیت کو ہاؤ بھاؤ سے باہر آنے دیا۔شاید برا بھی نہیں مانا کیوں کہ برا مانتا تو وہ اس صورتِ حال پر بھی لیکچر ضرور جھاڑتا۔وہ پھر سے اپنی اسی رَو اور روش پر آ گیا جس پر کچھ لمحے پہلے تھا۔یہ اس کی اعلا ظرفی کا ثبوت ہی نہیں تھا بلکہ میرے لیے اس کی شخصیت کی کشش کا ایک اور مظہر بھی تھا۔

اس دن کے واقعے کا اثر تھا یا پھر اس احساس کا دباؤ کہ محض چند طلبہ کو بٹھا کر اپنے مخزنِ علوم کے متن کو سنا دینے سے کام نہیں چلے گا بلکہ تحریر کا وسیلہ بھی ضروری ہے کہ اس وسیلے سے زیادہ سے زیادہ اذہان یا جویائے علم تک رسائی حاصل کی جا سکتی ہے۔چنانچہ اپنے لب و دہن کے ساتھ ساتھ اپنے خامے کو بھی اس نے متحرک کردیا۔ممکن ہے دباؤ کا اثر نہ ہو مگر یہ تو سچ ہے کہ زخشِ خامہ کی رفتار بڑھی اور بڑھتی چلی گئی۔

میں اس حقیقت کا اعتراف کر چکا ہوں کہ میں اس کے وصفِ تقریر کا قائل ہوں بلکہ اس کی گفتگو کی شمشیرِ آب دار کی کاٹ کا قتیل بھی ہوں۔اس لیے کہ وہ موضوع و مواد کے مشکل نکات اور پیچیدہ معاملات کو بھی آسانی سے ذہن میں اتار دیتا ہے اور اتنی صفائی سے بات کرتا ہے کہ علمیت کی گانٹھیں بھی سرک جاتی ہیں اور غرابت کی گرہیں بھی۔مگر عجیب بات ہے کہ اتنا صاف بولنے والا جب لکھنا شروع کرتا ہے تو پڑھنے والے کو محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے کی نگارش اکثر جگہوں پر لہرانے اور بل کھانے لگی ہے، جیسے قلم نے سیاہی کی جگہ کچھ اور پی لیا ہو۔

مجھے اپنے اس دوست کے ساتھ زیادہ رہنے کا اتفاق تو نہیں ہوا مگر میں جب بھی اس سے ملا اس کی شخصیت کا کوئی نہ کوئی پہلو ضرور مجھ پر کھلا۔

ایک بار یونیورسٹی کے کیمپس میں ایک صاحب نے اردو زبان کے خلاف ایک پمفلٹ بٹوایا۔ پمفلٹ کا متن یہ تھا کہ قوم اگر دوسری قوموں کے شانہ بہ شانہ ترقی کرنا چاہتی ہے تو اسے اردو سے دست بردار ہونا

پڑے گا، اس پمفلٹ کا نوٹس تو بہتوں نے لیا مگر لوہا صرف اس شخص نے لیا۔ باقاعدہ اور نہایت جوش وخروش اور غیظ وغضب کے عالم میں اس نے کرارا جواب دیا۔ اس سے اندازہ ہوا کہ اسے اپنی زبان سے کتنی محبت ہے اور اس کے نزدیک اردو کی کیا قدر و قیمت ہے جبکہ اس کے پاس ایک ایسی ترقی یافتہ زبان بھی تھی جو اس کے وجود کو قائم رکھنے اور دنیوی ترقی کے لیے کافی تھی۔ اس کے برعکس بعض اردو والے تو ایسے ہیں کہ اس ترقی یافتہ اور مرعوب کن زبان کی ہلکی سی ہوا بھی لگ جائے تو وہ خود کو بھاری بنا لیتے ہیں۔

ایک موقع پر اس کی اعلاظرفی اور فراخ دلی نے مجھے نادم ہونے سے بچا لیا۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی اور پروفیسر سید محمد عقیل رضوی صاحب اپنے کسی ذاتی کام سے علی گڑھ آئے تھے اور میرے گھر پر رکے ہوئے تھے۔ دوسرے ہی دن شعبۂ اردو میں کسی سمینار کا آغاز ہونے والا تھا۔ ان دنوں میں شعبۂ اردو میں ریڈر ہو کر آ گیا تھا۔ میرے دوست فاطمی نے مجھ سے کہا کہ میرا بہت جی چاہتا ہے کہ ہم سمینار میں شریک ہوتے مگر بن بلائے جانا مناسب نہیں ہوگا۔ میں نے جواب میں یقین دلا دیا کہ میں آپ کے نام کا دعوت نامہ کل لے آؤں گا۔ جب میں نے صدرِ شعبہ سے بات کی تو وہ انھوں نے کچھ ادھر اُدھر کی اور کچھ اصول وضوابط کی بات کر کے معاملے کو ٹال دیا۔ مجھے امید نہیں تھی کہ اس معمولی سی بات کا جواب نفی میں ملے گا۔ میری سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ میں فاطمی اور عقیل صاحب سے کیا کہوں گا کہ اچانک خیال آیا کہ اس سمینار کا کوآرڈی نیٹر تو وہ ہے جس کا خاکہ اس وقت تیار ہو رہا ہے۔ میں جھٹ سے اس کے پاس پہنچ گیا اور ان دونوں ادیبوں کی خواہش کا ذکر کیا تو وہ بغیر کسی سوچ بچار کے بول پڑا:

''یہ تو ہمارے اور ہمارے شعبے کے لیے اعزاز کی بات ہے۔ میں فوراً انھیں دعوت نامہ بھجواتا ہوں۔''

میں نے اس سے جب یہ کہا کہ وہ میرے گھر ٹھہرے ہوئے ہیں آپ دعوت نامہ مجھے دے دیجیے، میں ان تک پہنچا دوں گا تو اس کا جواب تھا:

''غضنفر یہ مناسب نہیں رہے گا۔ شریفانہ انداز تو یہ ہے کہ دعوت نامہ شعبہ کا کوئی چپراسی لے کر جائے۔ آپ بیٹھیے میں جاوید کو بلاتا ہوں۔''

اور اس طرح ایک چھوٹی سی بات پر بڑھی ہوئی میرے اندر ایک بڑی سی تکلیف کو اس نے ایک جملہ میں ختم کر دیا۔

اس کے اس ایک رویے نے میرے نزدیک اس کا قد کئی گنا بڑھا دیا۔

علی گڑھ سے جانے کے بعد بھی میں بار بار علی گڑھ آتا رہا۔ آنے کے اسباب میرے سرکاری پروگرام

ہوتے تھے جنھیں میں یونیورسٹی کے مختلف شعبوں کے تعاون سے منعقد کیا کرتا تھا۔ میرے پروگرام میں اساتذہ اور طلبہ سبھی شریک ہوا کرتے تھے۔ ایک دن میرے عزیز دوست سراج اجملی نے مجھ سے کہا کہ فلاں صاحب فرما رہے تھے کہ غضنفر اپنے پروگراموں میں کبھی مجھے نہیں بلاتے۔ میرا جواب یہ تھا اور بالکل ایمانداری والا جواب تھا کہ میں تو انھیں اس لیے مدعو نہیں کرتا کہ ابتدائی درجات کی تدریسی نوعیت کے پروگراموں میں آنا وہ اپنی شان اور مرتبے کے خلاف نہ سمجھیں، مگر اب جبکہ انھوں نے خود سے خواہش ظاہر کی ہے تو میں کل ہی انھیں ایک سیشن کی صدارت کے لیے مدعو کر لیتا ہوں۔ یہ فلاں صاحب بھی وہی تھے جن کا قصہ میں رقم کر رہا ہوں۔ سچ یہی تھا کہ میں اپنے اس دوست کو اس لیے مدعو نہیں کرتا تھا کہ چھوٹے موٹے مدرسانہ قسم کے موضوعات پر ہونے والے ورک شاپ میں بھلا ایک ایسا عالم کیسے شریک ہوگا جو دریدائی فلسفیوں کی رفعتوں سے نیچے نہیں اترتا مگر وہ شخص آیا اور میرے پروگرام کے نصابی موضوع پر زمینی سطح سے بات کی اور کچھ آسمانی نکات بھی سُجھائے۔ پروگرام کے خاتمے کے بعد شکریے کے ساتھ معذرت کے لیے میں نے وہ بات بھی کہہ دی کہ کیوں میں آپ کو نہیں بلاتا تھا۔ اس پر اس نے جواب میں جو کہا مجھے بہت اچھا لگا۔ اس نے کہا کہ ''غضنفر میں آپ کا دوست ہوں، آپ جب بھی یاد کریں گے مجھے حاضر پائیں گے۔'' اس کے اس جواب کو میری اس رائے سے کہ اس کی سنجیدگی میں تکبر کا کوئی عمل دخل نہیں تھا، سے جوڑ کر دیکھیں تو ان کے ذہنوں سے بھی جالے صاف ہو جائیں گے جن پر اس کی سنجیدگی گراں گزرتی ہے۔

میں نے ایک دوسرے پروگرام کا دعوت نامہ بھی اسے بھیج دیا جو جلد ہی شعبۂ لسانیات کے اشتراک سے منعقد ہونے والا تھا۔ پروگرام کے پہلے دوسرے دن تو وہ شریک ہوا مگر باقی دنوں میں غالباً کسی مصروفیت کے بنا پر شرکت نہ کر سکا۔ میرے پروگراموں کا ایک انداز یہ بھی ہوتا تھا کہ اگر کوئی پارٹی سپنٹ (Participant) کسی وجہ سے کسی روز دن میں حاضر نہیں ہو پاتا تھا، تو وہ اپنے حصے کا کام رات میں کر کے کسی وقت میرے حوالے کر جایا کرتا تھا اور کچھ لوگ مدت کی پابندی اور کام کی تکمیل نہیں بھی کرتے، جب بھی ان کا حساب پورا پورا ہی ہوتا تھا، ان کے آن ریریم کی ادائیگی میں کسی قسم کی تخفیف نہیں کی جاتی تھی۔ اس دوست کو چھوڑ کر سبھی شرکا نے آخری دن کے پروگرام میں شرکت کی اور اپنا اپنا رقمی لفافہ لے کر چلے گئے۔ دوسرے دن رسید اور لفافہ لے کر میں خود اس کے پاس پہنچ گیا۔ مجھے یقین تھا کہ وہ ایک یا دو دن سے زیادہ کا حساب کتاب قبول نہیں کرے گا اور میرے ضد کرنے کے باوجود پوری رقم لینے سے انکار کر دے گا مگر بغیر کچھ بولے رسید پر دستخط کر کے اس نے لفافہ اپنے پاس رکھ لیا۔ لوٹتے وقت پتا نہیں کیوں رہ رہ کر میرے دل میں یہ خواہش انگڑائی لیتی رہی کہ کاش وہ لفافہ یا زائد رقم لینے سے منع کر دیتا۔

اس طرح کی چاہ کسی اور کے لیے میرے دل میں کبھی نہیں جاگی تھی۔

اس کے اور دوسروں کے لکھنے پڑھنے میں، میں نے فرق یہ محسوس کیا کہ زیادہ تر اسکالرز سمیناری یا دیگر دباؤ میں کچھ لکھتے پڑھتے ہیں مگر اس کا لکھنا پڑھنا اس کے اپنے ذوق وشوق کی تسکین کے لیے ہوتا تھا۔ اس کی تحریروں میں اگر چہ مشکل پسندی ہوتی مگر ان میں خیالات کا وفور ہوتا اور ادبی وتہذیبی نکات کا منطقیانہ نظام بھی نظر آتا۔ اور اوروں کے برعکس جبر ائی عمل کے بجائے مراقبائی عمل کی کارفرمائی محسوس ہوتی۔

اس کی شخصیت کی کشش کا ایک سبب یہ بھی رہا کہ اس نے حیات وکائنات کے ان موضوعات سے بھی سروکار رکھا جن سے ادب والے خصوصاً اردو کے ادیب بہت دور رہتے ہیں اور اس کا یہ سروکار سرسری نہیں بلکہ خاصا سیریس محسوس ہوا۔

وہ مشکل سے کسی کی تخلیق کی تعریف کرتا، مجھے یاد نہیں کہ میری ایک کہانی ''پہچان'' اور ایک غزل جس کا ایک شعر۔

جو ہو رہا ہے اسے دیکھتے رہو چپ چاپ
یہی سکون سے جینے کی ایک صورت ہے

جسے دوسروں نے بھی کافی پسند کیا تھا، کو چھوڑ کر کسی تیسری تخلیق کی تحسین کی ہو۔ البتہ میری تدریسی صلاحیتوں کا وہ ہمیشہ معترف رہا اور جب اس نے اسکول کی سطح کے اساتذہ کے لیے ایک تربیتی نوعیت کا پروگرام مرتب کیا تو مجھے ایک دو روز کے لیے نہیں بلکہ پورے دس روز کے لیے مدعو کرلیا، مجھے پوری مدت تک روکے رکھنے کا سبب یہی تھا کہ وہ یہ جانتا تھا کہ اردو والوں کو اردو میں اردو کی بنیادی مہارتوں کے فروغ پر لگاتار دس روز کے لیے دلچسپی کو برقرار رکھتے ہوئے لیکچر دینا ہر ایک کے بس کی بات نہیں تھی۔

جب کسی کو کسی ادارے یا محکمہ کی سربراہی ملتی ہے تو وہ عام طور پر یہ کرتا ہے کہ بجٹ کا زیادہ سے زیادہ حصہ ایسے کاموں پر صرف ہو کہ جس سے اس کی قمیض میں ستارے ٹکیں اور نام میں چار چاند لگے۔ یا پھر ایسی ترکیبیں کرتا ہے کہ اس بجٹ سے اس کے دفتر کے اندھیرے دور ہوں یا نہ ہوں اس کی اپنی تاریکیوں میں سورج ضرور اتر آتا ہے۔ وہ کئی اداروں اور اکاڈمیوں کا سربراہ بنا مگر اس نے ان دونوں میں سے کوئی بھی کام نہیں کیا بلکہ بجٹ کا ایک بڑا حصہ کتابوں کی خریداری میں صرف کر دیا۔ اس کے اس عمل سے ذوقِ مطالعہ اور کتاب دوستی کا اندازہ تو ہوتا ہی ہے، اس کی اس دور اندیشی اور آگہی کا پتہ بھی چلتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں کس چیز کی ضرورت

زیادہ ہوتی ہے اور کون سی شئے اس ادارے کو کہاں لے کے جاتی ہے۔

وہ تخلیق کار نہیں ہے مگر اسے تخلیقیت پسند ہے کہ وہ تخلیق اور تخلیقیت کے رشتہ اور اس کی قوت سے اچھی طرح واقف ہے۔ اسے اس بات کا شدید احساس بھی ہے کہ ادب کے شعبہ میں میں سب سے زیادہ تخلیقیت پر زور دینا چاہیے کہ یہ مال بنانے کا شعبہ نہیں، بلکہ جذبے کو بیدار کرنے، احساس کو قوی بنانے، تخیل کو بلند پروازی سکھانے اور زبان کے جادو کو جگانے کا شعبہ ہے۔ اور یہ کام تخلیقیت کو فروغ دیے بنا ممکن نہیں۔ اسی لیے اس نے اپنے دورِ سربراہی میں تخلیقیت کا تعارف کرایا اور اسے شاملِ نصاب کیا۔ جبکہ عام صورتِ حال یہ ہے کہ ادب کے پروفیسران تخلیقیت سے خود تو دور رہتے ہی ہیں، طلبہ کو بھی دور رکھنے کا جتن کرتے ہیں۔

مجھے میرے تعلیمی سفر کے دوران دو ایسے آدمیوں سے ملاقات ہوئی جو مذہب اور مذہبی معاملات سے دور لگے مگر معاملاتِ ملت میں بہت قریب محسوس ہوئے۔ ایک نجیب جنگ، سابق شیخ الجامعہ، جامعہ ملیہ اسلامیہ اور دوسرا میرا یہ دوست۔ میں نے اپنے اس دوست کی باتوں میں اور اس کے رویوں میں بھی ہمیشہ ملت کا درد محسوس کیا۔ یہ وہی درد ہے جسے سر سید احمد خاں کی آنکھوں میں دیکھا گیا اور اقبال کے شعروں میں محسوس کیا گیا۔

وہ سبکدوش ہو چکا ہے مگر اب بھی اس کا من شعبہ میں اٹکا رہتا ہے اور صرف من ہی کیوں تن بھی تو اکثر اس کا شعبہ کے آس پاس ہی دکھائی دیتا ہے۔ ممکن ہے آپ کا ذہن کسی اور طرف بھٹک رہا ہو، کہ بقول نادر علی خاں صاحب: آپ کا ذہن کثافت و غلاظت کا منبع ہے مگر میرا مدعا یہ ہے کہ علم حاصل کرنے اور علم بانٹنے کا شوق اس میں جنون کی حد تک ہے اور ظاہر ہے یہ جنونی شوق گھر میں رہ کر پورا نہیں کیا جا سکتا۔ اس کا یہ جنون طلبہ بلکہ بعض اساتذہ کو بھی فرزانگی عطا تو کرتا ہی ہے اس کہاوت کو بھی اُلٹ دیتا ہے کہ "پیاسا کوئیں کے پاس جاتا ہے"۔

وہ عمر کے آخری دور میں ضرور پہنچ گیا ہے مگر اب بھی درمیانی عہد میں دکھائی دیتا ہے جس کی وجہ میرے خیال میں اس کے وہ برّاقی ہے جو اپنی چمک سے دونوں زمانوں کو ایک کر دیتی ہے۔ اس طرح پیری اور شباب کا امتیاز مٹ جاتا ہے۔ عہدِ سرِ سیاہ والی سفیدی اسے صرف جوان دکھاتی ہی نہیں بلکہ اس کے جمال میں مقناطیسی کشش بھر کر اسے جوان بناتی بھی ہے۔ بالوں کی چمک دار سفیدی کے ساتھ جمال کے آنے سے آپ یہ سمجھ رہے ہوں گے کہ میں قاضی جمال حسین کی بات کر رہا ہوں مگر میں یہاں جمال کی نہیں بلکہ جمال کے کمال کا بکھان کرنے والے بڑے بھائی قاضی افضال حسین کا ذکر کر رہا ہوں جن کے منہ سے چھوٹے بھائی کی تعریف سن کر ہم سب کے مشترکہ دوست پروفیسر خورشید احمد ایک سرد آہ کھینچ کر فرمایا کرتے ہیں کہ کاش میرا بھی کوئی بڑا بھائی ہوتا۔

مولانا محمد علی کے سوانح کے دو گم شدہ باب

اسیم کاویانی

خواجہ حسن نظامی سے معرکہ آرائی اور خلافت فنڈ کا غبن

(انتباہ: متداول روایتی، جذباتی اور صحافتی سوانح
عمریوں کی بنا پر ہیرو پرستی کا شکار ہو چکے قارئین
کے لیے اس مضمون کے کئی درشت مگر درست ا
نکشافات تکلیف دہ ثابت ہو سکتے ہیں۔اک)

ہمارے یہاں شخصیت پسندی نے شخصیت پرستی اور پھر ترقی کرتے کرتے شخصیت سازی کی صنعت جیسی صورت اختیار کر لی ہے۔کسی کی شخصیت وفن یا کارہائے نمایاں کا ابتدا میں جو عقیدت مندانہ خاکہ بن گیا یا باور کرایا گیا،عموماً وہی آیندگان کے لیے بلو پرنٹ (blueprint) کا کام کرتا رہتا ہے۔کم یاب کو چھوڑیں،دست یاب مواد تک کی چھان پھٹک اور نئے پہلوؤں کی تحقیق وتلاش کا ذوق وظرف معدوم ہوتا جا رہا ہے اور اگر کسی کے ادب وصحافت پر مذہبی حمیت وحمایت کے مقدس سائے دراز ہیں تو وہ ایک طرح سے برگزیدہ مان کر اپنی بہت سی کمیوں اور کج رویوں یہاں تک کہ غلط کاریوں کے احتساب سے بھی بری سمجھ لیا جاتا ہے۔افسوس اس بات کا ہے کہ یہ امر ہمارے دانش وروں کے یہاں باعثِ تشویش بھی نظر نہیں آتا کہ جن بتوں کی عشوہ انگیزیوں کے آگے سرِ نیاز خم کرنے کے آداب ہم اپنی آیندہ نسلوں کو سکھاتے جا رہے ہیں،ان اصنام کے حسن کی کتنی اصلیت ہے اور کتنا ملمع۔

اس مضمون کے ذریعے مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کی ایک قلمی جنگ کی روداد،خواجہ کی ایک کم یاب ضخیم کتاب 'نمونۂ جنگِ صفین' کو بنیادی مصدر بنا کر پیش کی جا رہی ہے۔یہ تنازعہ بہ ظاہر ایک معمولی سے خط سے شروع ہوا تھا،لیکن وہ خط ایک انگریزی مثل کی رو سے چائے کی پیالی میں طوفان ثابت ہوا تھا اور اسی ضمن میں خلافت فنڈ کے غبن کا معاملہ بھی اچھالا گیا تھا۔مجموعی طور پر اس قضیے کے دوران خواجہ حسن نظامی جیسے صاحبِ طرز ادیب اور محمد علی جیسے مقبول لیڈر کی زندگی کے بہت سے ایسے گوشے بے نقاب ہوئے کہ ان کی بدنمائی نے ان دونوں ہی کی شہرت کو داغ دار کیا۔محمد علی زیادہ قد آور تھے،اس لیے زیادہ نقصان بھی انھیں پہنچا۔اس مضمون کو قلم بند کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس ہوئی کہ اس کے اکثر مندرجات کی تصدیق مولانا اور خواجہ کے معاصرین کی

تحریروں سے اور خود مولانا محمد علی کی نگارشات سے ہوتی چلی گئی۔خواجہ حسن نظامی کے ساتھ تنازعات کا جُڑنا کوئی نئی بات نہیں تھی۔

نمونۂ جنگِ صفین

اس دور کے کئی ادیبوں کے یہاں اس قضیے کا ذکر ملتا ہے۔عبدالمجید سالک کا بیان ہے کہ 'جن دنوں مولانا محمد علی دہلی سے اپنا روزنامہ 'ہمدرد' نکالتے تھے۔انھیں کہیں سے معلوم ہوا کہ خواجہ حسن نظامی نے چیف کمشنر دہلی سے مولانا کی شکایت کی ہے اور ان کی گرفتاری کا مشورہ دیا ہے۔خدا جانے اس افواہ میں کوئی حقیقت تھی بھی یا نہیں،لیکن مولانا محمد علی کی جنگ جوئی نے خواجہ کے خلاف ایک باقاعدہ محاذ قائم کرلیا۔(ص:171,172)،رئیس احمد جعفری نے لکھا تھا:'......ذاتیات پر حملے کرنے میں کمی کسی طرف سے نہیں ہوئی۔ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محمد علی خواجہ صاحب کی خواجگی کو ختم کر کے چھوڑیں گے اور خواجہ صاحب محمد علی کی لیڈری کو بے کفن دفن کردینے کے درپے تھے۔(ص:51)،ماہرالقادری نے تحریر کیا تھا کہ دیوان سنگھ مفتوں کی کسی بات پر خواجہ صاحب سے کھٹک گئی تو انھوں نے خواجہ کے وہ (متنازعہ) خط 'ریاست' میں چھاپ دیے تھے۔(ص: 185)،ملحوظ رہے کہ سالک،جعفری اور ماہر سب ہی مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی کے ہم عصر تھے۔دیوان سنگھ مفتوں کے تعلق سے شوکت علی فہمی نے لکھا ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے 1919 میں روزنامہ 'رعیت' جاری کیا تھا اور 'رعیت' ہی میں سردار دیوان سنگھ نے اخبار نویسی کی تربیت حاصل کی تھی،آگے چل کر سردار نے خود اپنا اخبار 'ریاست' نکالا اور صحافت میں اپنا ایک مقام بنایا'۔(ص:21،'آج کل')،ڈاکٹر امام مرتضیٰ جنھوں نے خواجہ حسن نظامی پر ڈاکٹریٹ کی تھی،نے لکھا ہے کہ سردار دیوان سنگھ اور خواجہ حسن نظامی دونوں ہی صحافت کے پیشے سے وابستہ تھے اس لیے ان میں معاصرانہ رقابت تھی۔اس دور میں شدھی اور تبلیغ کے متوالوں کے بیچ مجادلے چلتے رہتے تھے اور سردار اپنے اخبار میں انھیں نشانہ بنایا کرتے تھے۔انھوں نے خواجہ حسن نظامی کو انگریزوں کا جاسوس قرار دے دیا تھا۔اپنے اس الزام کے ثبوت میں انھوں نے خواجہ حسن نظامی کے ہاتھ کے لکھے دو خط 'ریاست' میں شائع کیے تھے جو کہ انھیں شیخ ضیاالحق (مولوی عبدالحق سکریٹری انجمن ترقی اردو کے حقیقی بھائی) سے حاصل ہوئے تھے۔جن راویوں نے یہ لکھا ہے کہ وہ خط خواجہ حسن نظامی کی موت کا باعث بنے،وہ غلطی پر ہیں۔ان کی موت 1955 میں ہوئی تھی،اس قضیے کے کوئی تیس برس بعد۔

شیخ ضیاالحق،مولانا محمد علی کے شناسا تھے۔جب مولانا کو معلوم ہوا کہ خواجہ حسن نظامی نے ان کے خلاف

چیف کمشنر دہلی کے کان بھرے ہیں تو انھوں نے ان خطوط کی بنا پر خواجہ کے خلاف 'ہمدرد' میں 17 نومبر 1926 کو اعلان جنگ کر دیا اور 'ختمِ خواجگی' کے عنوان کے تحت لکھنا شروع کیا۔ ادھر خواجہ نے بھی کمر کس لی اور اپنے اخبار 'منادی' میں ان کے خلاف محاذ کھول دیا۔ اس قلمی جنگ کی ساری تفصیل کو خواجہ حسن نظامی نے اپنی سات سو سے زیادہ صفحات پر مشتمل کتاب 'نمونۂ جنگِ صفین' میں محفوظ کر دیا تھا جو پیشِ نظر مضمون کا بنیادی ماخذ ہے، ساتھ ہی مولانا محمد علی کی 'ہمدرد' میں نکلی تحریروں کو ان کے مضامین و مقالات کے مجموعوں میں تلاش کرنے کی سعی کی گئی ہے۔ اس قضیے کی ذیل میں آئے بہت سے مندرجات ایسے ہیں جن کی تصدیق کے لیے اس دور کے ادبی اور صحافتی حوالے موجود ہیں، اس لیے انھیں بھی بقدرِ ضرورت اس مضمون میں شامل کیا گیا ہے۔ مولانا محمد علی نے اس قلمی جنگ کو اپنے نام (علی) کی رعایت سے 'جنگِ صفین' سے تعبیر کیا تھا تو خواجہ حسن نظامی نے اس کی توجیہ اپنے انداز میں کی تھی۔ 'نمونۂ جنگِ صفین' کی تمہید میں یہ عبارت درج ہے:

دماغی و قلمی

نمونۂ جنگِ صفین

'یعنی ...... اس قلمی لڑائی کا مکمل تذکرہ جو 17 نومبر 1926 کو مسٹر محمد علی نے شروع کی اور جس کو خواجہ حسن نظامی دہلوی نے 24 دسمبر 1926 کو ختم کر دیا۔ جس میں اس جھگڑے کی نسبت سے بعض اسلامی اخبارات کے مضامین اور مسلمانوں کے خطوط بھی ہیں۔ جس کو کارکن حلقۂ مشائخ دہلی نے ماہ اپریل 1927 میں پہلی بار شائع کیا۔ 'کتاب کے آخری صفحے پر کتاب کی وجہ تسمیہ یہ بتائی گئی ہے کہ محمد علی نے 'ہمدرد' میں بار بار یہ لکھا تھا کہ 'حسن نظامی سے ان کی یہ لڑائی جنگ صفین کی لڑائی ہے اور ...... چوں کہ صفین کے مقام پر حضرت علی اور امیر معاویہ میں لڑائی ہوئی تھی اور میں (نظامی) حضرت علی کی اولاد ہوں، اس اعتبار سے محمد علی نے مجھ پر کیے گئے حملے کو خود ہی امیر معاویہ کا حملہ قرار دے دیا ہے۔ اس وجہ سے کتاب کا نام نمونۂ جنگِ صفین رکھا گیا ہے۔

(حسن نظامی)'

اس کے علاوہ خواجہ حسن نظامی نے اس جنگ کے لیے (اپنے چاہنے والوں کی طرف سے) 'غریبوں کا اخبار' بھی جاری کیا تھا جس کی قیمت دو پیسے تھی۔ ان کا کہنا تھا کہ جس طرح ان کے دادا سیدنا حضرت علی کو جمل اور

صفین کی لڑائیوں کے لیے مخالفوں نے مجبور کیا تھا، اسی طرح کی لڑائی باطل نے ان پر تھوپی ہے۔انھوں نے اعلان کیا تھا کہ وہ اپنے حریف کی مفسدہ پردازی کا دسمبر 1926 تک قلع قمع کر دیں گے۔'(ص: 32,33)۔اس قضیے کی جڑ جو خط بنا تھا اس کی اصل عبارت، اُسی املے میں یوں ہے:

۷۸۶

'از درگاہ شریف محبوب الٰہیؒ، دہلی۔۔۱۲ اگست ۱۹۱۸

مکرمی السلام علیکم

دو خط پہونچے۔ابھی دو چار دن کی اور مصروفیت ہے۔اسکے بعد خط لکھنے کی کوشش کروں گا۔لکھائی کا حساب رجسٹر میں دکھوا کر مطلع

کروں گا۔

کیا عجب کہ گورنمنٹ نے لکھا ہو میں نے چیف کمشنر صاحب دہلی سے مفصل حالات بیان کر دئے تھے اور نظام کو پان اسلام ازم کے جو سبق

دئے جاتے تھے انکی باضابطہ اطلاع دے دی تھی اور مجھے معلوم ہے کہ انھوں نے پنجاب گورنمنٹ کو اس خطرے سے آگاہ بھی کیا تھا۔(یہ خط

بالکل خانگی ہے اسکو چاک کر دیجئے اور اسکی اطلاع کسی کو نہ دیجئے، یعنی میرے اس کام کی خبر سوائے آپ کے کسیکو نہ ہو۔

حسن نظامی'

مہذب ڈاکو : خواجہ نظامی کا دوسرا خط پہلے کی تائید مزید میں تھا۔شیخ ضیاالحق جنھوں نے دونوں خط اڈیٹر 'ریاست' کو ارسال کیے تھے، ان کے بارے میں ہمیں سردار دیوان سنگھ مفتوں کی 'نا قابلِ فراموش' سے یہ معلومات ملتی ہے کہ 'غالباً1906 کی بات ہے کہ تین بھائی صوفی امبا پرشاد، سردار اجیت سنگھ (مشہور انقلابی بھگت سنگھ کے حقیقی چچا) اور شیخ ضیاالحق غیر مما لک کی امداد کے ذریعے ہندستان سے باہر گئے۔ان میں صوفی امبا پرشاد کا تو ایران میں انتقال ہو گیا۔سردار اجیت سنگھ ایران سے روپوش ہو کے یورپ چلے گئے اور شیخ ضیاالحق برتانوی سفیر متعینہ ایران کے ایما سے طہران میں گرفتار ہوئے اور ہندستان لائے گئے۔یہاں سات برس قید رہے اور اس کے بعد رہا کیے گئے۔'(ص:496)۔مولانا محمد علی نے جو لوگوں کے نام بنانے یا بگاڑنے کے لیے مشہور تھے، ضیاالحق

کو 'مہذب ڈاکو' کا نام دیا تھا، شاید اس لیے کہ چاہے حکومت کی نظر میں ان کا کردار مشتبہ رہا ہو، وہ محمد علی کے لیے کارآمد ثابت ہوئے تھے۔اس قلمی جنگ کے سلسلے میں 'مہذب ڈاکو' کے نام سے ایک کتاب بھی غالباً محمد علی یا ان کے حامیوں کی طرف سے شائع ہوئی تھی جو راقم کو دست یاب نہیں ہوئی۔

خواجہ حسن نظامی کی نظام پرستی اور دفاعی پوزیشن: اس قلمی جنگ میں ایک پہلو دونوں حریفوں میں نظام حیدرآباد کی خیر خواہی میں مسابقت کا اور ان کی نظروں میں ایک دوسرے کو نیچا دکھانے کا بھی جھلکتا ہے۔ نظام حیدرآباد نے 7 اپریل 1920 کو اپنا ایک فرمان جاری کیا تھا، جس کی رو سے ریاست کے باشندوں پر تحریکِ خلافت میں کسی بھی طرح کی شرکت پر پابندی لگادی تھی۔خواجہ حسن نظامی نے اقرار کیا تھا کہ انھوں نے نہ صرف 'حضور نظام کی اسلامی سلطنت کو خلافت کی تحریک سے بچانے کی کوشش کی تھی بلکہ مہاتما گاندھی اور مولانا عبدالباری سے اس موقف کی تحریریں حاصل کرکے کہ دیسی ریاستوں میں خلافت کا ایجی ٹیشن مناسب نہیں ہے، 'گاندھی جی کا فیصلہ' نامی کتابچہ بھی چھپوا کر کے بانٹا تھا۔بقول خواجہ 'حضور نظام نے پان اسلام ازم کا کوئی کام ہی نہیں کیا تو وہ انگریزوں سے کس بات کی جاسوسی کرتے؟'، 'حضور نظام نے تو 'خلافتی پارٹی' کا دیا ہوا خطاب بھی یہ کہہ کر واپس کردیا تھا کہ میرے لیے 'آصف جاہ' اور انگریزوں کا دیا ہوا 'ہز اگزالٹیڈ ہائی نس' کا خطاب کافی ہے۔'خواجہ نظامی نے طعنہ دیا تھا کہ آج محمد علی نظام کے دوست بنتے ہیں، لیکن جب مرادآباد کے جلسۂ جمعیۃ العلما میں حضور نظام کے واپسیِ برار کے مطالبے کی تائید میں رزولیوشن پیش کیا گیا تھا (اس بنا پر کہ لارڈ ولزلی نے subsidiery system کے تحت نظام کے برار کے اضلاع پر قبضہ کرلیا تھا۔اک) تو

> 'یہی رستمِ دوراں، سہرابِ زماں، ارجنِ ثانی، بھیم استخوانی حضرت مولانا محمد علی مقدس بیابانی نظام کی مخالفت میں لالہ لاجپت رائے یا سوامی شردھانند یا پنڈت مالوی جی کی بھاشا بول رہے تھے اور انھوں نے بڑے بڑے علما کو لالچی اور نظام کا زرخرید بتایا تھا، جس کا دندان شکن جواب مولانا شبیر احمد عثمانی نے دے کر اُن کے دانت کھٹے کردیے تھے اور آپ کو بھیشم پتاما کی طرح لوہے کے کانٹوں پر لیٹنا پڑا تھا اور مولانا احمد سعید ناظم جمعیۃ العلماے ہند کی پارٹی نے حضور نظام کی موافقت میں واپسیِ برار کا رزولیوشن انھیں شکست دے کر اتفاق رائے سے منظور کرالیا تھا۔' (ص: 27)

ایک غیر جانب دارانہ تجزیہ: زیرِ تذکرہ کتاب میں ایک غیر جانب دار کے قلم سے 'مولانا محمد علی اور خواجہ حسن

نظامی کے بیانات پر ایک نظر' کی سرخی کے
تحت ایک سلجھا ہوا تفصیلی مضمون بھی شامل ہے، جس سے اس قضیے کے سیاق وسباق اور فریقین کے بیانات پر خاصی روشنی پڑتی ہے اور یہ بھی پتا چلتا ہے کہ
مولانا محمد علی نے خواجہ حسن نظامی کے ساتھ ساتھ ظفر علی خاں کے خلاف بھی محاذ کھول لیا تھا۔ مضمون کے خاص نکات یوں ہیں:

☆ مولانا محمد علی کا دعوا ہے کہ خواجہ حسن نظامی نے حکومت ہند کا ایک جاسوس بن کر ریاست حیدر آباد کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی ہے اور اپنی اس کوشش کی اطلاع اس خط کے ذریعے سے مکتوب الیہ (جو زید وعمرو بکر کوئی بھی ہو) کو دی ہے۔ مولانا کا وکیلوں کا سا انداز بظاہر اپنی بات باور کرانے میں کام یاب نظر آتا ہے۔ خط کی عبارت سے ظاہر ہوتا ہے کہ مکتوب الیہ سے اس معاملے کے متعلق پہلے بھی خط کتابت ہو چکی ہے اور وہ ان باتوں کے پس منظر سے واقف ہے۔ اس لیے خواجہ صاحب کا یہ فرمانا کہ خط مہذب ڈاکو کے جواب میں لکھا گیا تھا، صحیح لگتا ہے۔ (ص: 35) ☆ ''نظام کو پین اسلام ازم کے جو سبق دئے
جاتے تھے۔'' کے الفاظ سے الزام قائم کرنا درست نہ ہوگا۔ یہ کچھ ایسی بات ہے جیسے کسی کا اپنے دوست سے یہ کہنا کہ' آپ کے لڑکے کو آج کل عیاشی کے سبق
پڑھائے جا رہے ہیں'، اس سے مراد لڑکے کو عیاشی کا ملزم بنانا نہیں بلکہ محض یہ اطلاع دینا ہوگا کہ مفسد اسے غلط راہ پر لے جانے میں کوشاں ہیں۔
(ص: 35,36) ☆ مولانا محمد علی نے لفظ 'با ضابطہ' کو 'محکمے کے قوانین کے مطابق' بتا کر بہت زیادہ زور صرف کیا تھا۔ صرف اس لفظ کی بنا پر خواجہ کو ملزم نہیں ٹھیرایا جا سکتا کیوں کہ یہ لفظ 'سنجیدہ' یا 'قابلِ لحاظ' کے معنوں میں استعمال ہوا ہے۔ (ص: 40)

اب خواجہ صاحب پر دو الزام رہ جاتے ہیں، جو قابلِ توجہ ہیں: (1) انھوں نے مولانا ظفر علی خاں ہی کے خلاف ایسی کارروائی کیوں کی؟ (2) پین اسلام ازم جو کہ حقیقتاً ایک اچھی تحریک تھی، بُرا کیوں ظاہر کیا؟
اس کا جواب یہ ہے (1) خواجہ حسن نظامی کے لیے ایک تو مولانا ظفر کی صوفیوں کے خلاف کوششیں سخت تکلیف پہنچانے والی تھیں، اس لیے بہ تقاضاے بشریت انتقام لینے، دوسرے ایک اسلامی سلطنت کو انگریزوں کی نگاہ میں مشتبہ بلکہ معتوب ومغضوب ہونے سے بچانے کے لیے انھوں نے ایک پنتھ دو کاج کے تحت یہ خط لکھا تھا۔

(ص:40) جب کہ خواجہ صاحب کے اس خط یا چیف کمشنر دہلی کے نام 'باضابطہ' یا بے ضابطہ رپورٹ کو مہذب ڈا کو سے حاصل کر کے مولانا محمد علی نے دو مقصد حاصل کرنا چاہے تھے: ایک یہ کہ خواجہ حسن نظامی کا قوم میں بڑھتا ہوا وقار و اقتدار گھٹ جائے، دوسرا یہ کہ 'ہمدرد' کی گھٹتی ہوئی اشاعت پھر چمک اٹھے۔ (2) اس الزام پر کہ خواجہ نے پین اسلام ازم کو برا کیوں کہا؟ مضمون نگار نے یہ تاویل پیش کی ہے کہ خواجہ حسن نظامی پین اسلام ازم کو برا نہیں سمجھتے لیکن چوں کہ انگریز اسے خطرناک سمجھتے ہیں، اس لیے انھوں نے انگریزوں کے اس خوف سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی اور چیف کمشنر دہلی کو رپورٹ کر دی کہ ظفر علی خاں ایک خطرناک آدمی ہے جو نظام کو اپنی راہ پر لگانے کی کوشش کر رہا ہے۔ (ص:43)، چوں کہ خواجہ کو یہ اندیشہ پیدا ہوا کہ اگر نظام پر ظفر علی خاں کا جادو چل گیا اور وہ پان اسلام ازم کی تحریک سے دل چسپی لینے لگے تو یہ تحریک کیسی ہی عمدہ اور بے ضرر کیوں نہ ہو، انگریز ضرور ایک اسلامی ریاست کے دشمن بن جائیں گے۔ انھوں نے اپنی فراست سے نہ صرف نظام کو آیندہ انگریزوں کا معتوب ہونے سے بچا لیا، بلکہ اس طرح ظفر علی خاں کو بھی تھوڑا سا مالی نقصان پہنچا دیا گیا جو کہ خواجہ کی دلی تمنا تھی۔ (ص:43) مضمون نگار نے سوال اٹھایا ہے کہ مہذب ڈاکو نے اس خط کو آٹھ برس تک سینے سے لگا کر کیوں رکھا؟ شاید اسے اس سے کوئی مالی فائدہ اٹھانے کا موقع نہیں ملا تو جل کر خواجہ کو بدنام کرنے کے لیے استعمال کیا۔ (ص:44,45)

اس قضیے کے دوران اس دور کی اردو صحافت دو دھڑوں میں تقسیم ہو گئی تھی۔ ظفر علی خاں کا کثیر الاشاعت اخبار 'زمیندار' جو پہلے ہی 'ہمدرد' کا حریف تھا، اب خواجہ حسن نظامی کی حمایت میں پیش پیش تھا۔ خواجہ کے حامی اخباروں میں ملا واحدی کا 'نظام المشائخ' اور 'درویش' (دہلی) نیز 'اہلِ حدیث' (امرت سر)، روزنامہ 'حقیقت' (لکھنؤ)، اخبار 'مشرق' (گورکھ پور)، 'وکیل' (امرت سر)، ماہ وار 'پیشوا' (دہلی)، رسالہ 'الامان' (دہلی)، رسالہ 'اردوے معلیٰ' (دہلی)، رسالہ 'مولوی' (دہلی)، 'ظریف پنچ' (دہلی)، گجراتی زبان کا 'نظامی' (احمد آباد)، 'دین و دنیا' (دہلی)، 'ماہر' (دہلی)، اخبار 'لاحول'، اور اخبار 'مسلمان' (لاہور) تھے۔ اخبار 'دین' (احمد آباد) نے اطلاع دی تھی کہ وہ دو ہفتے کے لیے اس قضیے کے لیے وقف کر دیا گیا ہے۔ (ص:270) ملحوظ رہے کہ
ان میں سے کئی اخبارات کو کبھی خواجہ ہی نے جاری کیا تھا، جن کی کمان ان کے مریدوں اور معتقدوں نے سنبھال رکھی تھی۔ مولانا محمد علی کی حمایت میں 'الامان'،
'الجمعیۃ' (دہلی)، 'مدینہ' (بجنور)، 'خلافت' (بمبئی)، اخبار 'الفضل' (قادیان) مورچا سنبھالے ہوئے

تھے۔اخبار ’ریاست‘ (دہلی) اور ’گروگھنٹال‘ جو خواجہ کے تبلیغی مشن کے مخالف تھے، اس قضیے میں بین بین رویہ اختیار کیے ہوئے تھے۔ (ص:47)

خواجہ نے دعوا کیا تھا کہ ’ہمدرد‘ صرف تیرہ سو چھپتا ہے جب کہ ’غریبوں کا اخبار‘ صرف دس گیارہ دن کی عمر میں پانچ ہزار کی تعداد میں چھپ رہا ہے۔ (ص: 621)۔ انھوں نے محمد علی پر طعنہ کسا تھا کہ ’جو شخص ایک سیکنڈ کی بات کو ٹیلی فون میں ادا کرتے وقت آدھ گھنٹا برباد کرے اور جو ایک فقرہ لکھنے کے موقع پر ایک صفحہ کالا کرے وہ اہلِ ادب اور اہلِ انشا کی بارگاہ میں جاہلِ مطلق سمجھا جاتا ہے۔‘ (ص:616، 617)، محمد علی نے مذاق اڑایا تھا کہ خواجہ کی

انگریزی ’فرام قبلہ ٹو شملہ‘ سے شروع ہو کر ’کم ٹو موت‘ پر جا کر ختم ہو جاتی ہے۔‘ (یہ دو عنوان خواجہ کی تحریروں کے ہیں۔ اک) کتاب میں شوکت علی فہمی کی ایک

تحریر سے ناراضی آشکارا تھی کہ مسٹر محمد علی کے اخبار ’ہمدرد‘ کے ایک بیان کے مطابق انھوں نے اخبار ’سیاست‘ اور ’زمیندار‘ کے خلاف گورنمنٹ کو کوئی اطلاع دی اور اشتہارات بند کرا دیے۔ ’اسی سلسلے میں معلوم ہوا ہے کہ اخبار ’سیاست‘ کے اڈیٹر کو سزا بھی ہو گئی، تو کیا مسٹر محمد علی نے اسلامی اخبارات کے خلاف جاسوسی کر کے اور ایک اخبار کو سزا دلوا کر کسی ثواب کا کام کیا ہے؟‘

ضیاالدین احمد برنی نے ’حیاتِ مولانا محمد علی‘ میں لکھا ہے کہ ’محمد علی ہر جمعہ کو جامع مسجد میں خطاب کیا کرتے تھے۔ اس زمانے میں ان کا خاص موضوع ’خواجہ حسن نظامی کی جاسوسی‘ ہوا کرتا تھا اور اس بحث نے ساری دلی کو اپنی لپیٹ میں لے لیا تھا۔ اگرچہ اس الزام کی کوئی خاص بنیاد نہیں تھی، لیکن ان دنوں خواجہ کو نظام کی جانب سے جو دو سو روپے ماہانہ کا وظیفہ ملا کرتا تھا وہ انھوں نے بند کر دیا تھا۔ (ص: 229)

مولانا محمد علی نے طعنہ دیا تھا کہ ایک وقت تھا جب خواجہ حسن نظامی اور مہذب ڈاکو نے مل کر ظفر علی خاں کی سیاسی قلابازیوں کو ’پولیٹکل گرگٹ‘ کے نام سے ایک رسالے میں بے نقاب کیا تھا، آج وہی خواجہ، ظفر علی خاں کی گود میں جا بیٹھے ہیں۔ ایک جگہ ذکر آیا ہے کہ ’خواجہ نے محمد علی کے ’گالی اخبار‘ اور بے ہودہ ٹریکٹوں کے سلسلے کی شکایت کی ہے۔‘ ممکن ہے یہ کوئی اخبار نکلا ہو یا پھر ’ہمدرد‘ کو نیا نام دیا گیا ہو۔ خواجہ حسن نظامی نے جامع مسجد کے اطراف کی دیواروں پر محمد علی کے خلاف کئی بار پوسٹر لگوائے تھے۔ انھوں نے خواجہ کی پوسٹر بازی کی عادت کو دیکھ کر ان کا نام ہی ’قدِ آدم پوسٹر‘ رکھ دیا تھا۔ اسی طرح خواجہ حسن نظامی کے پیرو اور ہم نوا عزیز حسن بقائی مدیرِ ’پیشوا‘ کا نام ’بیسوا‘ رکھ

چھوڑا تھا۔(ص:496)،کبھی انھوں نے خواجہ کو'تبلیغ کا راجا' کہا تھا،اب 'جھوٹی تبلیغ کا راجا' کہہ رہے تھے اور'غریبوں کا اخبار' ان کے قلم پر'فریبیوں کا اخبار' ہو گیا تھا۔'اس قلمی جنگ کے دوران دونوں مہارتھی اکثرا پنا آپا کھوتے نظر آتے ہیں اور ان کے نازیبا بیانوں کو لے کر شدھی کے آرگن 'تیج'، 'ارجن' اور 'بندے ماترم' بغلیں بجا رہے تھے،(ص:268)اور ان کا کچا چٹھا نقل کر کے ہم وطنوں میں ان کی مزید رسوائی کا سامان کر رہے تھے۔مسلمانوں میں مولانا محمد علی اور خواجہ حسن نظامی دونوں ہی ہر دل عزیز تھے۔ان کے پرستار فکری سطح پر بٹے ہوئے ہوں تب بھی ان کے لیے یہ سب تماشا بڑا تشویش ناک تھا اور وہ مخمصے میں گرفتار تھے۔بقول سائل دہلوی

گماں کس پر کریں مے کش، اِدھر صوفی اُدھر واعظ

خدا رکھے، محلے میں سبھی اللہ والے ہیں

خواجہ اس بات پر نازاں تھے کہ انھوں نے محمد علی کے حریف مولانا ظفر علی خاں سے دوستی کر لی تھی۔(ص:7)،بقول ان کے 'مولانا محمد علی نے سمجھا ہوگا کہ 'زمیندار' اور ظفر علی خاں اور مہؔر اور سالکؔ ان کی ایک ایک جھڑپ کے ہیں......مگر بدقسمتی سے یہ سب کے سب گرگِ باراں دیدہ ثابت ہوئے۔...... ہر شخص نے جو'زمیندار' اور'ہمدرد' کا مطالعہ کیا کرتا ہے، دیکھا ہوگا کہ آج تک مولانا محمد علی سے مولانا ظفر علی خاں اینڈ کمپنی کی کسی تحریر کا معقول جواب نہیں بن پڑا'(ص:46)مولانا غلام رسول مہر اپنی تحریروں کے آخر میں'احقر مہر' لکھا کرتے تھے مولانا محمد علی نے طنز کیا تھا کہ'......تم اپنے کو بے کسانِ شہر اور نا کسانِ

دہر میں شمار کرتے ہو۔میں جب پہلی بار تم سے ملا تھا تو میرا بھی یہی خیال تھا کہ تم ایک منکسر مزاج مگر قابل صحیفہ نگار ہو،مگر'زمیندار' کی کان میں جا کر تم بھی

نمک ہو گئے۔'

خواجہ نے مولانا محمد علی پر ایک الزام یہ بھی لگایا تھا کہ وہ ہم عصر رہ نماؤں میں کسی کی ہر دل عزیزی گوارا نہیں کر سکتے۔مولانا آزاد اور ظفر علی خاں کی مقبولیت بھی انھیں نہیں سہاتی اور یہ کہ انھوں نے جب مولانا آزاد کی مقبولیت بڑھتی دیکھی تو انھیں نیچا دکھانے کی کوششیں شروع کر دیں،حتا کہ محمد علی کے ستم زدگان میں خود ان کے پیر و مرشد مولانا عبدالباری فرنگی محلی، حکیم اجمل خاں بھی شامل ہیں، یہی نہیں جب ڈاکٹر مختار احمد انصاری کا موتی لال نہرو کی طرف میلان بڑھا تو انھوں نے ان کی مخالفت بھی شروع کر دی تھی۔(ص:1,2)،معترضہ طور پر عرض

ہے کہ محمد علی تو حسرت، اقبال اور نہرو سے بھی تعلقات نبھا نہیں پائے تھے، وہ ساری تفصیل قارئین اکرام بہت جلد راقمِ تحریر کے ایک علیحدہ مقالے میں دیکھ سکیں گے۔

خواجہ حسن نظامی نے فرقہ پرستی کا کارڈ بھی کھیلا تھا جو کہ اردو اخبارات کے قارئین کی مرغوب ذہنی غذا ہے اور لکھا تھا کہ محمد علی اور ان کی پارٹی نے شروع سے آج تک سیاست کو مذہب پر مقدم رکھا جب کہ انھوں نے اول دن سے آج تک مذہب کو سیاست پر۔ اس سلسلے میں انھوں نے یہ تفصیلات فراہم کی تھیں کہ محمد علی نے تلک کی ارتھی کو کندھا دیا تھا اور 'رام نام ست ہے' کہا تھا۔ انھوں نے اپنے ماتھے پر ہندوؤں کے مذہبی تلک اور قشقے لگوائے تھے۔ سوامی شردھانند جیسے اسلام مخالف کو محض سیاسی اغراض کے لیے جامع مسجد دہلی کے مکبر پر چڑھا دیا تھا۔ چوں کہ محمد علی کو دلی میں اپنی لیڈری کو چمکانا تھا، اس لیے انھوں نے مولانا سید احمد صاحب امام جامع مسجد دہلی کے خلاف اپنی ساری طاقت جھونک دی تھی، نیز ڈاکٹر مونجے کی سنگھٹن تحریک اور آریا سماجی لیڈر سوامی شردھانند کی شدھی تحریک کے جواب میں ڈاکٹر سیف الدین کچلو وغیرہ نے جب تبلیغ کا مشن شروع کیا تو مولانا نے ڈاکٹر کچلو کی مخالفت کر کے مسلمانوں کے غیظ و غضب کو دعوت دی تھی وغیرہ۔

ان الزامات کی حقیقت یہ ہے کہ محمد علی نے تحریک سیاسی سے جڑنے کے بعد ہنود کی خوش نودی حاصل کرنے کے لیے ان سے کچھ قربت بڑھالی تھی بس، جسے خواجہ نے بڑھا چڑھا کر بیان کیا ہے۔ محمد علی نے 'ہمدرد' (یکم دسمبر 1926) میں اپنے جواب میں تحریر کیا تھا کہ 'یہ جھوٹ ہے کہ انھوں نے کبھی قشقہ لگایا بلکہ انھوں نے اپنی اور مولانا عبدالباری کی پیشانی سے چندن کا وہ ٹیکا دور کر دیا تھا جو علی گڑھ میں جلوس نکالتے وقت چند ہندو بھائیوں نے لگا دیا تھا۔' ('مقالاتِ محمد علی'، حصہ دوم، ص: 88)، بہ حوالہ ضیا الدین احمد برنی عرض ہے کہ امام جامع مسجد سے مطالبہ کیا گیا تھا کہ جامع مسجد کے صحن میں نمازیوں کو تمازتِ آفتاب سے بچانے کے لیے شامیانے لگوائیں، اس نے نہ صرف انکار کر دیا تھا بلکہ اپنے سکون میں خلل ڈالنے والے 'باہری' اور 'رام پوریے' (محمد علی) کو دلی بدر کرانے پر کمر بستہ ہو گیا تھا۔ مولانا محمد علی نے اس عوامی مطالبے کو عوامی تحریک کی صورت دے دی تھی اور بالآخر امام کو سپر انداز ہونا پڑا تھا۔ (ص: 51)، مولانا محمد علی شدھی اور تبلیغ، دونوں ہی گروہوں کی کوششوں کے مخالف تھے اور تحریکِ خلافت کے دور میں ہندو مسلم اتحاد کے زبردست موید رہے تھے۔

دہلی میں کچھ مسلمان قربانی کی گایوں کو سجا سنوار کر رودایتاً دھیرج کی پہاڑی کے راستے لے جایا کرتے تھے۔ ہندوؤں کو اس پر اعتراض تھا۔ مولانا محمد علی نے مسلمانوں سے اپیل کر کے قربانی کی گایوں کا وہاں سے لے

جایا جانا بند کروایا تھا اور خواجہ حسن نظامی سے بھی بہ منّت درخواست کر کے اس اپیل پر دستخط کروائے تھے تا کہ مسلمانوں کو احساس ہو کہ برادرانِ وطن کی خیر خواہی میں یہ ان کے رہ نماؤں کا مشترکہ فیصلہ ہے۔ لیکن ہم دیکھتے ہیں کہ اس قلمی جنگ کے دوران خواجہ نے مولانا کے اس نیک مقصد پر بھی لوگوں کی اس روایت کو نقل کر کے (دروغ بر گردنِ راوی) پانی پھیر دیا تھا کہ مولانا نے اس مقصد کے لیے ہندوؤں سے تین لاکھ روپیے لیے تھے۔ طرہ یہ کہ اس میں سے ایک لاکھ روپیے ان (خواجہ) کے لیے تھے، جو انھیں نہیں ملے۔ (ص:699)

بد بختانہ بیان : مولانا محمد علی کے اکثر ہم عصروں (مثلاً: قاضی عدیل عباسی، سید محمد ہادی وغیرہ) نے ان کی بسیار گوئی اور غیر ذمے دارانہ بیانات کا ذکر

کیا ہے۔ ان کے چند بیانات تو اُن کے لیے انتہائی رسوا کن ثابت ہوئے تھے۔ ایسے ہی ایک بیان کا، گو کہ وہ دو برس پرانا ہو چکا تھا، خواجہ نظامی نے خوب فائدہ اٹھایا۔ ان کی کتاب میں مذکور ہے کہ مولانا محمد علی نے دہلی کے سنگم تھیٹر کے اندر منعقد ملاپ کانفرس میں مالوی جی، لاجپت رائے، اور نہرو جی اور سب ہندو لیڈروں کے سامنے محض ان کی خوش نودی کے لیے مسلمانوں کے دل وجگر پر چھریاں چلانے والے یہ الفاظ کہے تھے: ''اگر ہندو کعبے کی بے حرمتی کریں اور ہندو قرآن شریف کے ٹھوکر ماریں اور اگر ہندو محمد علی کی اہلیہ کی بے حرمتی کریں تب بھی محمد علی ہندوؤں پر ہاتھ نہ اٹھائے گا۔'' یہ الفاظ ہر مسلمان کے دل پر تیر ہو کر لگے، انھیں سخت صدمہ پہنچا۔ خواجہ نے پنڈت موتی لال اور مسز سروجنی نائیڈو کی موجودگی میں ان کے قریب جا کر کہا کہ ان الفاظ کی تلافی کریں۔ مسز سروجنی نائیڈو نے بھی انھیں سمجھایا کہ خواجہ تمھارے بھلے کی کہتے ہیں لیکن محمد علی نے کرخت لہجے میں جواب دیا کہ 'میں تو یہی کہوں گا اور اسی طرح کہوں گا۔' (ص:6)

خواجہ کے اس بیان کی تصدیق قاضی عدیل عباسی کی تصنیف 'تحریکِ خلافت' سے بھی ہوتی ہے۔ وہ رقم طراز ہیں کہ 1924 کے اخیر میں (نصف دوم میں۔ اک) جب ملک کے مختلف شہروں میں ہندو مسلم فسادات ہو رہے تھے ،اس کے سدباب کے لیے گاندھی جی نے 21 دنوں کے برت کا اعلان کیا تھا (یہ برت 17 ستمبر سے شروع ہوا اور 8 اکتوبر کو ختم ہوا تھا۔ اک)، اس اعلان اور بھائی چارے کے پیغام کو عوام تک پہنچانے کے لیے موتی لعل نہرو کی صدارت میں 26 ستمبر 1924 کو ایک 'ملاپ کانفرنس' کا انعقاد کیا گیا تھا۔ جس میں سرکردہ ہندو مسلم لیڈر اور تین سو حاضرین اکٹھا ہوئے تھے اور یہ طے ہوا تھا کہ ان فسادات کی جڑ یعنی ہندوؤں مسلمانوں کا ایک دوسرے کی عبادت گاہوں کو توڑنا، مسجد کے آگے باجا بجایا جانا، اور گائے کی قربانی جیسے معاملوں کا حل باہمی افہام

وتفہیم سے نکالا جائے۔ بقول قاضی عدیل عباسی، حکیم اجمل خاں نے یہ طے کیا تھا کہ پہلے سب ہندو لیڈروں کی باتیں سن لی جائیں گی اور پھر بجائے اس کے کہ مسلم لیڈر متضاد باتیں کریں، مفتی کفایت اللہ (سب کی نمائندگی کرتے ہوئے) انھیں مناسب جواب دیں گے۔ لیکن محمد علی نے شاید اپنی ہندو دوستی کے جذبۂ اظہار کے جوش میں بہک کر وہ کچھ کہہ ڈالا جو کسی بھی صورت میں روا نہیں کہا جاسکتا اور اس بیان سے مسلمانوں میں بڑا خلجان پیدا ہوا۔ ان کی تقریر کے بعد حکیم اجمل خاں نے انھیں ٹوکا تھا تو وہ ان سے بھی بدتمیزی سے پیش آئے تھے۔ (خلاصہ ص: 251)۔ خواجہ حسن نظامی نے ان کے متنازعہ فقروں کو اپنی کتاب میں بار بار دہرایا ہے اور علما سے فتوا طلب کیا ہے کہ کیوں نہ اس بنا پر محمد علی کو دائرۂ اسلام سے خارج قرار دے دیا جائے؟ اخبار 'منادی' میں جب یکم دسمبر 1926 کے پرچے میں 'قرآن پیارا ہے یا رام پوری محمد علی' کی سرخی کے تحت محمد علی کا ''اگر کوئی ہندو...... کعبہ و قرآن اور میری بیوی ......' والا بیان چھپا تھا تو اس بیان کی مذمت میں سیکڑوں مراسلے برصغیر بھر سے اور بیرونِ ملک مثلاً برما، رنگون اور افریکا کے شہروں سے آئے تھے۔ ان مراسلہ نگاروں کے نام، مسکن و مقام کی فہرست کے ساتھ پچیسوں مذمتی مضامین، مراسلات اور معاصر اخبارات کے اداریوں کا ذخیرہ 'نمونہ جنگِ صفین' کے کئی سو صفحات پر پھیلا ہوا ہے۔ خواجہ نے اطلاع دی تھی کہ اس کتاب میں صرف مطبوعہ مواد شامل کیا گیا ہے اور اِن مراسلات اور مضامین کی اصل، جو بھی چاہے دفتر حلقۂ مشائخ میں آکر دیکھ سکتا ہے۔ غیر مطبوعہ مواد اور 31 دسمبر کے بعد آئے ہوئے مراسلات و مضامین اس کے علاوہ ہیں۔ (ص: 334)

مولانا محمد علی کے سوانح نگاروں نے ان کے دورِ آخر کے اسبابِ زوال یوں گنائے ہیں: تحریکِ خلافت کی ناکامی، ان کی دختر آمنہ کی جواں مرگی، جسمانی عوارض، خلافت فنڈ کا غبن (جس کی تفصیل آگے آئے گی) ، اور 1926 میں خواجہ حسن نظامی سے قلمی جنگ۔ خواجہ نے ان کے بدبختانہ بیان اور غبن کے معاملے کو اچھال کر ان کی رسوائی میں کوئی کسر نہیں چھوڑی تھی۔ شومیِ قسمت سے محمد علی نے اپنا بیان دہرایا بھی تھا اور انھوں نے خواجہ کے حملوں کے جواب میں 17 دسمبر 1926 کے 'ہمدرد' میں اپنے بیان کی جو تاویل پیش کی تھی ، اُسے عذرِ گناہ بدتر از گناہ ہی کہا جاسکتا ہے۔

'آخر مسٹر محمد علی نے قبول کرلیا کہ انھوں نے کعبہ و قرآن کی بے حرمتی

کیوں کی تھی (نظامی)

حقیقت یہ کہ میں نے 1923 اور 1924 کے اواخر تک اس بات کی کوشش کی کہ ہنود

مالوی جی، لالہ لاجپت رائے اور سوامی شردھانند
کے پھندے سے نکل کر پھر مہاتما گاندھی کے متبع ہو جائیں۔ اور اسی لیے بجائے ان سنگھٹن اور شدھی کے دلدادوں کی برائی کرنے کے جسکے باعث وہ متعصب ہنود کو اور بھی مجھ سے بدظن کرتے، میں نے مہاتما گاندھی کی تعریف کرنے ہی کو اپنا شعار بنالیا۔ جسکے وہ اسی طرح مستحق تھے جس طرح کہ مالوی جی اور سوامی جی مذمت کے مستحق تھے۔ اور یہ امید کی کہ اس طرح ہنود مجھ سے خواہ مخواہ بدظن بھی نہ ہوں گے بلکہ مجھے ایک اچھے ہندو کا ثنا خواں پا کر میری بے تعصبی سے متاثر ہوں گے۔'' ('ہمدرد' 17 دسمبر 1926/ 'نمونہ جنگِ صفین'، ص: 654)

خواجہ نظامی بار بار چیلنج کر رہے تھے کہ 'محمد علی ایک بات صاف صاف کہیں کہ انھوں نے جلیان والا باغ امرت سر اور ملاپ کانفرنس دہلی میں وہ قابلِ مذمت الفاظ کہے تھے یا نہیں؟ بجائے اس کے وہ اپنے اصل فقروں کو چھپا کر نونو کالم کی فریب کاریاں کیوں کر رہے ہیں؟' (ص: 654,655)

خواجہ نے 'حق کے حامی' کی سرخی کے تحت اپنے ہم نواؤں کی ایک فہرست پیش کی تھی جن میں سے چند نام یہ ہیں: ملا واحدی، مولانا زاہد القادری، بھیا احسان فقیر عشقی، بقائی، پروفیسر اکبر خاں حیدری، مفتی شوکت علی فہمی، عندلیب شادانی اور ماہر اکبر آبادی وغیرہ۔ بانکی پور پٹنہ سے سرعلی امام کی خوش دامن صاحبہ کا خط چھپا تھا کہ انھوں نے 'مدینہ' اخبار کا بائیکاٹ کر دیا ہے' کیوں کہ وہ محمد علی کا ہم درد ہے۔' (ص: 559)۔ اسی طرح مولانا محمد علی کے ساتھیوں کو 'یزیدی

لیڈر کا کوفی لشکر' قرار دے کر ان کے نام بھی کتاب میں درج کیے گئے تھے، جن میں سے چند یہ ہیں: (نو عمر) ابوالاعلیٰ مودودی، مولانا محمد عرفان، ظفر تاباں، میرزا حیرت، مولانا مظہر الدین وغیرہ

چہ می گوئیاں: کتاب میں آیا ہے کہ اس علانِ جنگ پر عوام میں طرح طرح کی باتیں پھیلائی جا رہی تھیں۔ کسی کا کہنا تھا کہ محمد علی کو آریا سماج نے نظامی کے تبلیغی مشن کو برباد کرنے کے لیے رقم دی ہے۔ کسی کا کہنا تھا کہ حضرت نظام سے کچھ روپیا حاصل کرنے کی توقع پر نظامی کے خلاف اعلانِ جنگ کیا گیا ہے۔ (ص: 5)، کوئی کہتا تھا کہ چوں کہ خواجہ حسن نظامی نے پٹیالا میں نماز اور اذان کی بندشوں کی خبر سن کر مہاراجا پٹیالا کو الٹی میٹم دے دیا تھا، اس لیے مہاراجا نے محمد علی کو خواجہ کے خلاف کھڑا کیا ہے وغیرہ

مولانا محمد علی نے خواجہ کو حکام اور نوابوں کا در یوزہ گر بتایا تھا اور حکومت کا دلال لکھ دیا تھا۔ان پر ایک الزام نظام حیدر آباد سے بیس ہزار روپیے حاصل کرنے کا بھی لگایا تھا۔خواجہ نے صفائی دی تھی کہ اخباروں میں ان پر لگائے گئے نظام کے ذریعے بیس ہزار روپیے لینے کے الزام کی تردید خود نظام نے اپنے دربار میں کر دی تھی۔(ص:25) خواجہ نے لکھا تھا کہ اگر چہ ’مولانا محمد علی حکام سے دور رہنے کا دعوا کرتے ہیں مگر یہ گلگلوں سے پرہیز کر کے گڑ نوش جان فرمانے کا معاملہ ہے۔مہاراجا محمود آباد کی امداد سے مدتوں مولانا کا کشکولِ گدائی بھرتا رہا ہے۔ہز ہائی نس سر آغا خان خالص حکومت کے آدمی ہیں،جن کی

جیب خاص سے ان کو کتنی مدت تک گزر اوقات کے لیے امداد ملتی رہی۔‘(ص:17) ’حکومت کی دلالی‘ کے الزام پر خواجہ نے لکھا ہے کہ جب کنگ جارج کے

دربار میں مہاراجا بڑودہ کی ایک بے ادبی کی حرکت کی تلافی اور انھیں کسی ممکنہ آفت سے بچانے کے لیے محمد علی نے پانچ ہزار کے معاوضے کے وعدے پر جو’دھواں دھار کوشش کی تھی‘ کیا وہ مہاراجا کی دلالی نہیں تھی؟(ص:24) جب مہاراجا نابھ سے کچھ حصول کی امید میں اُن کا کوئی کام نکلوانے کے لیے محمد علی وائسرائے کے سکریٹریوں کے پاس،ترکِ موالات کے عہد کا خیال کیے بغیر دوڑے دوڑے گئے تھے تو کیا وہ حکومت کی دلالی نہیں تھی؟نیز انھوں نے راجا محمود آباد کو مولانا کا ان داتا،نمک داتا اور زر داتا بھی قرار دیا تھا کہ تبھی تو مولانا راجا کی خوشامد کیا کرتے تھے۔(620)

مذکورہ بالا الزامات میں مہاراجا بڑودہ کے واقعے کی تفصیل ضیاالدین احمد برنی کے یہاں یوں ملتی ہے کہ مہاراجا اعصابی مریض تھے۔دہلی میں 1911

میں منعقد ہوئے شاہی دلی دربار میں وہ ملک معظم کی توہین کے مرتکب ہوئے تھے جب وہ بادشاہ کو پیٹھ دکھاتے ہوئے اور چھڑی ہلاتے ہوئے لوٹ گئے تھے۔واپسی میں وہ بوکھلاہٹ میں راستہ بھول گئے تھے اور انھیں اے ،ڈی،سی کی رہ نمائی حاصل کرنا پڑی تھی۔مولانا محمد علی مہاراجا کے نمک خوار رہ چکے

تھے،انھوں نے انگریزی اخبارات میں ہو رہی مہاراجا کی کردار کشی کا جواب لکھ کر اور انھیں معذور بتا کر حکام سے سفارش کی تھی اور ان کی گلو خلاصی کرائی تھی۔(ضیا،ص:84)،اسی طرح مہاراجا نابھ کا کام نکلوانے کی بھی انھوں نے کوئی تاویل اپنے ایک مضمون میں پیش کی ہے۔یعنی یہ الزامات یک سر بے بنیاد بھی نہیں تھے۔

خواجہ حسن نظامی نے حلف اٹھایا تھا کہ انھوں نے 12 اگست 1918 کو جو خط لکھا تھا اس کا مقصد نظام کو نقصان

پہنچانے کانہیں تھا۔انھوں چیف کمشنر
دہلی سے مخبری کی تھی نہ ہی آج تک محکمہ ٔجاسوسی کا کوئی کام کیا تھایا تعلق رکھا تھا۔انھوں نے تمام عمر کسی بھی اسلامی تحریک کوکسی طرح کا نقصان پہنچانے کا کوئی
کام اعلانیہ یا خفیہ نہیں کیا تھا۔اگر انھوں نے اپنے حلف میں کسی قسم کی چالاکی، جھوٹ یا حیلہ جوئی کی نیت رکھی ہوتو اس دنیااور آخرت میں اللہ کی لعنت ان پر نازل ہو۔(ص:48)خواجہ مصر تھے کہ مولانا محمد علی بھی حلف لیں کہ حسن نظامی کا وہ خط نظام کے خلاف جاسوسی کا تھا۔انھیں نقصان پہنچانے کے لیے تھااور وہی ان کی موجودہ مشکلات کا باعث ہے۔انھیں اور ان کے حمایتیوں کوخواجہ حسن نظامی کا محکمہ ٔجاسوسی کا مخبر ہونے کا یقین ہےاور ان کے دلوں میں ان کی تبلیغی خدمات اور اس کے رسوخ کے بارے میں کوئی انتقامی جذبہ نہیں ہے اور ان کاالزام آریا سماج کی سازش یا کسی دیگر کی شہ پرنہیں عاید کیا گیا ہے۔اگر ان کے حلف نامے کے الزامات یا کوئی الزام غلط ہوتو وہ اس دنیا اور آخرت میں اللہ کی لعنت کے سزاوار ہوں گے۔(ص:49)خواجہ کی درخواست تھی کہ ہر مسلمان اس حلف نامے کو پڑھے اور مولانا محمد علی سے جواب طلب کرے۔مولانا محمد علی تک پیغام پہنچا تھا لیکن انھوں نے حلف اٹھانا ضروری نہیں سمجھا۔(ص:49)

ان دونوں سورماؤں کے موازنے میں حامیانِ مولانا ،انھیں قومی لیڈر اور خواجہ کومزار پرست اور نذر و نیاز کا کھانے والاقرار دے رہے تھےتو عقیدت مندانِ خواجہ انھیں درویش صفت،ایک لاکھ مریدوں کا پیر، گئوکشی کا حامی اور تبلیغ کا چیمپئن قرار دے رہے تھے اور محمد علی کوگئو رکشا کا موید اور تبلیغ مخالف بتا کر مطعون کر رہے تھے۔(ص:322)

چند معروضات :'جنگِ صفین' میں شامل شیخ احسان الحق نے لکھا تھا:'اپنے الزامات کی شہادت میں مولانا محمد علی ایک آٹھ برس پرانا خط پیش کرتے ہیں جوکہ ہاپوڑ کے ضیا الحق کولکھا گیا تھااور ضیاالحق ہی کے نام لکھے گئے ایک اور خط کوتائیدِ مزید قرار دیتے ہیں۔دونوں خط اخبارات میں چھپ چکے ہیں۔محمد علی کوخواجہ کی جاسوسی کا اس قدر یقین ہے کہ وہ ان کی قسم کا بھی اعتبار نہیں کرتے۔'(ص:54)۔آغا محمد طاہر نبیرہ ٔ آزاد نے 'ہمدرد' کے ایک آرٹیکل کو گستاخانہ پا کر جواب لکھا تھا۔(ص:63)۔ملا واحدی دونوں کو چاہتے تھے لیکن خواجہ کے حق میں تھے، لکھتے ہیں:''مولانا محمد علی کو میں نے خوب پڑھ لیا ہے۔وہ بنی ہوئی عمارت کوڈھا سکتے ہیں لیکن عمارت کو بنا ہرگز نہیں سکتے۔ ان سے اپنے مختصر سے دفتر کا انتظام نہیں سمبھلتا،قوم کی تنظیم کیا کریں گے۔''(ص:57)۔مولانا شاہ سلیمان

پھلواری کے فرزند مولانا غلام حسنین ندوی نے لکھا تھا کہ 'جب تک ہندستان میں سادات موجود ہیں، کلالوں کا راج نہیں ہوسکتا۔ (ص: 58, 59) خود خواجہ حسن نظامی نے بھی کلال سے نسبت جوڑ کر محمد علی کو ہدف بنایا تھا۔ محمد عبدالمالک جامعی کے حوالے سے عرض ہے کہ دراصل مولانا محمد علی کے اجداد کا تعلق راجپوت فرقے کی ایک شاخ کلال سے تھا، جو کسی زمانے میں مشرف بہ اسلام ہوگئی تھی اور وہ لوگ اپنی محنت اور لگن سے معمولی درجے کی نوکریوں سے اعلا مناصب تک پہنچے تھے۔ ان کے حریف خواجہ حسن نظامی اور اُن کے حمایتی انھیں کلال بمعنی شراب فروش سے نسبت دے کر اپنی پست ذہنیت کا مظاہرہ کر رہے تھے۔ محمد علی نے اپنی کنیت پر حملہ ہوتے ہوئے دیکھ کر 30 نومبر 1926 کے 'ہمدرد' میں ایک سخت آرٹیکل لکھا تھا اور جوشِ غضب میں ان کا قلم یہاں بھی بہک گیا تھا۔ انھیں اپنی تحریروں اور تقریروں میں اسلامی روایات اور تلمیحات کے استعمال کی عادت تھی۔ اپنے اس آرٹیکل میں بھی وہ چند مقدس ناموں کا تذکرہ کرتے ہوئے ایک گھٹیا لطیفہ لکھ بیٹھے تھے، جس کو یہاں نقل کرنا بھی مشکل ہے ۔اس سے خواجہ کو مزید موقع فراہم ہوگیا۔ انھوں نے جامع مسجد کے علاقے کی دیواروں پر پوسٹر چسپاں کروادیے:
'بنتِ رسول اللہ اور سیدہ فاطمہ زہرا کی چشمِ مبارک کے آنسو'، 'کیا دنیا میں کوئی غیرت والا فاطمی سید زندہ ہے؟' (تاریخ 17 دسمبر 1926) وغیرہ
اور 'مسلمانوں میں خانہ جنگی کا مجرم کون ہے؟' (ص:613)، اور 'منادی' میں '<u>ہم کعبہ شریف وقرآن شریف کے ساتھ ہیں نہ کہ رام پوری محمد علی کے</u>

<u>ساتھ</u>'، جیسی سرخیوں کے تحت خواجہ کے سیکڑوں تائید کنندگان کے ناموں کی فہارس پیش کی جارہی تھیں۔

ڈاکٹر عبداللطیف اعظمی کی مرتبہ کتاب میں شامل خواجہ حسن نظامی کی ایک تحریر 'مولانا محمد علی: بحیثیت ایڈیٹر' سے پتا چلتا ہے کہ محمد علی کی مغلوب الغضب
فطرت کی بنا پر خواجہ جان بوجھ کر ایسے اشتعال انگیز ہتھکنڈے اپنایا کرتے تھے:

> 'مگر (محمد علی کی) اردو کی اڈیٹری میں یہ نقص ضرور تھا کہ وہ مخالف فریق کے اشتعال دلانے سے مشتعل ہوجاتے تھے۔ چنانچہ میرے ساتھی یہ سمجھ کر کہ فلاں طرزِ تحریر سے ان کو غصہ آئے گا اور وہ اصل مبحث سے ہٹ جائیں گے، یہ تحریری حربہ استعمال کرتے تھے اور کامیاب ہوتے تھے۔' (ص:106)

لغاتِ محمد علی : ایک دوسرے پر ذاتی حملوں میں یہ لڑائی اکثر انتہائی پست سطح پر بھی پہنچ جاتی تھی جسے دیکھ کر علی

برادران کے خاندانی سوانح نگار رئیس احمد جعفری تک اسے 'بھٹیارنوں کی لڑائی' سے مشابہ قرار دینے پر مجبور ہو گئے تھے۔اس کی متعدد مثالیں خواجہ کی کتاب میں موجود ہیں۔ظاہر ہے کہ مولانا محمد علی نے بھی جو اپنے حریف کو معاف کرنا جانتے ہی نہ تھے،کوئی کسر نہ چھوڑی ہوگی۔خواجہ نظامی نے اپنی اسی کتاب میں 'لغاتِ محمد علی' کے عنوان سے 'ہمدرد' کے جوابات کی چنندہ سرخیوں اور کچھ فقروں کو مع تاریخ اشاعت، چودہ صفحات (667 تا 680) میں سجا رکھا ہے۔اسے دیکھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں طرف تھی آگ برابر لگی ہوئی۔یہاں محض چند مثالیں قارئین کی ضیافتِ طبع کے لیے پیش کی جا رہی ہیں:

*'خواجہ صاحب اور ان کے تنبورچی' *'حسن بن صباح ثانی نظامی' *'ایک مخبر اور غدار' *'مذہبی لٹیرا اور ریاکار'

*'وہ شیر تو نہیں مگر اسی خاندان کے ایک اور جان ور سے مشابہ گربۂ مسکین (ہے)۔

*'مہاراجا ہلکر کی مشکلات کا باعث ایک فاحشہ ہوگئی تھی، بہر حال خواجہ صاحب کی حیثیت اس سے بھی ممتاز تر ہے۔'

*'حضرت آدم نے پتوں سے اپنی شرم گاہ ڈھانکی تھی، یہ پوسٹروں سے ڈھانکے گا۔'

*'اس مصورِ فطرت کے نزدیک سیدھا الٹا، جھوٹ سچ،فطری غیر فطری،شرعی غیر شرعی سب ایک ہے۔'

محمد علی نے ایک مضمون 'چٹخارہ' کے عنوان سے 'ہمدرد' میں لکھا تھا جس میں دہلی والوں کو چٹورا کتا بتایا تھا اور خوب ہنسی اڑائی تھی۔مولانا محمد علی نے خود سے خواجہ حسن نظامی کی اس لڑائی کو ہاتھی سے چیونٹی کا مقابلہ بتایا تھا، جس پر نظامی نے لکھا تھا کہ 'مولانا خود کو ہاتھی اور نظامی کو چیونٹی سمجھتے ہیں لیکن ہاتھی اس سے غافل نہ رہے کہ چیونٹی بعض اوقات ہاتھی کی سونڈ میں گھس جاتی ہے اور ہاتھی کو سر پٹک پٹک کر مرنا پڑتا ہے۔نمرود کے ناک کا مچھر تو مولانا نے سُنا ہوگا۔' (ص:12)

تقریباً درجن بھر نظمیں ظفر علی خاں، حفیظؔ جالندھری، سید شاہ علی امیدؔ قادری، علی محمد سہیلؔ لدھیانوی، سید محمد ناصرؔ دہلوی، اصغر وارثی شاہ پوری اور سر کوبؔ

لکھنوی وغیرہ کی شاملِ کتاب ہیں۔ان میں خاص طور پر علی برادران اور ان کی چندہ خوری کو نشانہ بنایا گیا ہے۔طوالت کے خوف سے یہاں صرف ظفر علی خاں کی دو نظمیں دی جا رہی ہیں۔

دہلی کا نیا اکھاڑا

نیا حریف ملا ہے جنابِ جوہر کو　　　مقابلہ ہے اب سے حسن نظامی کا

کرشمہ سنج ادھر رام پور کی تہذیب — ادھر مظاہرہ دہلی کی خوش کلامی کا
ادھر یہ فقرہ کہ چمکا ہے آٹھ سال کا داغ — جبینِ خواجہ پہ انگریز کی غلامی کا
ادھر یہ طعنہ کہ ہے میرے پاس بھی موجود — ہر اک ثبوت تمھاری نمک حرامی کا
ادھر یہ ضد کہ اگر تم نہ مخبری کرتے — دبیل آج نہ ہوتا نظام ثامی کا
ادھر یہ کد کہ کوئی اور ہی تھا تختۂ مشق — تمام میری تدابیرِ انتقامی کا
کہوں گا میں فقط اتنا نہیں ہے گرچہ امید — کہ اعتراف کریں گے وہ اپنی خامی کا
دکن کو شکوہ ہے بڑھ کر حسن نظامی سے — جنابِ حضرتِ جوہر کی بے لگامی کا
وہ کہتی 'مارنے والوں' کا ساتھ اگر دیتے — دکن میں آج نہ ہوتا یہ زور ثامی کا
مگر انھیں تو یہ ڈر تھا کہ دوسرے سر پر — نہ جا رہے کہیں سہرا یہ نیک نامی کا
انھیں نہ یاد ہو بلگام کو ہے یاد اب تک — مفاد ان کے ہر اک خطبۂ گرامی کا
ہے تشنہ میرے قوافی میں ایک ہی مضمون — مگر وہ ذکر ہے موٹی سی اک اسامی کا

ظفر علی خاں، لاہور یکم دسمبر 1926 (ص: 341)

فتنہ کے درخت کی دو ٹہنیاں: یعنی مولانا محمد علی اور مولانا شوکت علی

دونوں نے مل کے ڈالی ہے اسلامیوں میں پھوٹ
ہے صلح و آشتی سے علی بھائیوں کو ضد
بنگالیوں کا تختہ الٹنے کو پیش پیش
پنجابیوں کی ناؤ ڈبونے کو مستعد
ان کے حریف گنبدِ خضرا کے پاسباں ان
کے حلیف گومتی والوں کے مجتہد
قوت تباہ نجد کی ہو، اس پہ ہیں مُصر فتنہ بپا حجاز
میں ہو اس پہ ہیں بضد
ان کا قلم لغو نگاری میں ہے بے مثال ان کی
زباں ہے بیہودہ گوئی میں منفرد

جھولے میں ہے وہ اینٹ کہ ہر سر ہو پاش پاش
ترکش میں ہے وہ تیر کہ ہر سینہ جائے چھد
منڈلا رہے ہیں آج خلافت کی لاش پر
دہلی کے اور بمبئی کے موٹے موٹے گد

ظفر علی

خاں (ص:411)

خلافت فنڈ کے گھپلے

چندہ اندوزی :اصل بحث سے ہٹ کر اکثر دونوں ہی حریف ذاتیات پر اتر آتے تھے۔انھوں نے ایک دوسرے پر بڑھ چڑھ کر عوامی چندوں کی بربادی کا الزام لگایا تھا۔ایک تبلیغی فنڈ میں خرد برد کا الزام لگا رہا تھا تو دوسرا خلافتی فنڈ کے گھپلوں کی پول کھول رہا تھا۔(ص:124)،قریب قریب ہندستان کے ہر اخبار میں مولانا اور خواجہ کی معرکہ آرائی کے متعلق کچھ نہ کچھ ضرور لکھا جا رہا تھا۔کوئی کسی طرف تھا تو کوئی کسی طرف،کوئی خالی خولی مذاق اڑا رہا تھا۔(ص:129)یعنی ع مزہ لینے والے مزہ لے رہے تھے۔

مولانا چندہ :مولانا شوکت علی کے تعلق سے لکھا گیا ہے کہ لوگ ان کی چندہ اندوزی سے عاجز ہیں۔'ہر شخص ان کو جلسے میں آتے دیکھ کر کہہ اٹھتا ہے:'وہ آئے مولانا چندہ۔'اور یہ کہ اب یہ مقابلہ خلافتی تحریک بمقابلہ تبلیغی تحریک ہو چکا ہے۔(ص:10)چندے کے موضوع پر بھی درجنوں نظمیں کہی گئی تھیں۔ یہاں شوکت علی پر کہی ہوئی حفیظ جالندھری کی ایک مشہور نظم دی جا رہی ہے،جس کا عنوان ہی'مولانا چندہ' ہے۔

جانا بھائی لانا چندہ وہ آئے مولانا چندہ
قوم نے ان کو لیڈر مانا اس کا ہے جرمانہ چندہ
آخر اک دن کر دیتا ہے لیڈر کو دیوانہ چندہ
جتنے ہیں یہ کھدر والے سب کا تانا بانا چندہ
پھر 'ہمدرد' نکل آیا ہے لے گا ایک ایک آنہ چندہ
وہ ہر روز نئی تحریکیں وہ مل مل کر کھانا چندہ
چھوٹے بھائی بڑے کو اکدن چاہتے تھے سکھلانا چندہ

بولے بھیا قوم ہے بھولی آسان ہے ہتھیانا چندہ
آنکھیں تھوک سے تر کرلیجیے ہو جو منظور رلاگانا چندہ
اور نہیں تو دیکھیے مجھ کو یوں لیتے ہیں دانا چندہ
توند بڑھائیں توند بڑھائیں چاہتے ہیں جو کھانا چندہ

دراصل اس دور میں خلافت کے جھنڈے تلے انگورہ اور سمرنا فنڈ، امدادِ ترکیہ فنڈ، یورپ روانگی کا فنڈ، مدینہ منورہ کی روشنی اور چراغ کا فنڈ وغیرہ کے نام سے چندے وصول کیے جارہے تھے اور خلافت کے مسئلے پر لوگوں کے جذبات کا استحصال کیا جارہا تھا۔اس طرح کی نظمیں عام تھیں:

ترکی کے تمسکات لے لو لے لو جنت کے قبا لجات لے لو لے لو
ترکی کی مدد ہے فرض ہر مسلم پر اس گرتے ہوئے کا ہات لے لو لے لو

(غلام امیر صاحب رئیس بدایوں)

خواجہ حسن نظامی نے شوکت علی کا نام 'چندہ ماموں' رکھ چھوڑا تھا۔اس پر محمد علی نے 'ہمدرد' میں طعنہ دیا تھا کہ 'آخر خواہر زادگی کی بُو کیسے جاتی! اسی لیے تو چندہ ابا کہتے نہ بنا اور چندہ ماموں یاد آیا۔' اشارہ اس طرف ہے کہ خواجہ سید امام نظامی کی اولاد کی شادیاں حضرت نظام الدین کی بہن کی اولاد سے ہوئی تھیں، جن کی اولاد میں خواجہ حسن نظامی تھے۔

خواجہ نے یہ الزام بھی عائد کیا تھا کہ 'خلافتی نوٹ کا سکہ چلا کے غریب مسلمانوں سے ایک کروڑ روپیا جمع کیا گیا۔' (ص:546)، ان الزامات میں سے اکثر کے ثبوت اُن کے ہم عصروں کی تحریروں میں موجود ہیں۔مولانا عبدالماجد نے شوکت علی کے بارے میں اپنی ڈائری میں لکھا ہے کہ

> 'مولانا چندہ وصول کرنے کی گویا مشین تھے اور اس فن میں لاثانی۔بڑے لوگوں کے ہاں جہاں جہاں گئے، یہ خاک سار بھی تابع مہمل کی طرح ساتھ لگا رہا۔'(ص:739)، مزید لکھتے ہیں کہ' 1925 میں' دوشنبہ فنڈ' شروع کیا۔اعلان کیا کہ اس دن مسلمان صرف چٹنی روٹی کھائیں گے اور مطبخ سے جو بچت ہوگی اسے خلافت فنڈ کی نذر کریں گے۔'(370)

یورپ کے مردِ بیمار ترکی کے لیے روپیا تو سر سید کے دور سے بھیجا جارہا تھا۔اپنی سلطنت کھو دینے اور غدر کی ستم رانیوں کو جھیلنے کے باوصف ہندستانی مسلمان اس سلسلے میں بڑے کشادہ دست ثابت ہوئے تھے۔اس باب میں شبلی

کی گرم جوشانہ فکرمندیوں کو بھلا کون بھلا سکتا ہے! سر سید، شبلی کی طرح ترکی کے مریض عشق تو نہیں تھے، پھر بھی انھوں نے اتنا ضرور چاہا تھا کہ وہ امداد ترکی قونصل خانہ (بمبئی) کے ذریعے سے بھیجی جائے تا کہ خرد برد سے بچے ،لیکن علما نے اسے (اپنی) مصلحت کے خلاف سمجھا تھا۔ بہ حوالہ سید محفوظ علی بدایونی 'محمد علی نے' کامریڈ' میں' مسلمانوں سے طبی مشن کے لیے چندے کے لیے وہ دل ہلانے والی اپیل کی، جس نے' کامریڈ' کے دفتر میں روپیوں کی بارش کردی۔' کامریڈ' کے فائل گواہ ہیں کہ ایک ایک دن میں دس دس پندرہ پندرہ ہزار روپے حاصل ہوئے ہیں اور میں گواہ ہوں کہ منی آرڈروں اور پارسلوں پر دست خط کرتے کرتے میرا ہاتھ شل ہو گیا ہے۔'

ایں خانہ ہمہ آفتاب است:

حقیقت یہ ہے کہ خلافت کی جاں کنی کا مدعا مسلمانوں کے جذبات سے بڑی شدت سے جڑا ہوا تھا، تب ہی تو ہم دیکھتے ہیں کہ علی برادران کے خاندان کی باہمت خواتین نے ان کے مقدمۂ کراچی کی سزایابی کے زمانے (23-1921) میں بھی چین سے بیٹھنا گوارا نہیں کیا تھا۔ محمد علی کے مضامین میں اگر اُن کا ذکر نہ آیا ہوتا تو ہم قطعی ناواقف رہتے کہ ان کے اہلِ خانہ شہر بہ شہر گھوم کر تحفظِ خلافت کے لیے فنڈ جمع کرنے کا مقدس فرض ادا کر رہے تھے۔ خواجہ حسن نظامی کے چندہ اندوزی کے اعتراضات پر محمد علی نے' ہمدرد' یکم دسمبر 1926 کے پرچے میں اپنے جوابی مضمون' چندہ اور بندہ' میں لکھا تھا:

☆' میری والدہ نے اور میری بیوی نے ہماری دو برس کی قید میں تقریباً چالیس پینتالیس لاکھ روپیا وصول کیا، جس کی ایک ایک پائی کا حساب دفتر خلافت میں آڈٹ کیا ہوا موجود ہے۔...... یہ سچ ہے کہ ہم نے خلافت کے خزانے میں فقط تین لاکھ چھوڑے تھے اور ہمارے پیچھے 40 یا 50 لاکھ روپیا ہماری والدہ اور میری اہلیہ اور ہم سے محبت رکھنے والے بھائی بہنوں نے جمع کیا تھا۔ لیکن اگر یہ بڑی اور محیر العقول رقم خود ہم نے جمع نہ کی تھی تو اس کی ایک پائی ہم نے خرچ بھی نہ کی تھی۔'

('مضامین محمد علی'، مرتبہ' محمد سرور، مطبوعہ 1938، ص: 84)

(خط کشیدہ سطر قابلِ غور ہے۔ راقمِ تحریر متذکرہ اقتباس کے آخری جملے کے یہی معنی سمجھ پایا ہے کہ چوں کہ اتنی بڑی رقم ہم نے جمع کی تھی، اس لیے ہم نے خرچ کر دی۔ اک)

ایک اور جگہ رقم طراز ہیں:

☆''...... یہ بھی ایک عجیب واقعہ ہے کہ مجھ جیسا سارے ہندستان میں گھومنے والا آج تک سہارن پور

نہیں گیا۔ گو مرحومہ بی اماں اور میری اہلیہ ہمارے قید کے زمانے میں اس ضلع کے گوشے گوشے میں گھوم چکی تھیں اور خلافت کے لیے بہت سا روپیا اور منوں چاندی کا زیور جمع کر چکی تھیں۔''میری اہلیہ نے سہارن پور، مظفر نگر اور بجنور کے اضلاع کے ہمت افزا دورے کیے۔'

('یو پی کی پولیٹکل کانفرنس'، 'ہمدرد' 1,2 دسمبر 1927، 'مقالات محمد علی' حصہ دوم، مرتبہ رئیس احمد جعفری، ص:148)

خلافت فنڈ کا غبن: سیٹھ جان محمد چھوٹانی کے ذریعے خلافت تحریک کے آخری دور میں خلافت فنڈ کے غبن کے معاملے نے اس تحریک کا بھٹا ہی بٹھا دیا تھا۔ اور علی برادران کا وقار ڈھے گیا تھا۔ مولانا محمد علی نے مرادآباد میں جمعیۃ العلمائے ہند کے جلسے میں غبن کے الزام پر یوں صفائی پیش کی تھی:

'لوگ کہتے ہیں کہ اب چندے وغیرہ اس لیے بند ہو رہے ہیں اور خلافت کمیٹی اس لیے کنگال ہو رہی ہے کہ روپیا غبن ہوا ہے۔ خلافت کمیٹی کا کسی نے غبن نہیں کیا۔ یہ ضرور ہے کہ ساڑھے سولہ لاکھ روپیا چھوٹانی صاحب کے پاس نقد کی صورت میں نہ مل سکا۔ لیکن انھوں نے کارخانہ اور مال اس کے عوض میں دے دیا، جس وقت وہ کارخانہ خریدا گیا تو بظاہر اس قیمت کا تھا۔ آج اگر گاہک اس کے لیے تیار نہیں ہیں اور بازار گرا ہوا ہے اور اس کی پوری قیمت نہیں مل سکتی تو ہماری بدنصیبی ہے۔'

('ہمدرد' 18,19,20 جنوری 1925/ 'مقالاتِ محمد علی'، حصہ اول، ص:260)

ایک اور جگہ دیدہ دلیری سے یوں اقرار کیا ہے: ''الزام لگانے والوں سے میں نے کہا کہ ہم چندہ اگر کھا بھی جاتے ہیں تو چکی بھی ہم ہی پیستے ہیں۔ اور خدا کا کام کرتے ہیں۔ اگر تم جیل کی چکی پیسنے کے لیے تیار ہو تو اچھا، ورنہ تمھیں ان کھانے والوں کو چندہ دینا پڑے گا۔'' (ص:181، 'مقالاتِ محمد علی'، حصہ دوم)

دراصل چھوٹانی محمد علی کے معتمد اور خلافت فنڈ کے خزانچی تھے۔ ان کا قومی فنڈ کو اپنے کاروبار میں لگانا ہی اصولی طور پر درست نہ تھا۔ انھیں نقصان ہوا تو انھوں نے اپنے دیوالیہ ہونے کا اعلان کر دیا تھا۔ محمد علی نے ان کی بریت میں جو بیان دیا وہ عذرِ گناہ بدتر از گناہ کی مثال ہے۔ سید محمد ہادی نے لکھا ہے کہ واقف کار تجار نے ان کے کارخانے (saw mill) کی مالیت زیادہ سے زیادہ ساڑھے تین لاکھ آنکی تھی۔ محمد علی نے اس رہی سہی شے کو

اپنی بدنظامی کے لیے مشہور زاہد علی (فرزند شوکت علی) اور شعیب قریشی (محمد علی کے داماد) کی نگرانی میں دے دیا:

'نتیجہ یہ ہوا کہ سال چھے ماہ میں ان دونوں بڑے خلافتیوں نے اس کارخانے کو بھی نہ معلوم کس طرح غائب کر دیا۔......اس عظیم قومی نقصان کو غریب قوم تو کبھی بھول ہی نہیں سکتی تھی۔اس پر ہر خلافتی چھوٹا اور بڑا قدرتاً بے ایمان اور خائن سمجھا جانے لگا۔......جگہ جگہ بازار بازار اور دکان دکان بس خلافت والوں کے اس غبن کا تذکرہ تھا۔یہ غبن اتنا عظیم اور نقصان رساں تھا کہ مسلمانانِ ہند کی ایک ہزار برس کی تاریخ میں اس کی مثال نہیں ملتی۔' (ص:123,122)

ہندستانی مسلمانوں میں تعلیمِ نسواں کے پیش رو ڈاکٹر شیخ عبداللہ (پاپا میاں) اپنی کتاب 'مشاہدات وتاثرات' میں رقم طراز ہیں:

☆'یہ بات خلافت کے اربابِ حل وعقد نے بھی خود تسلیم کی تھی کہ باون لاکھ روپیا ہندستان کے مسلمانوں نے ترکوں کی امداد کے لیے دیا ہے۔دوسرے لوگ تو اس چندے کا اندازہ بہت زیادہ کرتے تھے کہ کئی کروڑ جمع ہوا تھا۔لیکن ہم رقم کو تسلیم کیے لیتے ہیں جو خلافت کارکنان نے قبول کی تھی۔تحریک کا کام ابھی جاری تھا کہ لوگوں نے تقاضا کرنا شروع کر دیا کہ بتاؤ روپیا کیا ہوا؟ ترکی بھیجا گیا یا نہیں! اس پر مولانا محمد علی اپنے اخبار 'ہمدرد' میں جواب دیتے رہے کہ اٹلی کی کسی بنک کی معرفت روپیا ترکی بھیجا گیا ہے۔اس پر لوگوں نے کہا کہ مہربانی سے اٹلی کے بنک کی رسید......پیش کیجیے۔اس پر جواب دیا کہ اٹلی کے بنک نے ہمیں کوئی رسید نہیں دی کیوں کہ یہ کام انگریزوں سے خفیہ طور پر کیا گیا تھا۔اس پر بہت زیادہ تقاضا کیا گیا تو......محمد علی نے کہا کہ حساب کتاب تو خدا کے یہاں چل کر ہی دیں گے۔' (ص:291,292)

☆'رؤف پاشا جو خلافت تحریک کے زمانے میں ترکی کے وزیرِ اعظم تھے، وہ بعد میں جب پرائم منسٹری سے علیحدہ ہو گئے تو ہندستان آئے۔ہم لوگوں نے ان سے دریافت کیا کہ ہندستان سے آپ کے پاس کتنا روپیا پہنچا؟ انھوں نے سن کر کہا روپے کی آلایش سے ہمارا ہاتھ بالکل پاک ہے۔ہم سنتے رہے کہ ہندستان میں ہمارے لیے روپیا جمع ہو رہا ہے لیکن کبھی

ہندستان سے روپیا آیا نہ کسی ایسے روپے کی شکل دیکھنا ہمیں نصیب ہوا۔' (ص:293)

مولانا ملیح آبادی نے 'ذکرِ آزاد' میں لکھا ہے کہ:

'خلافت تحریک کے سلسلے میں ہندستان کے غریب مسلمانوں نے قابل فخر جذبۂ ایثار و قربانی کا مظاہرہ کیا تھا۔ بے شمار روپیا خلافت فنڈ میں دیا۔ پردہ نشیں خواتین نے زیور تک اتار کے دے دیے۔ خود لیڈروں کو اعتراف تھا کہ چھپّن لاکھ جمع ہوا۔ لیکن اس مالا مال فنڈ کا حشر کیا ہوا؟ ایک قلیل رقم تو ترکوں تک پہنچی، باقی روپے کو مُردے کا مال سمجھ لیا گیا۔ اس زمانے میں خود میں اپنی آنکھوں سے دیکھتا تھا کہ بڑے بڑے لیڈر کس بے دردی سے قومی روپیا اپنی ذات پر اڑا رہے ہیں۔' (ص:388)

مذکورہ بالا بیان کی بازگشت خواجہ حسن نظامی کی کتاب میں شامل درجنوں شکایتی مراسلوں میں سنائی دیتی ہے اور پتا چلتا ہے کہ چندہ اندوزی کے جنون میں غربا، قلی، مزدور پیشہ اور گھریلو خواتین تک پر دباؤ ڈالا گیا۔ اس سلسلے میں یہاں صرف دو مراسلوں کے اقتباس دیے جا رہے ہیں:

(1) 'میں حلفیہ کہہ سکتی ہوں کہ میرے محلے میں غریب عورتوں سے نہایت بے دردی کے ساتھ چندہ وصول کیا گیا۔ کہا گیا کہ فاقہ کر کے چندہ دیں۔ مستورات اپنے کونگی بوچی کر کے زیور اور کپڑے تک دے دیں۔ چنانچہ میں نے اور میری بہت سی بہنوں نے ایسا ہی کیا۔ محلے کی کوئی عورت ایسی نہ بچی کہ جس سے کوئی نہ کوئی زیور یا برتن علاوہ از نقد کے چندہ نہ لیا گیا ہو...... اس چندے کو تو میں نہیں کہہ سکتی کہ ہمارے لیڈروں نے کیا کیا لیکن جہاں تک سنا گیا یہی معلوم ہوا کہ ہمارے مکرم اور پیشوا لیڈر مولانا محمد علی ریل کے اول درجے میں شہر بشہر سیر کیا کرتے تھے اور پلاؤ قورمہ وغیرہ اس چندے کی بدولت اڑایا کرتے تھے اور بہت ممکن ہے کہ اسی چندے کی بدولت انھوں نے اپنے غسل خانے کا فرش بنوایا ہو جسے اب وہ خانۂ کعبہ کے فرش* سے بہتر بیان کرتے ہیں...... میری ناقص سمجھ میں ان کی ساری جدو جہد کا نتیجہ محض اپنی نفس پرستی کے لیے تھا کیوں کہ آج میں دیکھتی ہوں کہ سوا نقصان کے کوئی فائدہ ہم مسلمانوں کو نہیں پہنچا۔ میں حلف سے بیان کرتی ہوں کہ میرے پڑوس اور خاص میرے خاندان کے کئی نوجوان لڑکے گورنمنٹ کی ملازمت چھوڑ کر محض محمد علی کے چقمے (چکمے) میں

آ کر جیل کی سزا کاٹی اور ہمیشہ کے لیے تباہ و برباد ہوئے۔ان کو محض جیل کی سزا ہی نہیں ہوئی بلکہ پچاس پچاس سو سو روپے جرمانہ بھی ہوئے تھے جو کہ گورنمنٹ نے گھر کا اثاثہ جو سمرنا اور خلافت فنڈ کے بعد بچا تھا، نیلام کر کے جرمانہ وصول کیا۔جیل کاٹنے کے بعد جولڑ کے واپس آئے تو انھیں کوئی دوسری ملازمت نہ ملی۔گھر چھوڑ کر ان میں سے بعض بھاگ گئے اور آوارہ گشتی میں مبتلا ہو گئے۔'

رقیمۂ ادب: اہلیہ عبدالحمید، یحییٰ پور، الہ آباد (ص: 167-166)

* { 'اس قلمی جنگ سے کچھ قبل مولانا محمد علی حج کر آئے تھے اور نہ جانے کس دھُن میں کہیں یہ کہہ بیٹھے تھے کہ 'میرے غسل خانے کا فرش کعبے کے فرش سے صاف ستھرا ہے۔' (ص: 152)۔اوپر درج مراسلے میں اسی طرف اشارہ ہے۔اس سفرِ حج میں مولانا کا معلم ان کی میز بانی میں کس طرح لُٹااور اپنے بقایا کی وصولی کے لیے ہندستان آ کر پریشان ہوتا پھرا، وہ ایک الگ قصہ بھی اسی کتاب میں موجود ہے۔ا ک}

(2) 'علی برادران اور ان کے سرپرست (چھوٹانی!) نے بھی تو لاکھوں روپیا وصول کیا ،جس کی ایک پائی کا حساب نہ ملا۔اب تو لوگ یتیم خانے یا مسجد کے لیے بھی یعنی کارِ خیر کے لیے بھی چندہ دینے سے انکار کرنے لگے ہیں۔' (ص: 179) مصطفیٰ بیگ پوسٹ مین

اگر یہ قلمی جنگ نہ ہوتی تو شاید خواجہ گروپ کے سستے اخبار و رسائل کے ذریعے خلافت فنڈ کے غبن کی مسلمانوں میں اتنی تشہیر نہ ہوتی، ع نہ کھلتے رازِ سر بستہ نہ یہ رسوائیاں ہوتیں۔اس غبن نے خلافت تحریک کی اگر کچھ نیک نامی بچی بھی تھی تو اس پر ہمیشہ کے لیے سیاہی پوت دی تھی۔ خواجہ نے لکھا ہے کہ رنگون سے خلافت کمیٹی کو جو روپیا ملا، اس سے خلافت تحریک کے غبن کی تحقیقی رپورٹ کو ضائع کروایا گیا، لیکن یہ الزام درست نہیں لگتا، چوں کہ خود مولانا محمد علی نے پنجاب کی ایک سیاسی پارٹی پر وہ تحقیقی رپورٹ انگریزی اخبار 'Statesman' میں شائع کرانے کا الزام لگایا تھا۔

اگر مولانا محمد علی کی تسلیم کی ہوئی رقم سولہ لاکھ پچاس ہزار ہی مان لیں، تو وہ بھی اگر بینک میں رکھ دی جاتی تو سابق بینکر اور مشہور مزاح نگار فیاض احمد فیضی کے حساب سے آج لگ بھگ 675 کروڑ کی ہوتی۔ جب کہ خلافت فنڈ کے پچاس لاکھ روپیوں کے خرد برد پر ایک عام اتفاقِ رائے اُس دور کے مشاہیر کے یہاں پایا جاتا

ہے۔اگر قوم کا یہ سرمایہ برباد نہ ہوا ہوتا اور محفوظ کر دیا گیا ہوتا تو اس کی مالیت آج تقریباً دو ہزار کروڑ کی ہوتی۔

نمونہ جنگِ صفین، میں یہ الزام بھی لگایا گیا ہے کہ 1920 میں خلافتی وفد کے انگلستان کے دورے میں وہاں پر محمد علی نے اپنی شہرت کے لیے ایک مشہور فلم کمپنی سے ستر ہزار روپیوں میں فلم بنوایا۔ کیا اس کی اجازت خلافت کمیٹی نے دی تھی؟ کیا سید سلیمان ندوی نے اس خرچ کا کوئی شرعی پہلو بتایا تھا؟' (ص:112)۔

خلافت کے اس دورے کے اخراجات کے بارے میں بہت سوں نے سوال اٹھائے ہیں۔قاضی عدیل عباسی نے جو کہ خلافت تحریک سے وابستہ رہے تھے خاص اس الزام کے تعلق سے تو نہیں ،مگر قدرے ابہام کے ساتھ یہ ضرور لکھا ہے: ''مولانا محمد علی سے حساب مانگا گیا۔مولانا محمد علی جیسے ناپابندِ اوقات کے لیے باقاعدہ حساب رکھنا کہاں ممکن تھا!لارڈ حیات جو علی گڑھ کے کھلنڈرے تھے،اصل میں یہ کام بہ حیثیت سکریٹری ان کا تھا۔.....محمد علی نے جواب دیا:' خدا کو بروزِ قیامت حساب دوں گا'...........جس طرح یہ حساب مرتب ہوا اور جتنی صفائی سید سلیمان ندوی نے مولانا محمد علی کی جانب سے دی وہ قوم کی پست اخلاقی اور ایک عظیم خادمِ قوم کی جو بے وقری ہے،اس کو بیان کرنے کے لیے پتھر کا کلیجہ چاہیے۔'' (ص:123)

خاتمہٴ جنگ: کتاب کے آخر میں خواجہ حسن نظامی نے حسبِ وعدہ اپنی لڑائی 24 دسمبر 1926 سے ختم کر دیے جانے کی اطلاع دی ہے، جب کہ محمد علی نے اعلان کیا تھا کہ وہ ختمِ خواجگان میں مشغول ہیں'اور'ہمدرد' صلح کرے گا نہ ہی یہ جنگ ختم کرے گا۔' لیکن کئی تذکرہ نگاروں کے مطابق حکیم اجمل خاں، ڈاکٹر انصاری اور چند سنجیدہ حضرات کے بیچ بچاؤ سے اس قلمی جنگ کو ختم کر دیا گیا۔

مولانا محمد علی کے سوانح نگاروں میں سید محمد ہادی نے ایک حد تک معروضی انداز اپنایا ہے۔انھوں نے محمد علی کی شخصیت کا جو تجزیہ کیا ہے وہ حقیقت پسندی کا مظہر اور اہمیت کا حامل ہے، اُسی پر اس مضمون کا خاتمہ کیا جاتا ہے:

> ''مولانا کی ذات میں وہ حاکمانہ، بزرگانہ اور درویشانہ شان دل ربائی تھی کہ میں آج تک اس کو اپنے جسم و جان سے اٹھا کر نہیں پھینک سکا اور میں ہی نہیں شاید آپ کے سب ہی شاگردوں اور خوردوں کا یہی حال تھا۔میں نے اپنے سیاسی ساتھیوں میں سے کسی کو نہیں دیکھا کہ وہ خاص مولانا کے خلاف ایک لفظ بھی بے ادبی کا بول سکا ہو، حالاں کہ ان میں سے ہر شخص مولانا کے زخم کھائے ہوئے تھا اور ہزاروں کا نقصان اٹھا چکا تھا۔یہ وہ مقام بلند ہے جسے فلسفی کہتے ہیں کہ مقتول اپنے قاتل کو پسند کرنے لگتا ہے۔'' انھوں نے مولانا کی شخصیت کو مقناطیسی

بتایا ہے، اس کے ساتھ ہی یہ بھی لکھا ہے کہ ’’لیکن اے وائے کہ اس علوے مرتبت کے جگن ناتھی پہیے کے نیچے ہزاروں دب کر مر گئے۔‘‘ (ص: 177-176)

مصادر:

’خواجہ حسن نظامی: ’نمونہ جنگِ صفین‘، حلقۂ مشائخ (دہلی)، پہلا اڈیشن 1927

عبدالماجد دریابادی: ’محمد علی: ذاتی ڈائری کے چند ورق‘، حصہ اول، معارف پریس (اعظم گڑھ)، اڈیشن 1952

ماہرالقادری: ’یادِ رفتگاں‘، جلد اول (مرتبۂ طالب الہاشمی)، طبع دوم 1994 مرکزی مکتبۂ اسلامی (دہلی)

عبدالمجید سالک: مضمون ’خواجہ حسن نظامی‘ مشمولہ ’یارانِ کہن‘، پہلا اڈیشن، مطبوعاتِ چٹان (لاہور)

مولانا محمد علی: ’مقالاتِ محمد علی‘، جلد اول، مرتبہ رئیس احمد جعفری، ادارۂ اشاعتِ اردو (دکن)، پہلا اڈیشن 1943

مولانا محمد علی: ’مقالاتِ محمد علی‘، جلد دوم، مرتبہ رئیس احمد جعفری، ادارۂ اشاعتِ اردو (دکن)، پہلا اڈیشن 1943

سید محمد ہادی: ’علی برادران‘، مکتبہ جامعہ (دہلی)، پہلا اڈیشن 1978

رئیس احمد جعفری: ’علی برادران‘، محمد علی اکاڈمی (لاہور)، طبع اول 1963

قاضی عدیل عباسی: ’تحریکِ خلافت‘ NCPUL، پہلا اڈیشن 1978

سردار دیوان سنگھ مفتوں: ’ناقابلِ فراموش‘، پہلا اڈیشن: 1957 (دہلی)

ڈاکٹر امام مرتضیٰ: ’خواجہ حسن نظامی: حیات اور ادبی خدمات‘، مطبوعہ نسیم بک ڈپو (لکھنؤ)، پہلا اڈیشن 1978

مولانا ملیح آبادی: ’ذکرِ آزاد‘، مطبوعہ ’آزاد ہند‘ (کلکتا)، پہلا اڈیشن 1960

عبداللطیف اعظمی: ’مولانا محمد علی۔ ایک مطالعہ‘، علمی ادارہ (نئی دہلی)، پہلا اڈیشن 1980

پروفیسر محمد سرور (مرتب): ’مضامینِ محمد علی‘، مکتبہ جامعہ (دہلی)، پہلا اڈیشن 1938

ضیاالدین احمد برنی: ’حیاتِ مولانا محمد علی‘، مطبوعہ اردو اکاڈمی سندھ (کراچی)، اڈیشن: 2001

ضیاالدین احمد برنی: ’عظمتِ رفتہ‘، مطبوعہ ادارۂ علم وفن (کراچی)، اڈیشن: 2000

’مشاہدات و تاثرات‘ مصنفہ ڈاکٹر شیخ عبداللہ، مطبوعہ فیمیل ایجوکیشن ایسوسی ایشن علی گڑھ، پہلا اڈیشن 1969

’مولانا محمد علی جوہر: آنکھوں دیکھی باتیں‘ مولفہ محمد عبدالمالک جامعی، مطبوعہ دہلی، پہلا اڈیشن: 2020

سید محفوظ علی بدایونی: ’طنزیات ومقالات‘، مطبوعہ انجمن ترقی پاکستان، پہلا اڈیشن: 1974

ماہ نامہ ’آج کل‘ نئی دہلی: ’خواجہ حسن نظامی نمبر‘، فروری 1977

سید احمد شمیم کے ''کاسۂ شب'' میں تلاشِ ذات کا عمل

عشرت ظہیر

سید احمد شمیم کا تازہ شعری مجموعہ ''کاسۂ شب'' میرے پیش نظر ہے۔

سید احمد شمیم کی شاعری کا میں 70 کے دہے سے اسیر ہوں ۔ مظہر امام ، حسن نعیم ، شاہد احمد شعیب اور وہاب دانش کے ساتھ ہی ساتھ، یہ سید احمد شمیم کی شاعری کے عروج کا زمانہ تھا۔ ان دنوں میں، کلام حیدری کے ادارہ کلچرل اکیڈمی سے منسلک تھا، اور وہاں سے شائع ہونے والے جریدے ، آہنگ اور مورچہ کے معاون مدیر پروفیسر تاج انور کو اسسٹ کیا کرتا تھا۔ ان دنوں سید احمد شمیم کی نظمیں اور غزلیں ''مورچہ'' کے پہلے صفحہ پر بڑے اہتمام سے شائع ہوا کرتی تھیں۔

سید احمد شمیم بطور پروفیسر جمشید پور میں خاصے مقبول رہے ہیں، اور بحیثیت شاعر، اسلوب کی ندرت اور فکری تنوع کے حامل شاعر ہونے کے سبب ان کی خاص پہچان تھی ۔ ان کی شاعرانہ عظمت اور قدر و منزلت کے تعین میں شمس الرحمٰن فاروقی ، وہاب اشرفی علیم اللہ حالی ، حسین الحق اور حقانی القاسمی جیسے متعدد بڑے اور قدآور ناقدوں اور تخلیق کاروں نے خامہ آرائی کی ہے۔ اب ان کی شاعرانہ عظمت و آراستگی پر مجھ جیسا گمنام اور طفل مکتب کے لئے اظہار خیال گویا پل صراط سے گزرنے کا عمل ہے ۔ لیکن مجھ پر یہ قرض ہے، اور اس قرض کو اتارنا لازم ہے۔ دیکھیں کیا گزرے ہے..........

میرے سامنے سید احمد شمیم کی شاعری کا ایک اسکائی اسکریپر ایستادہ ہے اور میں وہاں کھڑا ہوں، جہاں سے اس بلند و بالا عمارت کی نظارگی کے لئے 64 سالہ طویل مسافت پر محیط ، سیڑھیوں کا لمبا سلسلہ ہے ، اور یہ عمارت بصورت حسن مجسم مرکز نگاہ ہے۔ لہٰذا میں کہہ سکتا ہوں شاعر نے زندگی کے دھندلکوں میں ڈوب کر تلاش ذات کی جستجو میں سمندر منتھن سے حاصل زہر ہلاہل کو جس طور گھونٹ گھونٹ پیا ہے'' کاسۂ شب'' اس کے ردعمل اور کیفیت کا سچا اور کھرا اظہار ہے، اور اس اظہار میں ندرت اور انوکھا پن بھی ہے، فنکاری اور صناعی بھی ہے ۔

''کاسۂ شب'' کے انداز پیش کش میں خوش سلیقگی اور ہنرمندی کو بڑا دخل ہے ۔ پیش لفظ اسلم بدر نے تحریر کیا ہے اور ترتیب و تدوین کا بار بھی انہوں نے ہی اٹھایا ہے۔ ''لوح قلم'' کے تحت منتخب حمد اور نعت کا بہترین انتخاب شامل ہے۔ حمد و نعت کی شمولیت شاعر کے مزاج و میلان کے عین مطابق ہے کہ وہ کہتے ہیں:

''میرا مذہب اسلام ہے اور مسلک خانقاہیت ہے۔''

''زخم تازہ'' کے تحت شاعر نے اپنی تازہ ترین نظموں اور غزلوں کو پیش کیا ہے ۔ یہ اس بات کی غمازی ہے کہ شاعر 64 سالہ طویل شعری مسافت کے بعد آج بھی عصر حاضر کے تقاضوں اور ان کے اظہار کی صعوبتوں کو جھیلنے کے لئے تازہ دم ہے۔

اس کے بعد ان کے شعری مجموعے ''بے در و دیوار'' اور ''ڈوبتی شام'' سے منتخب نمائندہ غزل و نظم کو Reproduce کیا گیا ہے ۔ ''در دتہہ جام'' کے تحت جو نگارشات شامل ہیں ان میں چند ایسی غزلیں اور نظمیں ہیں، جو شاید شاعر کے دل کے بہت قریب افراد کے لئے کہی گئی ہیں۔ اور آخر میں ''دل گم گشتہ'' کے زیر عنوان شامل تخلیقات شاعر کے نوخیز بیٹے عرفی کے بے وقت رخصت کے سبب شاعر کے درد کا نتیجہ فکر ہے جو بیٹے سے ان کی محبتیں، اور بے ثباتی عالم کے احساس دائمی کا برملا اور فنکارانہ اظہار ہے۔

لیکن ان تمام ہنرمندانہ اور سلیقہ آمیز پیش کش سے پہلے، کتاب کے سرنامے اور شاعر کے نام والے صفحہ سے قبل:

پہلے صفحہ پر بسم اللہ الرحمٰن الرحیم درج ہے۔

اور دوسرے، یعنی صفحہ نمبر 2 پر مجموعہ کلام ''ڈوبتی شام'' میں شامل نظم'' میں کون ہوں......'' سے پانچ منتخب مصرعے درج ہیں۔ جسے میں مفہوم کی مکمل ادائیگی کے سبب ایک مختصر نظم کے روپ میں محسوس کر رہا ہوں۔

میں جو بھی ہوں، جیسا ہوں

اب تیرے حوالے ہوں

یہ تو ہی بتا مجھ کو

میں کون ہوں؟

میں کیا ہوں؟

ان مصرعوں کا معصومانہ اظہار اپنے اندر عمیق ماورائیت سموئے ہوئے ہے۔ شاعری میں یہ بڑی بات ہے کہ قاری تخلیق کی فضا بندی سے، اپنے مطلب کا مفہوم اخذ کرنے پر قادر ہو جائے یہاں بھی لطیف احساس، اور تخلیقی فضا بندی اس درجہ گھنگ ہے کہ قاری تلاش وجود کی جستجو میں دور تک نکل جاتا ہے ۔ یوں ان مصرعوں میں ابہام حسن اور لذت کشش کی انوکھی رعنائیاں ہیں، جس نے معنی و مفہوم کے کئی در وا کئے ہیں اور یہ پرت در پرت عرفان ذات کے اسرار کے بلیک ہول کے سفر پر قاری کو آمادہ کرتا ہے ۔ ابہام کی یہ کیفیت تخلیق کا حسن ہے اور خالق کا حق ۔

سید احمد شمیم اپنی شاعری میں، اس حسن کو اپنے جلو میں لئے انتہائی فنکاری کے ساتھ برتنے پر قادر ہیں۔ یہ شعر دیکھیں۔

میں ہوں، میرے سوا یہاں ہے کون
کوئی اب خود کو تو لٹا بھی ہے؟

سید احمد شمیم کی شاعری میں تلاش ذات، انانیت، ناسٹلجیا اور محبت، غالب عناصر کے طور پر ابھر کر سامنے آتے ہیں۔ یوں انانیت اور خودی فنکاروں کا مقدر رہے اور بڑی شاعری کا خاصہ۔

سید احمد شمیم کی شاعری سے روبرو ہوتے ہی ایک نوسٹلجک صورت حال ابھر آتی ہے۔ یہ صورت حال کبھی خوشی کی شگفتگی کبھی غم کی تپش بن کر اثر پذیر ہوتی ہے۔ سید احمد شمیم کے یہاں نوسٹلجیا تخلیقی عمل کا حصہ بن کر، اور محرک کے روپ میں، ان کی شاعری کے ایک قابل لحاظ حصّے کا احاطہ کرتی ہے۔ اور یہ کہ سید احمد شمیم ناسٹلجک احساسات سے اپنی شاعری کو ثروت مند بنانے پر پوری طرح قادر ہیں۔

پچھلے پہر کل رات کو
خلوت کی جلوہ گاہ میں
بیتے ہوئے ایام کی
ابھرے نقوش جاوداں (نظم لرزیدہ گر سے)

ترے خلوص نے کل شب
جو تھوڑی لو دے دی
گمان ہوا کہ میں
قوس قزح سے لپٹا ہوں
مرے وجود میں تحلیل
موج رنگ ہوئی (نظم قوس قزح حلقۂ بازو سے)

مگر اچانک
دلوں کی وادی میں شمع اک ہو گئی فروزاں

شکستہ دل، مضمحل نگاہوں

ملول روحوں کو جس کے دم سے

ضیاء ملی ہے، جولاکھوں صدیوں سے جل رہی ہے

جلا کرے گی (نظم ''آئینہ کہ جمال دارد سے'')

انسان اپنے وجود کے تعلق سے روزازل سے ہی الجھن اور کشمکش کا شکار رہا ہے،یعنی ، میں کیا ہوں؟ کیوں ہوں؟ انسان کے اس حیات کی آخری اوراخروی منزل کیا ہے؟ گویا، یہ تذبذب ، یہ بے چینی انسان کا مقدر رہا ہے،لہٰذا ادب وشعر کے تحت اس احساس کو فنکاروں نے مختلف انداز اورزاویے سے قرطاس ابیض میں مقید کیا ہے ۔سید احمد شمیم نے اس دائمی، ازلی وابدی احساس ،تلاش ذات ،کو اپنی شاعری میں بطور احسن برتا ہے،یوں یہ ان کی شاعری کا اثر انگیز حصہ ہے،اوراس دھند لکے کو سید احمد شمیم نے لطیف فکر کے تحت اشعار کی شکل میں پیش کیا ہے۔

کچھ سمجھ میں نہیں آتی ہے حقیقت اپنی

زندگی تو ہی بتا کیا ہے ضرورت اپنی

میں سفر میں نہیں اور پھر بھی ہوں مصروف سفر

کسی منزل پہ ٹھہرتی نہیں وحشت اپنی

ساری دنیا کو جانتے ہو شمیم

ہاں ،مگر خود سے کم شناسائی ہے

اور یہ نظم ''میرا میں سوالی''۔دیکھیں:

زندگی............! تجھ سے پوچھتا ہوں میں/اب کے آیا ہے کون سا موسم

کوئی منظر بھلا نہیں لگتا/کوئی منظر برا نہیں لگتا

جیسے ہر نقش....../نقش بے معنی

کاسئہ ذہن خالی خالی ہے

میرا میں/ مجھ سے ہی سوالی ہے

میں سید احمد شمیم کو، غزلوں یا نظموں کا شاعر ہونے کی حیثیت سے یا حمد ونعت کے تعلق سے Specialise نہیں کرنا چاہتا، کیونکہ ان کی شاعری میں ان کے اسلوب کی انفرادیت، تازہ کار موضوع، عصر حاضر کے تقاضے اور الفاظ کی آراستگی نشست و برخواست اور ان سے اجاگر ہونے والی نئی انوکھی اور گہرائی گیرائی کی حامل حمد کا یہ شعر ملاحظہ ہو۔

ہاں، وہ میرا کون ہے، جس کے تصور نے شمیم

تازگی اسلوب کو، الفاظ کو پیکر دیا

اور نعت کا یہ شعر دیکھیں ۔

آج پھر محتاج ہے تیری نگہ کا یہ جہاں

اٹھ رہا ہے سینۂ ہستی سے پھر پیہم دھواں

اور ''دعا''، جس میں شاعر نے عدم کی تاریکیوں سے وجود کی روشنی اور شعور کی ''چاندنی'' جیسی نوازشوں کا ذکر نہایت عاجزی اور انکساری کا ساتھ تو کیا ہے، لیکن وہ غیور طینت کا خوگر ہونے کے سبب تشکیک میں بھی مبتلا ہے، اور جستجو کا متلاشی بھی، لہٰذا اپنی سرشت کی بے چینی کے زیر اثر ''نور عرفان'' کا طلبگار ہے۔

حد گماں سے

عظیم تر نعمتیں / عطا کیں..........

مگر یہ تیرا / حقیر بندہ

غبار تشکیک میں گرفتہ

خود اپنے بار انا کے نیچے

دبا ہوا ہے..........

میرے رحیم و کریم مولا..........

جو تو نے یہ سب عطا کیا ہے

تو اپنے عرفان کا نور بھی دے..........

حمد اور نعت جیسی صنف کے لئے یہ طرز ادا سید احمد شمیم کے فکری تنوع کا غماز ہے، سید احمد شمیم اپنی شاعری کے تمام اصناف میں اپنے رجحان اور تیور کو برقرار رکھنے پر قادر ہیں، لہٰذا غزل و نظم کے ساتھ ہی ساتھ حمد و نعت میں بھی انہوں نے نئی روش اختیار کرتے ہوئے، انانیت، تشکیک ذات، اور انسانی سرشت کی بے چینی اور اضطرابی کیفیت

کو بحسن وخوبی بروئے کار لایا ہے۔

ایک باوقار اور پر افتخار زندگی کا سفر ادھورا ہے، اگر انسان راہ گزرِ حیات کے ہجوم نشیب وفراز، یعنی انبساط و کیف اور غم والم کے محرکات کے ساتھ ساتھ اپنی انا اور خودی کا بار نہ اٹھا سکے گویا یہ فنکار کا ایسا وصف ہے، جو فن کے لئے ایک اعجاز ہے اور فنکار کے لئے باعث اعزاز۔ سید احمد شمیم کی شاعری کا ایک نمایاں پہلو انانیت بھی ہے۔نموناً یہ اشعار پیش ہیں۔

دنیا والے یہ کہیں، دولت دنیا کیا ہے
ہم تو ٹھوکر پہ زمانے کی عطا رکھتے ہیں

سلطان کہیں کے ہیں نہ کسی کے وزیر ہم
رکھتے ہیں زمانے میں اپنی نظیر ہم

بڑھ کے اپنی انا نے تھام لیا
تشنۂ حرف التماس رہے

ترا اپنا نفیٔ ذات پر ہے منحصر جاناں
تو ہم ایسی محبت سے چلو انکار کرتے ہیں

سرپھرا کہتے ہیں، مغرور سمجھتے ہیں یہ لوگ
شکر مولا، نہ کسی کی بھی ثنا خوانی کی

جو تو نہیں نہ سہی پاس ہے انا اپنی
میں وہ نہیں جو سر سنگِ در سے مارتا ہے

انسان اپنی زندگی میں اکثر، ماضی میں جھانکنے کا عادی ہوتا ہے۔ یعنی یہ کہ انسان حیات کے ایک ایسے دورا ہے

پر کھڑا ہوتا ہے، جس کے آگے دھند میں ملفوف مستقبل ہے، اور پیچھے چھوٹا ہوا ماضی، جس در یچے سے نشاط آگیں ایام بھی اور اداس وملول کرنے والی یادیں بھی، ایک سرور سا عطا کرتی ہیں، اور ان سے وہ پیچھا نہ چھڑا سکتا ہے، نہ چھڑانا چاہتا ہے۔یعنی اس کی سرشت میں شامل ہے کہ بیٹھے رہیں تصور جاناں کئے ہوئے -سید احمد شمیم بھی اس ناسٹلجیا کے شکنجے سے اچھوتے نہیں، اور اپنی یادوں کے ذائقے سے خود بھی کیف وسرور سے روبرو ہوتے ہیں اور قاری کو بھی حظ اٹھانے کے وسیلے بہم پہنچتے ہیں۔

جھیل پربت، شوخ ندی، بادباں
اس سفر کا ذائقہ اچھا لگا

میرا ماضی مدتوں بھولا ہوا
کل اچانک مل گیا اچھا لگا

مدتیں بیت گئیں پھر بھی بھلائی نہ گئی
ایک آواز جو ہمدرد کئی سال رہی

سرمئی شام کی گہرائی میں ڈوبا سورج
اب پرندوں کی وہ چہکار کہاں سے لاؤں

ہر بار تری یادیں ساون کی طرح برسیں
ہر بار یہی سوچا، ہم تجھ کو بھلا دیں گے

یہ گھنی رات ہے اماوس کی
اس اندھیری میں تم کہاں آئے

مالک کون ومکاں نے انسان کی گھٹی میں ''محبت'' کے عنصر کو کچھ اس طرح شامل کیا ہے کہ اس کے ہر عمل دخل کی تہہ

میں ''محبت'' ہی کی کارفرمائی ہوتی ہے،اب وہ نفرت میں مبتلا ہو کہ دشمنی میں،اس کی ابتدا محبت ہی ہوتی ہے۔
سید احمد شمیم کی شعری کائنات بھی ''محبت'' سے خالی نہیں ۔اوران کے اظہار میں تہہ داری اور الفاظ کی بندش کا ہنر اس طرح اجاگر ہوتا ہے کہ جمالیاتی احساس انگڑائی سی لیتی معلوم ہوتی ہے ۔ان کے یہاں محبت کی روایتی پاسداری نہیں ہے، بلکہ سید احمد شمیم کی محبتیں معانی کی ایسی جہات کا اضافہ کرتی ہیں، جس میں، مانوس تجربہ بھی ہے اور بے پایاں امکانات بھی ۔دیکھیں یہ اشعار،ان میں زندگی کے تیئں مثبت رویہ کے چراغ روشن ہیں۔

بھیگی بھیگی شب کا آنچل اور تم
چپکے چپکے بولنا اچھا لگا

عمر بھر میں نے محبت کی فراوانی کی
لوگ کہتے ہیں شمیم آپ نے نادانی کی

رمیدہ سرمئی بادل، ہوائیں، ریشمی آنچل
مناظر ایسے ہی مجھ کو بہت بیمار کرتے ہیں

اے شوق بغل گیری، وہ آگ لگا دیں گے
پھر جلنے پگھلنے کی تا عمر سزا دیں گے

جو تماشا ہے اسی شوخ آنکھوں کا ہے
رنج اپنا ہے کوئی، نہ راحت اپنی

تحفۂ دردِ گراں مایہ، کسی نے تو دیا
میں نہیں کہتا، مری زندگی کنگال رہی

اس پہ ظاہر نہ کیا خود میں پگھلتا ہی رہا
شبنمی آنچ ہی سرگرمیٔ احوال رہی

محبت کی حقیقت مسلم ،لیکن بے ثباتیٔ عالم کا احساس بھی انسان کی زندگی کے ساتھ ساتھ ہے ۔اور بالآخر یہ تمام احساسات پر حاوی ہوتی سی معلوم ہوتی ہے۔

بھاگتے دوڑتے لمحوں کا سفر
کب اچانک ہی ٹھہر جائے گا

یونہی ہر سانس جینا مرنا ہے
دوسرا کوئی راستہ بھی نہیں

دن کا جلتا سفر تمام ہوا
رات اب کہہ رہی ہے سونے کو

منزلوں کی سمت روز و شب یونہی چلتے رہے
راستے کٹتے گئے اور فاصلہ باقی رہا

سید احمد شمیم کا یہ شعری مجموعہ ’’کاسۂ شب‘‘ دراصل شاعر کے اپنی ذات کے نہاں خانہ میں ڈوبنے ابھرنے کا ایسا عمل ہے، جس کا حاصل وہ دُرِّ نایاب ہے جو حیاتِ انسانی کی کامل تفسیر پیش کرتا ہے۔یوں یہ مجموعہ درد و گداز، ناسازگاریٔ عالم، قدروں کا زوال دل کی ویرانی، اور بے ثباتیٔ عالم کے نہ مٹنے والے نقوش مرتسم کرتا ہے۔

اکبرالہ آبادی کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری

(گاندھی نامہ کے حوالے سے)

ڈاکٹر فخر الکریم

بلا شبہ اکبر طنز و مزاح کے سب سے بڑے شاعر ہیں۔ ان کی ظرافت کا دائرہ بیحد وسیع ہے۔ سیاست، مغربی تہذیب اور حالات حاضرہ ان کی طنزیہ اور مزاحیہ شاعری کے لیے بے شمار موضوعات مہیا کرتے ہیں۔ سیاست سے اکبر کو براہ راست کبھی کوئی عملی دلچسپی نہیں رہی اور نہ انھوں نے کبھی با قاعدہ اس فن کا مطالعہ کیا تھا اور نہ اس موضوع سے ان کے ذہن کو کوئی مناسبت تھی، لیکن پہلی جنگ عظیم کے خاتمے کے بعد جب ہندوستان کی ٹھہری ہوئی سیاست میں مہاتما گاندھی کا غلبہ شروع ہوا اور رولٹ ایکٹ، جلیانوالا باغ کا لرزہ خیز واقعہ، تحریک ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کے ذریعہ پورے ملک میں عملی سیاست کی انقلابی روح جاگ اٹھی تو اکبر کو اپنے وقت کے سیاسی حالات سے دلچسپی پیدا ہوئی لیکن جو زمانہ گاندھی جی کی شہرت اور عروج کا تھا اسی زمانہ ۱۹۲۱ء میں اکبر کا انتقال ہو گیا، ورنہ اکبر ان کا تذکرہ مختلف زاویوں سے کرتے۔ اس بات کو بھی نہ بھولنا چاہئے کہ اکبر سرکاری ملازم تھے۔ وہ کسی ایسی تحریک کا کھل کر ساتھ نہ دے سکتے تھے جس کا براہ راست نشانہ برطانوی حکومت ہو۔ وہ گاندھی جی کی اخلاقی طاقت اور خالص مشرقی اندازِ نظر کے معترف تھے اور تحریکِ ترکِ موالات کے حامی بھی۔ انھوں نے اس تحریک کا تذکرہ بڑے پُر زور انداز سے کیا ہے جو بے سرو سامانی سے شروع کی جارہی تھی اور جو برطانوی حکومت کے مقابلے میں بظاہر بالکل کمزور اور معمولی چیز نظر آرہی تھی۔ اس سلسلے میں ان کا یہ اعتراف بھی ملاحظہ ہو۔

مدخولۂ گورنمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا
اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں

یہی نہیں اکبر نے سودیشی تحریک، ہندو مسلم اتحاد اور سیاسی جدو جہد میں ان کے فلسفۂ عدم تشدد کی اخلاقی قدر و قیمت کی تائید بھی کی۔

لشکرِ گاندھی کو ہتھیاروں کی کچھ حاجت نہیں
ہاں مگر بے انتہا صبر و قناعت چاہئے

مہاتما گاندھی کی شخصیت اور عظمت کے پیشِ نظر ایک مجموعۂ اشعار ''گاندھی نامہ'' کے نام سے مرتب کیا

جس کے زمانۂ تحریک کو ۱۹۱۹ء سے ۱۹۲۱ء کے درمیان سمجھنا چاہئے۔ یہ پہلی بار ۱۹۴۸ء میں الہ آباد کے مشہور ادارہ کتابستان سے شائع ہوا۔ بعد میں اس کے بیشتر اشعار کلیات اکبر جلد چہارم کتابستان، کراچی میں بھی چھپے۔
(بحوالہ، اکبر الہ آبادی از خواجہ محمد زکریا تنقیدی و تحقیقی مطالعہ۔ص:۳۰۹)۔

''گاندھی نامہ'' کی ابتدا میں یہ شعر لکھا ہوا ہے۔

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے
شاہنامہ ہو چکا اب دورِ گاندھی نامہ ہے

''گاندھی نامہ'' کے دو مخطوطے خود اکبر کے مرتب کئے ہوئے ہیں۔ چھوٹا مجموعہ ''نقش اوّل'' اور بڑا ''نقش ثانی'' ہے۔ چھوٹے نسخے میں کل ۱۶۲ اشعار ہیں، اس پر کوئی عنوان نہیں ہے۔ مگر ہر ایک یا زائد شعر کو ایک یا دو جملوں میں مختصر اور جامع تمہید کے ساتھ پیش کیا ہے۔ ان ۱۶۲ اشعار میں سے صرف آٹھ ایسے ہیں جو بڑے نسخے میں نہیں ہیں۔ باقی سب اس میں موجود ہیں۔

بڑا مجموعہ چھوٹے مجموعے کی توسیع ہے، جس میں ۱۹۸ قطعات ہیں جو سات عنوانات کے تحت ۳۷۲ اشعار پر مشتمل ہیں۔ سرِ ورق کا شعر شمار ۱۸۱ میں دوبارہ لکھا گیا ہے۔ اس لیے اشعار کی صحیح مجموعی تعداد ۳۷۱ ہوتی ہے۔

''گاندھی نامہ'' کے نقش ثانی میں سات عنوان قائم کئے گئے ہیں:

۱۔ اعتراضات
۲۔ ہندوؤں کے ساتھ ہو گئے
۳۔ گاندھی کا ساتھ بغاوت نہیں ہے
۴۔ ترک موالات کی توجیہ
۵۔ عدم ترکِ موالات کی توجیہ
۶۔ بے پروائی و بے تعلقی
۷۔ ظرافت

اکبر نے تحریکِ ترکِ موالات اور تحریکِ خلافت کے نشیب و فراز کو طنز کے پیرائے میں موضوعِ سخن بنایا ہے۔ تحریکِ ترکِ موالات کے سلسلے میں بعض افراد کا یہ خیال تھا کہ یہ سب ہنگامہ وقتی اور عارضی ہے، اس ملک میں اب کسی طرح کی تبدیلی ممکن نہیں ہے۔ اسی لیے عوام کا ایک بڑا طبقہ ترکِ موالات سے معذوری ظاہر کرتا ہے۔ کچھ

اشعار ملاحظہ کیجئے

جاہ و زر کے رہے انگلش سے ہمیشہ طالب
عہد پیری میں بدل سکتے ہیں کیوں کر قالب
مشتہر کر دیں یہ ہمدم میں جناب جالب
زندگی بھر تو رہا عشقِ بتاں ہی غالب
وعظ گاندھی سے بدل سکتے ہیں کیوں کر باطن
عمر ساری تو کٹی عشقِ بتاں میں مومن
آخری وقت میں کیا خاک مسلماں ہوں گے

بہ ظاہر ایک ایسی تحریک اور ایسا لائحہ عمل جس سے براہ راست روٹی روزی پر اثر پڑنے کے امکانات ہوں، کچھ غور و فکر کا طالب تھا۔ پھر یہ بھی سراسر حماقت کی تجویز معلوم ہوتی تھی کہ ایک ایسی قوم سے مقابلہ کیا جائے جس کی حکومت میں کبھی آفتاب غروب نہیں ہوتا۔ جس کے قبضہ میں سبھی کچھ ہے اور جس کے نام کی ہیبت سے بڑے سے بڑا حکمراں کانپتا ہے۔ مختصر یہ کہ ایسی تجویز پر عمل کرنا تو درکنار اس کا تصور ہی محال معلوم ہوتا تھا۔ نچلے اور متوسط طبقوں کے افراد نے ضرور ہمت کر کے ان تحریکوں اور تجویزوں پر عمل کیا لیکن بڑوں کے پاس بہت سے بہانے تھے۔ اکثر افراد نے درمیانی روش اختیار کی۔ مایا بھی ہاتھ لگی اور رام بھی مل گئے۔ ذرا ان اشعار پر غور کیجئے

ہزاروں ہی طریقوں سے ہم انگریزوں کو گھیرے ہیں
طواف ان کے گھروں کا ہے۔ انھیں سڑکوں کے پھیرے ہیں
سواری ہے انھیں کی راہ ان کی اور ڈاک ان کی
انھیں کی فوج ہے ان کی پُلس ہے اور تاک ان کی
ہوا میں ایئر شپ ان کے سمندر میں جہاز ان کے
عمل ہم میں کیا کرتے ہیں نامعلوم راز ان کے
علوم ان کے، زباں ان کی، پرس ان کے لغات ان کے
ہماری زندگی کے سارے اجزاء پر ہیں ہاتھ ان کے
بہت ایسے بھی ہیں جو ترک تعاون کے بھی قائل ہیں

مگر اونچے جو ہیں اکثر طواف انگلش کے مائل ہیں
فقط ضد ہے جو کہتی ہے کہ جب اپنی زباں کھولو
ہمارے پیشوائے ملک گاندھی جی کی جے بولو

اکبر کے دور میں سب سے بڑا سوال ہندوؤں اور مسلمانوں کی باہم یکجہتی کا تھا۔ ہندوؤں اور مسلمانوں کی آپسی تفریق اور مخالفت کے باوجود مسلمانوں کا ایک طبقہ ایسا پیدا ہو گیا تھا جس نے ہندوؤں کی ہمنوائی میں گاندھی جی کو اپنا لیڈر مان لیا تھا۔

مسلمان قوم مجموعی طور پر ہندوؤں کے مقابلے میں سماجی اور معاشی معاملات میں بہت کمزور اور پچھڑی ہوئی تھی، اس لیے ان کو ان سارے جھمیلوں سے الگ تھلگ رہنا چاہئے کیوں کہ

ان میں نہ رنگ درویش، ان میں نہ شان شاہی
گالی ہے اور زنداں چرخہ اور انجن

آخر میں ظرافت کے عنوان سے ۷۳ قطعات میں ۱۳۹ اشعر ہیں۔ ان میں اس وقت کے سماجی نشیب و فراز اور گاندھیت کے ہر پہلو کا عکس بہت ہی نمایاں ہے۔ گاندھی نامہ کے موضوعات کا احاطہ کرتے ہوئے پروفیسر نعیم الرحمٰن لکھتے ہیں:

''مسلمانوں کا رجحان اور تذبذب، ہندوؤں کا بیباکانہ اور بے تحاشہ اقدام، برطانوی حکومت اور قوم سے ہندو مسلم کی روز افزوں نفرت، وطن میں آزادی کے لیے دونوں کی مساویانہ سعی اور عمل کی ضرورت، مسلمانوں کی ہندوؤں کی طرف سے بے اعتباری ....قدیم ایشیائی اور ہندی تہذیب اور اطوار کی طرف مراجعت، نوجوان ہندیوں کی دین اور مذہب سے بیزاری اور آزادانہ بے راہ روی، گاندھی کے قول وفعل میں مذہب اور رہبانیت کے رنگ و روپ میں ایک طرف اہل وطن کی عافیت جوئی اور برطانوی حکومت و اقتدار کی بیخ کنی ......ہندوستان کی ملت اسلامی کو علی الدوام، دوسروں کا دست نگر رکھنے کی تدبیریں........''

(تمہید گاندھی نامہ۔ ص:ق،ر)

اکبر کے تمام کلام خصوصاً گاندھی نامہ میں مِس، شیخ، سید صاحب، اونٹ، گائے، کلیسا، مسجد، دیر، بُت،

کالج، برہمن، لالہ، بدھو، جمن، موہن اور سلو وغیرہ کے کردار سماج کے ہر طبقہ کی نمائندگی کرتے ہیں اور خاص مفاہیم کے حامل ہیں۔ مس مغربی تہذیب کی دلکشی و نظر فریبی کا مجسمہ ہے۔ شیخ ظاہر پرست مسلمان ہے جو لفظ پر مرتا ہے اور معنی سے بے خبر ہے۔ سید صاحب سر سید احمد خاں یا حامیان علی گڈھ کی طرف اشارہ ہے جو مغربی تعلیم و تہذیب کے دلدادہ ہیں۔ اونٹ عرب اور اسلام کے شاندار ماضی کا اشاریہ ہے۔ گائے سے مراد ہندو تہذیب ہے۔ بدھو، جمن وغیرہ عوام اور نچلے طبقے کے اعلامیہ ہیں۔ اسی طرح انور، بے، مل، علی برادران، حضرت برہم، ہمدم، جارج پنجم، امیر کابل وغیرہ کا ذکر مخصوص سیاسی صورتوں اور واقعات کی طرف ذہن کو مبذول کراتا ہے۔

''گاندھی نامہ'' کی کوئی ایک مخصوص شعری ہیت (Form) نہیں ہے۔ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے یہ مختلف اور متعدد اشعار کا ایک مجموعہ ہے جس میں رباعیات، قطعات اور مفردات، پیروڈی اور تضمین سبھی کچھ شامل ہیں مگر ان میں ایک اتحاد معنوی موجود ہے جو کہیں کہیں کمزور اور خفی ہو گیا ہے۔ بقول ڈاکٹر خواجہ محمد زکریا ''گاندھی نامہ'' کو اگر ایک نظم سمجھا جائے تو اسے صنف نظم میں ایک تجربہ قرار دینا ہوگا۔ نظم اور غزل کے پیرایہ میں بھی کہیں کہیں باتیں کی گئی ہیں۔

یوں تو اکبر ہر اس چیز سے شاکی تھے جو زندگی کی کشمکش میں نئی معلوم ہو رہی تھیں لیکن گاندھی نامہ بیسویں صدی کے ربع اوّل کے سیاسی انتشار کا بہت عمدہ مرقع ہے جس میں انھوں نے اپنے عہد کے سماج، سیاست، مذہب، اخلاق، معیشت، ادب اور روحانیت کو بڑے ہی معروضی انداز سے پیش کیا ہے۔ جس میں کوئی ایک نقطۂ نظر ٹھونسنے کی کوشش نہیں کی گئی ہے بلکہ سماج کے سبھی طبقوں کے خیالات کا احاطہ کیا گیا ہے اور آخر میں نتیجہ قاری پر چھوڑ دیا ہے۔ بقول رشید احمد صدیقی:

> ''انیسویں صدی کے آخر اور بیسویں صدی کے آغاز (تقریباً پچاس سال تک) میں
> سیاسی شعور کو سمجھنے کے لیے اکبر کے کلام سے ہر طرح کی مدد لی جا سکتی ہے.........''

اردو شعر و ادب کی تاریخ میں ''گاندھی نامہ'' کی اہمیت و معنویت یہ ہے کہ انھوں نے ان اشعار میں گذشتہ صدی کی ذہنی کشمکش اور تہذیبی تصادم کی داستان رقم کر دی ہے۔ تصادم اور کشمکش سے آج بھی بدلی ہوئی صورتوں (گلوبلائزیشن اور صارفیت) میں تیسری دنیا کے تمام ممالک نبرد آزما ہیں۔ اس بنیاد پر اگر یہ کہا جائے کہ انھوں نے جس خوبی سے اپنے دور کے حالات کو سمجھا اور اپنی ناقدانہ بصیرت سے ان کو اپنی شاعری کا جزو اعظم بنایا، اس طرح سے ان کا کوئی ہم عصر شاعر نہ بنا سکا تو بے جا نہ ہو۔

اردو کا پہلا رباعی مرثیہ ''گُلبدن کی یاد میں''

متین اچل پوری

رباعی کو ایک وقیع و بلیغ صنفِ سخن قرار دیا گیا ہے۔تخلیقی شعور کی کٹھالی میں جذبے کی آنچ پر تپ کر شخصیت جب کندن بن جاتی ہے۔تب کہیں رباعی تخلیق پاتی ہے۔یہ ہنر ذرّے میں صحرا اور قطرے میں دجلہ دکھانے کے مصداق ہے۔رباعی گوئی دشوار گھاٹی کا سفر ہے۔اورنگ آباد(دکن) کے معروف و معتبر شاعر سیّد شاہ حسین نہری نے اس فن کو ایسے تخلیقی رچاؤ اور فن کارانہ رکھ رکھاؤ کے ساتھ اپنایا کہ آخر یہ دشوار گذار گھاٹی ان کی ہم مزاج بن گئی بلکہ یوں کہا جائے تو بجا ہوگا کہ رباعی شاہ حسین نہری کی شناخت بن گئی اور شاہ حسین نہری رباعی کی پہچان۔

خوشبو سے رغبت اور ازواج مطہرات سے محبت شعارِ رسولؐ اور بعد از وصال حضرت خدیجہؓ کی یاد آپؐ کا معمول رہا ہے۔

شاہ حسین نہری کو بھی اپنی رفیقہء حیات عارفہ گلبدن سے محبت اور بعد از وفات اُس کی یاد کی خوشبو سے بے پناہ رغبت رہی ہے۔گلبدن کی یاد کی یہ خوشبو اس شاعر گلفام کے گلے کا ہار بھی بنی اور موثر وسیلہء اظہار بھی۔نتیجتاً رباعی کی ہئیت میں شخصی مرثیہ بعنوان'' گلبدن کی یاد میں'' تخلیق پایا۔یہ مرثیہ اردو کا اولین رباعی شخصی مرثیہ ہے۔

ایسا نہیں ہے کہ اِس سے قبل رباعی کے فارم میں شخصی مرثیہ نہ لکھا گیا ہو۔ظفر کمالی (بہار) نے اپنے بڑے بہنوئی خورشید عالم کی وفات پر نیز اپنے چھوٹے بہنوئی صدر العلیٰ کے انتقال پر شخصی مرثیے لکھے مگر یہ دونوں شخصی مرثیے محض نو نو رباعیات پر مشتمل ہیں۔

ڈاکٹر سلام سندیلوی کے مطبوعہ تحقیقی مقالے اردو رباعیات میں بھی رباعی کی ہیت میں قلم بند کیے گئے کسی شخصی رباعی مرثیے کا ذکر نہیں ملتا۔سلمیٰ کبریٰ کی کتاب انتخاب اردو رباعیات (آغاز تا حال) میں بھی کسی شخصی رباعی مرثیے کی نشاندہی نہیں کی گئی ہے۔

شبلی نعمانی نے شخصی مرثیے کا ذکر کرتے ہوئے اِس میں میت کی تعریف، تحسین، رنج وغم کے اظہار اور مخاطبانہ اسلوب کو اہم قرار دیا ہے۔علاوہ ازیں سیرت و کردار کا بیان، وفات کا ذکر، نوحہ اور دعائیہ کلمات کی شمولیت شخصی مرثیے میں ہوتی ہے۔

''گلبدن کی یاد میں'' کی رباعیات میں ان سب پہلوؤں کے رنگوں کی آمیزش فنی رچاؤ کے ساتھ کی گئی ہے۔لہٰذا یہ مرثیہ بجا طور پر اردو کا اولین شخصی مرثیہ کہلائے جانے کا استحقاق رکھتا ہے۔

اس مرثیے کی تمہیدی رباعی میں شاعر نے اس بات کی وضاحت کی ہے کہ گلاب کی چاہ رکھنے والا کانٹوں کے خلش سے بھی محظوظ ہوتا ہے۔

خوشبو کا حوالہ ہے یہ، اے شاہ! گلاب
کہتا ہے اسی واسطے دل، واہ گلاب
چاہت ہے اگر حسن کی ، کلفت ہے ضرور
ہے خار خلش لطف، مری چاہ گلاب

اس کے بعد خوشبو کی مہکار والے ان پر مسرت دنوں کا ذکر ملتا ہے۔ جو ساتھ ساتھ گذارے ہیں۔ بعدازاں مرحومہ کی علالت ، پھر علالت کا شدت اختیار کرنے کے سبب شاعر کی بے چارگی اور اضطرابِ مسلسل کا دل گداز اور فنکارانہ اظہار ہے اور پھر موت کی آہٹ کے بتدریج قریب ہونے کا یقین اور موت کے ذکر کا معنی خیز انداز کہ:

رخصت وہ گلبدن ہوئی آخر کو
ہے ربط مگر جیسے کہ ٹوٹا ہی نہیں

شاہ حسین نہری کی رباعیات کا یہ مجموعہ کیا ہے، مجروح قلب و روح کی دلدوز چیخ ہے ایوانِ رباعی کا دریچہ جب جب وا ہوگا، اِس درد بھری آواز کی بازگشت صاف سنائی دے گی۔

آواز تری گونجے، اجی نہری صاحب
ٹکرائے سماعت سے، اجی نہری صاحب
حیران و سراسیمہ میں لپکوں ہر سمت
بے سمت صدا آئے اجی نہری صاحب

میر تقی میر کی نگاہوں کے سامنے گویا عروسِ دلّی پابندِ سلاسل ہوئی، اسے دیوار میں چنوانے کے عمل سے گزارا گیا۔ پائے فیل سے روندے جانے کا ہولناک تماشا بھی ان کے سامنے ہوا اور تختہء دار پر لٹکائے جانے کا المناک منظر بھی انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ یہی وجہ ہے کہ ان کی شاعری کو دل اور دلّی کا مرثیہ کہا جاتا ہے۔

شاہ حسین نہری نے ہم نشین قلب و روح کو، گہوارہء محبت کے اس عزیز ترین آبگینے کو بے بسی اور بے

چارگی کے ساتھ موت کے آہنی ہاتھوں سے ٹوٹتے ہوئے دیکھا ہے۔اس مجروح پل نے شاہ کے ساتویں دہے کے نصیبوں میں صدیوں کا کرب لکھ دیا۔

مرجھائے ہیں گل فام،گل اندام افسوس
شادابیِ رخ رخصتِ انجام افسوس
مفلوج ہے،معذور ہے،بے بس،مجبور
یوں صبحِ حیات کی ہوئی شام افسوس

آنکھوں میں جمی ہے ویرانی کی گرد
جذبے سارے برف کے جیسے ہیں سرد
امیدیں اک،اک کر کے ڈوبی سب
چہرہ بھی خموش ،زباں بھی ہے زرد

شیشہء دل شاعر ٹوٹا،ٹوٹ کر زندگی کے دشت میں ٹکڑے ٹکڑے بکھر گیا۔اب طرفہ تماشہ یہ کہ ہر ٹکڑے میں گم کردہ ء اجل محبوب ، شانِ بے نیازی سے جلوہ نما ہے۔شیشہء دل کے یہ ٹکڑے پل پل زاویہ بدل رہے ہیں ۔اِس پل حسن کی جلوہ نمائیوں کا سماں کچھ اور ہے اور دوسرے لمحے کچھ اور

سناٹا پسرا یہ ہوا ہے ہر سو
آواز ہی یا بھول گئی اپنی خو
سناٹے کی یہ ہولناکی مجھ کو
ہر رُخ سے دکھائے ہے تیرا ہی رو

عورت اور مرد، زندگی کی گاڑی کے دو پہیے ہیں ۔زندگی کے اس رنگا رنگ ،معنی خیز اور پُر اسرار مرغزاروں کے سفر کو ملحوظ رکھتے ہوئے خالقِ کائنات نے ان دونوں شہکاروں کی تخلیق میں نمایاں تفریق رکھ دی ہے۔زندگی کے محور پر اِس پہیے کے گردش کرنے کے انداز اُس پہیے کے انداز سے مختلف ہیں ۔با اعتبار ساخت جائزہ لیجیے یا با اعتبارِ افعال،ایک دوسرے کا رفیقِ کار ہونے کے باوجود ان دونوں میں زمین آسمان کا بعد دکھائی دیتا ہے۔واقعہ یہ ہے کہ ایک سراسر زمین ہے اور دوسرا آسمان ۔ اِس سے حسن و جمال کے رنگ مترشح ہوتے ہیں تو اُس سے قوت اور رعب وجلال کی گھن گرج اور دھواں دھار بارش کا ہنگامہ۔ پھر بھی قانونِ فطرت نے ایک دوسرے کی

ضرورت قرار دیا ہے۔ زمین ہے کہ بشمول اپنے تحفظ کے جملہ ضروریات کی خاطر آسمان کا منہ تک رہی ہے اور آسمان ہمہ وقت ہر ہر پہلو سے زمین کو اپنی پناہ میں لیے ہوئے ہے۔ روز و شب کا نور بھی زمین کی خاطر اور گھٹاؤں کا سرور بھی اُسی کے نام۔

لہٰذا زندگی کی یہ گاڑی کسی ایک پہیے سے محروم ہو جائے تو زندگی کا سارا سفر بے معنی اور سارا معاشرتی نظام درہم برہم ہو کر رہ جائے۔ قدرت نے عورت مرد کو، اس زمین اور آسمان کو نہایت ہی لطیف ڈوری سے باندھ رکھا ہے اور اُس لطیف ریشمی ڈوری کا نام ہے محبت۔

جاں نثار اختر نے گھر آنگن کی رباعیات میں زمین آسمان کے اس والہانہ لگاؤ کو میاں بیوی کی محبت کے روپ میں دیکھا اور دکھایا ہے۔ ایک دوسرے کو ٹوٹ کر چاہنے والی ان دو شخصیات کی ہم سفری کی داستان کو ،شب و روز کے حالات و کوائف کو، جذبات و احساسات کو تمام تر جزئیات کے ساتھ بڑی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ ان رباعیات کے آئینوں میں ہندوستانی تہذیب کی پروردہ متوسط طبقے کی پتی ورتا ناری سکھ دکھ کے سائے میں بھر پور زندگی گذارتی نظر آتی ہے۔ اس حیثیت سے گھر آنگن کی رباعیات ،اردو کے شیریں لبوں پر بکھرے ہلکے سے دل آویز تبسم کے رنگوں کی جلوہ نمائی ہے۔

گلبدن کی یاد میں، ایک ایسا شعری مجموعہ ہے جس کی رباعیات کی حنابندی مرثیے کی آنکھ سے ٹپکے خون دل سے ہوئی ہے۔ شاہ حسین نہری کی یہ پُر اثر کاوش اردو کی آنکھ سے ٹپکا آب دار موتی ہے۔

عالمگیر ادب (اورنگ آباد) کے کتابی سلسلے ''شاہ حسین نہری، فن اور شخصیت'' میں اسلم مرزا ان رباعیات کو ''غم واندوہ کا مہذب اظہار'' کہتے ہوئے لکھتے ہیں کہ'' کلاسیکی لب ولہجے اور نئے تیور کی یہ تمام فکر انگیز رباعیاں شدید محبت کرنے والے ایک شوہر اور خلوص کی پیکر، پاک طینت اور پاک دامن بیوی کے مابین پاکیزہ رشتوں کی آفاقی صداقتوں کو اپنے جلو میں لیے ہوئے ہیں۔ ان رباعیوں میں فکر و احساس کی وہ مہذب حدت بھی ہے جو روح کی گہرائیوں سے سفر کرتے ہوئے خارجی تجربات اور مشاہدات کے حوالے سے رباعیوں میں فروزاں ہو گئیں اور جو پروقار دردمندی کی مظہر ہیں۔ شاہ صاحب کی تنہائی اور ان کی سب سے قیمتی متاع کے کھونے کا دکھ ان رباعیوں کے قاری کے ذہن و دل میں آنسوؤں کی لکیر بن کر اترتا چلا جاتا ہے۔''

میر ہو، اقبال ہو کہ جگر، ان سب کی زندگی میں عشق ایک بنیادی ضرورت ہے۔ عشق نے ان سب کے یہاں الگ الگ انداز سے رنگ آمیزیاں کی ہیں۔ عشق کے پر پیچ زینوں سے گزر کر ہی اُن کا فن اپنے کمال تک

پہنچا ہے۔اِس جراءت بے باک کی کرشمہ سازیوں کی کیفیات کے دیدہ زیب طلسمی قمقمے بجھ جائیں تو ان کا ایوانِ سخن اندھیرے میں ڈوب جائے۔شاعری کا یہ جمال اور یہ کمال سب عشق کی عطا ہے۔

شاہ حسین نہری کے یہاں ان کا گھر،ان کی جنت ہے۔اُن کی یہ جنت ایسی جنت ہے جس میں حور کا وجود ایک خصوصی اہمیت کا حامل ہے۔ان کی ازدواجی زندگی کا سارا حسن اور سارا جمال اسی ایک دلنواز شخصیت سے عبارت ہے۔کیوں نہ ہو کہ اسی وجود سے تصویرِ کائنات میں رنگ ہیں۔یہی وہ دلربا ہستی ہے جو زندگی کو محبت زار بنا دیتی ہے۔

شخصی مرثیے پرمبنی رباعیات کا یہ مجموعہ سرسبز و شاداب تخلیق کا ایک ایسا گہرا رواں دواں دریا ہے جس میں جگہ جگہ بھنور پڑتے ہیں۔جہاں جہاں بھنور پڑتے ہیں وہاں وہاں شاہ کی ازدواجی زندگی کے بیڑے کی غرقابی کا منظر اندوہناک ہوتا ہے،بڑا ہی اندوہناک!

یوں چھوڑ مجھے خوب گئیں آپ جناب
کیوں مجھ سے یوں اوب گئیں آپ جناب
ملتا ہوا میں ہاتھ بھنور میں ہوں پڑا
کیوں ہاتھ چھڑا ڈوب گئیں آپ جناب

پھر یہ بھنور تو ایسا کچھ پڑا کہ اس کی گردش کا تسلسل شاہ کے گلے کا طوق بن کر رہ گیا۔محبت کے اک تارہ کا تار ٹوٹا تو احساس کے نازک بدن پر بے شمار خراشیں ڈال گیا۔

نزدیکی تری مانگے ہے یہ قلبِ زار
چبھتے ہیں جو پہلو میں مری ہجری خار
میں ضبط کے انداز نبھاؤں کیسے
ہیں ہجر خراشیں یہ تری آتش بار

شاہ حسین نہری کے یہاں تخلیقی اپج آتش باری کے ماحول میں بھی تروتازہ گلاب کھلائے بغیر نہیں رہتی۔تعلق خاطر کا یہ تار ٹوٹا ضرور ہے مگر ربط ہے کہ قائم کا قائم رہا۔ہجر کے آتش بار لمحوں میں تصورِ جاناں کی یہ جاں گداز پھواریں کیسی من موہک ہیں!

اشکوں کے وسیلے سے دکھ بولیں نین
اس طرح سے آتا ہے دل کو کچھ چین

تصویر اُسی گلبدن کی مٹی بنتی

اشکوں میں لیے بیٹھے ہیں یہ شاہ حسین

قاعدہ یہ ہے کہ حنا کو جتنا جتنا پیسا جائے گا وہ اُتنا اُتنا رنگ لائے گی۔ دل کا معاملہ بھی کچھ ایسا ہی ہے۔ دل کو جتنا جتنا دبایا جائے گا، چھلنی کیا جائے گا، وہ اتنا ہی لہولہو ہوگا۔ جب دل لہولہو ہوکر آنکھ سے ٹپکا تو سمجھا گیا کہ یہ لہو غم کی کسوٹی پر پورا اتر آیا۔اس حقیقت کی ترجمانی غالب نے خوب کی ہے۔

رگوں میں دوڑنے پھرنے کے ہم نہیں قائل

جب آنکھ ہی سے نہ ٹپکا تو پھر لہو کیا ہے

زندگی شاہ اجل کے محاذ پر شکست کھا گئی۔اب شکست خوردہ شاہ، دل کی آنکھ سے آنسو بہائے جا رہا ہے۔ساون بھادوں جیسی جھڑیاں لگیں۔مگر اس ہنگامے پر گھر کی رونق موقوف ہونے کے باوجود مجال ہے کہ ویرانہء وجود میں کسی طرح کا کوئی شور سنائی دیا ہو، کسی نے اس بندہء خدا کی آنکھ پُرنم دیکھی ہو۔

دربارِ عام میں شاہ کی یہ انتہائی المناک کیفیت دیکھ کر ہر صاحبِ دل بے ساختہ بول اٹھے گا کہ

اُس شخص کے غم کا کوئی اندازہ لگائے

جس کو کبھی روتے ہوئے دیکھا نہ کسی نے

مگر واقعہ یہ ہے کہ راکھ کے ڈھیر میں شعلے ہی شعلے ہیں، چنگاریاں ہی چنگاریاں۔

جادو سا ہے میدانِ لق و دق باہر

اک چیخ مجھے واں سے بلائے اندر

آ جانا! اب آ جانا!! پکارے مجھ کو

تو رہ تو گیا ہے نہ آخر بے گھر

دھڑکن کی بھی آواز بنی ہے اب شور

سناٹے کا کچھ اور بڑھا جائے زور

یادوں کے بگولوں میں تری ہی صورت

اڑتا ہوں پتنگ سا میں ان میں بے ڈور

مٹی کے بے نظیر پتلے کے نطق کو اللہ نے کیسی غنائیت بخشی ہے، کیا حسن و جمال عطا فرمایا ہے۔ کہ درد کی

جھیل کے بھنور میں ڈوبا جا رہا ہے پھر بھی مسندِ گل پر تبسم کی پنکھڑیاں دائرہ در دائرہ سجانے سے باز نہیں آتا۔ فنکار کی یہی خوبی اسے اپنے معاصرین میں شانِ زیبائی اور ادبی معیار عطا کرتی ہے۔

''گلبدن کی یاد میں'' نہری کے قلبِ معصوم کا یہ نٹ کھٹ جل ترنگ بے ساختہ من موہ لیتا ہے۔

سناٹے میں تھی رات کے اُس کی آہٹ
ڈر سے وہ کسی شئے کے گئی مجھ سے لپٹ
اب لمس کہاں اس کا، کہاں اُس کا وجود
ہے شاہ ترا خواب بڑا ہی نٹ کھٹ

شاہ حسین نہری ایک مومنِ صادق کی حیثیت سے کُلُّ نَفسٍ ذَائِقَۃُ المَوت (ہر ذی نفس کو موت کا مزہ چکھنا ہے) اس آفاقی سچائی پر کامل یقین رکھتے ہیں۔ جہاں بہرحال راضی بہ رضا رہنا ان کا شیوہ ہے۔ وہیں جنّت میں ابدی وصال کی لذّتوں سے سرفراز کیے جانے کا یقین ان کے وجود کی دیوارِ شکستہ کا مضبوط سہارا بھی ہے۔

اللہ رہوں ہر دم راضی بہ رضا
ہے تیری عطا خاص یہ غم ہے جو ملا
وعدے پہ ترے خوش ہوں میرے اللہ
ملنا ہے وہاں جہاں رہیں ساتھ سدا

خرام کے لحاظ سے شاہانہ، کلام کے اعتبار سے فقیرانہ اور اندازِ خلق کی حیثیت سے مشفقانہ رویّوں کے سبب شاہ حسین نہری کی شخصیت وقار و انکسار کے حسین و جمیل رنگوں کا دل نواز مرقع بن گئی ہے۔ مزاج کا یہی حسین طمطراق ان کی شاعری میں بھی جا بجا دکھائی دیتا ہے۔ انہی اوصاف کے سبب ساعت کے محاذ پر شاہ اپنے قارئین کے دلوں کو فتح کرتے چلے جاتے ہیں۔

دل کی شکست کے مذکورہ بالا منظر نامے میں بھی ان کے قلم کی فتح کا راز یہی ہے۔

حوالہ جات:

(۱) اردو رباعیات از ڈاکٹر سلام سندیلوی
(۲) عالم گیر ادب کتابی سلسلہ نمبر ۳ شاہ حسین نہری فن اور شخصیت مدیر عارف خورشید اورنگ آباد دکن
(۳) رباعیات ظفر از ظفر کمالی، بہار
(۴) انتخاب رباعیات اردو (اول تا حال) از سلمیٰ کبریٰ

ہمایوں اشرف کے تنقیدی جہات

ڈاکٹر عاصم شہنواز شبلی

جدید تر نسل جو ۱۹۸۰ء کے بعد منظر عام پر آئی، وہ اپنے پیش روؤں سے قدرے مختلف تھی۔ اس نسل نے بنی بنائی عمارت کی بنیاد پر اپنے ذہن کو منجمد نہیں کیا اور نہ ہی اپنے پیش روؤں کی بنی بنائی تھیوریز کو اپنے اوپر مسلط کیا، بلکہ کھلے ذہن اور دماغ کے ساتھ تحریکات و رجحانات کا مطالعہ و محاسبہ کیا اور فن پارے کے معائب و محاسن کی جانب توجہ کرتے ہوئے، ان نکات کو سامنے لانے کی کوشش کی جو فن پارے میں موجود ہیں۔ اس نسل کے قلم کاروں نے بنے بنائے کلیشے اور اصولوں کے تحت شعر و ادب کو سمجھنے اور سمجھانے سے انحراف کیا اور متن کو بنیاد بنا کر مفہوم تک رسائی حاصل کرنے کی کوشش کی۔ ساتھ ہی اس نسل نے کلاسیکیت سے از سر نو استفادہ کرنے کا رجحان اپنے اندر پیدا کیا جس کے نتیجے میں غیر ضروری تجریدیت اور ابہام کا استعمال کمزور پڑنے لگا اور براہ راست گفتگو کا جذبہ سامنے آنے لگا۔ ایسا بھی نہیں کہ اس نسل نے اپنے پیش روؤں کو یکسر نظر انداز کر دیا بلکہ مناسب استقرار کے ساتھ ان کے افکار و محسوسات اور نظریات و خیالات سے استفادہ کرتے ہوئے اپنی تحریروں میں منعکس کیا۔ جدید تر نسل کے تنقید نگاروں کی ایک اچھی خاصی تعداد ہے جن پر آہستہ آہستہ اعتبار قائم ہوتا جا رہا ہے۔ اسی فہرست میں ایک نمایاں اور شناسا نام ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف ایک عرصے سے کاغذ اور قلم سے اپنا رشتہ بنائے ہوئے ہیں۔ بحیثیت مرتب اردو ادب میں اپنے نام اور کام کی وجہ سے کافی شہرت رکھتے ہیں۔ انہوں نے اردو ادب کے مختلف صاحب طرز قلم کاروں پر بڑی محنت اور عرق ریزی کے ساتھ کتابیں ترتیب دی ہیں، جن کی پذیرائی بھی ہوئی اور تعریف و توصیف بھی۔ آج کل یہ وبا بھی ہمارے یہاں عام ہوتی جا رہی ہے کہ کسی بھی شخصیت پر چند مضامین جمع کر لئے اور دو صفحے کا پیش لفظ لکھ کر کتاب تیار کر لی اور صاحب کتاب کی سند لے لی، لیکن ہمایوں اشرف قابلِ مبارک باد ہیں کہ انہوں نے اپنی بیس عدد ترتیب کردہ کتابوں میں تفصیل و طویل مقدمے لکھے ہیں، جس سے ان کی تحقیقی روش اور تنقیدی بصیرت کی سمت کا پتہ چلتا ہے۔ منٹو پر (آٹھ جلدوں میں) ان کی کتاب منٹو شناسی کے ضمن میں اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے اور اس کی حیثیت ریفرنس کی ہے۔

''متن اور مفہوم'' ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی اوّلین تنقیدی کتاب ہے جس میں مختلف موضوعات پر بیس تحقیقی و تنقیدی مضامین شامل ہیں۔ان مضامین کے مطالعے سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ہمایوں اشرف معاصر اردو تنقید کے ایک خود آگاہ اور وسیع المطالعہ ناقد ہیں۔وہ جس موضوع پر بھی قلم اٹھاتے ہیں، اسے اپنے مطالعے کی وسعت، ذہنی بصیرت اور سعیِ مسلسل سے صیقل کر دیتے ہیں جس کی وجہ سے ہر کوئی ان کے تنقیدی معیار و جہت کا قائل ہو جاتا ہے۔ہمایوں اشرف کا انفراد وامتیاز یہ بھی رہا ہے کہ انہوں نے ابتدا سے ہی بھیڑ چال سے خود کو بچائے رکھا ہے۔وہ اپنا ایک وژن، ایک ذہن اور ایک فکر رکھتے ہیں جو ان کی تحریروں کو روایتی اور فرسودہ ہونے سے بچالیتا ہے۔یہی وجہ ہے کہ اردو ادب میں ان کی حیثیت ایک ایمان دار اور فن شناس ناقد کے طور پر اُبھر کر سامنے آتی ہے۔

تنقید بڑا جان جوکھم کا کام ہوتا ہے۔اس دیار میں بھٹکنے اور لڑکھڑانے کے امکانات روشن رہتے ہیں۔ فن، فن پارہ اور فنکار پر بحث و تمحیص قائم کرتے وقت ناقد کی اپنی ذاتی پسند و ناپسند، اس کے تصوّرات و نظریات اور اس کی بصیرت و بصارت کے اثرات پڑنا یقینی ہوتا ہے لیکن ہمایوں اشرف طرف داری اور جانب داری کے حصار سے خود کو باہر رکھتے ہیں۔مقام و مرتبہ اور مراتب و شہرت کی طرف انہوں نے بھی نگاہ کی ہے لیکن ایک خاص حد تک اسے اہمیت دی ہے۔تنقید اور اس کے علمی و ادبی حیثیت کو متاثر ہونے نہیں دیا ہے۔ہمایوں اشرف ادب کی تفہیم و تعبیر، نظریات و رجحانات اور رویّوں کو سمجھنے کی خاطر ان کے مضمرات و امکانات تک رسائی حاصل کرتے ہیں۔ساتھ ہی وہ شاعری اور فکشن کی تنقید میں بھی اپنے قلم کی جولانی دکھاتے ہیں۔سب سے اہم بات یہ ہے کہ وہ ہر جگہ معروضی اور تجزیاتی انداز اپناتے ہیں۔موضوع کوئی بھی ہو، وہ اس موضوع کے مواد اور اس کے ابعاد و جہات پر ذہنی آزادی اور وسیع النظری کے ساتھ متوازن اور مدلل گفتگو کرتے ہیں۔اس پر مستزاد یہ کہ زبان و بیان کی لطافت سے مملو رواں دواں اور شگفتہ و برجستہ نثر قارئین کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔ان کی تنقید میں افراط و تفریط اور سطحیت و شوقیت نہیں ہوتی ہے بلکہ فکری نکتہ ریزی، علم کی گہرائی اور فنّی توازن ان کے بنیادی لوازمات بنتے ہیں جس نے ان کی تنقید کو ایک خاص انفرادیت کا نمائندہ بنا دیا ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے نظریاتی و رجحاناتی سطح پر جہاں ایک طرف ''مارکسیت اور نئی مارکسیت'' پر گفتگو کی ہے تو دوسری طرف 'حلقۂ ارباب ذوق کی خدمات اور متعلقہ فنکار'' کا تدبر و تعقل کے ساتھ جائزہ لیا ہے۔''جدیدیت: ایک محاکمہ'' پر اگر عالمانہ نکتہ رسی کے ساتھ معروضی گفتگو کی ہے تو ''مابعد جدیدیت: تفہیم و تعبیر'' کے امکانات کا تجزیہ بھی کیا ہے۔یہ اس بات پر دال ہیں کہ ہمایوں اشرف کلاسیکی ادب و نظر کے ساتھ ساتھ نئے

ادبی منظرنامے سے بھی باخبر ہیں اوران مضمرات، ممکنات اورامکانات پر بھی نظر رکھے ہوئے ہیں۔ گویا وہ لکیر کے فقیر نہیں ہیں اوراپنے شوق وشغف کو متحرک رکھتے ہیں۔اس ضمن میں ہمایوں اشرف نے سنجیدہ اور عالمانہ گفتگو کی ہے۔ جارحانہ اور غیر جانبدارانہ رائے دینے سے گریز کیا ہے۔نظریات ورجحانات کے حوالے سے جہاں فیصلہ کن تجزیہ وتحلیل کے مرحلے آئے ہیں، وہاں انہوں نے اپنے کیف وکم کے اعتبار سے اس کے حدود و مسائل اور امکانات واشارات پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔توازن وتناسب اوراعتدال واعتبار سے تنقیدی نتائج بھی اخذ کئے ہیں۔اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ ہمایوں اشرف پرانی ادبی تحریکات وسرگرمیوں کے معائب ومحاسن سے باخبر ہوتے ہوئے جدیداورجدیدترین رجحانات اورتھیوریز کے منفی ومثبت رویّوں سے بھی آگاہ ہیں۔گویا وہ اپنے علمی وادبی سفر کو کسی مخصوص مقام پر روکنا نہیں چاہتے ہیں۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ ہمایوں اشرف ادبی منظرناموں اور ادبی نگارشات کی واقفیت میں اپنے ہم عصروں میں قدرے نمایاں ہیں۔

ہیئت اور مواد کا باہمی رشتہ، متن اور مفہوم کا مسئلہ، سیاست اور شاعری، فرائڈ کا نظریۂ لاشعور اور تحلیل نفسی، جنسی علم اور متعلقہ اظہارات، نسائی بیداری اور متعلقہ تحریک وغیرہ ایسے ادبی مسائل ہیں، جن کی طرف ہمارے لکھنے والوں نے کم کم توجہ دی ہے۔ ڈاکٹر ہمایوں اشرف نے نئے نئے موضوعات کی تلاش کی ہے، ان پر غور و فکر کیا ہے اور پھر ایک ہمہ گیر مقالے کی تحریر کی ہے جس میں توازن، گہرائی اور علمی بلندی ہوتی ہے۔ان کا ذوق نظر تماشائی نہیں ہے بلکہ تجزیاتی ہے۔وہ کسی بھی شئے کی حقیقت کو جلد سمجھ لیتے ہیں لیکن فوراً ہی اس پر قلم نہیں اٹھاتے ہیں بلکہ ان پر قدرے تفصیل سے مطالعہ ومحاسبہ کرتے ہیں اور پھر کافی سوچ سمجھ کر اپنا مطمح نظر ظاہر کرتے ہیں۔ان مضامین میں بھی ہمایوں اشرف نے بڑے انہماک اور عرق ریزی کے ساتھ فکر انگیز، گراں قیمت اور معنی آفریں گفتگو کی ہے اوراپنی تنقیدی فراست وذکاوت کا ثبوت دیا ہے۔ان تمام مضامین میں کوئی نہ کوئی ایسا نکتہ ضرور مستور ہے، جن پر ڈسکورس بھی ہوسکتا ہے اور نئے مباحث کے در بھی وا ہو سکتے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ ہمایوں اشرف نے ان موضوعات پر قلم اٹھا کر نہ صرف اس کا حق ادا کیا ہے بلکہ اپنی نسل کو اس کی بھی دعوت دی ہے کہ وہ ان موضوعات کی طرف بھی نگاہ کریں اوراپنے علمی اطراف کو وسعت دیں۔ ''نسائی بیداری اور متعلقہ تحریک'' ہمایوں اشرف کا قابل قدر اور قابل مطالعہ مضمون ہے لیکن یہ مضمون تھوڑا اور تفصیل کا متقاضی تھا۔اس کے باوجود یہ مضمون ان کے ذہنی آفاق کا پتہ دیتا ہے۔اس میں انہوں نے تحقیق وتنقید کا آمیزہ پیش کیا ہے۔انہوں نے نسائی تحریک اور اردو میں نسائیت کے حوالے سے مختلف امور کو دلیل و براہن اور شائستگی و شستگی کے ساتھ سمیٹنے کی سعی کی ہے۔ کہیں

کوئی دعویٰ نہیں کیا ہے لیکن سیاق وسباق اور بین السطور اس پس منظر کا حوالہ بنتے رہے ہیں۔ تعجب ہوا کہ ہمایوں اشرف نے رفیعہ شبنم عابدی، شفیق فاطمہ شعریٰ، ثمینہ راجا، منصورہ، صوفیہ انجم تاج، شگفتہ طلعت سیما، پروین شیر، پنہاں وغیرہ کا ذکر نہیں کیا ہے جبکہ ان کے یہاں نسائی شعور کی ترجمانی بھرپور ہے اور ہم عصر منظرنامے پر انہیں اعتبار حاصل ہے۔ لیکن اس کے باوجود اس مضمون کی اہمیت سے انکار ممکن نہیں۔ یہ اقتباس ملاحظہ کریں اور ہمایوں اشرف کی نظر کی داد دیں:

''نسائی تحریک The Personal is Political کی پُر زور حمایت کرتی ہے۔ اس تصور کی ابتدا مرد کا جبر، جنس کی بنیاد پر عورتوں کی ثانوی حیثیت، صنفی تفرقہ، استحصالی رشتے، ظلم، حق، وراثت، شخصی آزادی کے محرکات سے ہوئی۔ اس تحریک کے ذریعہ خواتین نے روایتی سماج سے مرد اور عورت کی سماجی، تہذیبی و مذہبی حیثیت کے متعلق بہت سے سوالات کئے اور ان وجوہات کو تلاش کرنے کی سعی کی، جن کی بنا پر صدیوں سے عورت محکوم و مظلوم چلی آرہی ہے۔ نسائی تحریک کا ہیولیٰ اگرچہ پہلے پہل مغرب میں تیار ہوا اور وہیں اسے فروغ حاصل ہوا لیکن آج ساری دنیا کے ادب پر اس کے واضح اثرات نظر آتے ہیں''۔

(نسائی بیداری اور متعلقہ تحریک)

پھر آگے لکھتے ہیں:

''نسائی تنقید میں عورت کے نجی اور سماجی مسائل پر عورت ہی کے نظریے سے روشنی ڈالی جاتی ہے کیونکہ ان کے ذہن اور مسائل تک ہر نقاد کی رسائی نہیں ہوسکتی۔ خواتین کی فکر کی اپنی سرحدیں ہیں، جنہیں وہ خود پار کرسکتی ہیں۔ روایتی نقادوں نے جو کچھ ان کے بارے میں لکھا ہے، وہ محض خام خیالی ہے جو ان کی اپنی بنی بنائی ہوئی مصنوعی فکر کے نتیجے میں وجود میں آئی ہے۔ اسی لئے خواتین نے نسائی تنقید یعنی Gynocriticism کو ایک مکمل آزادانہ فکری عمل قرار دے دیا ہے۔ نسائی تنقید کی علم بردار خواتین نقاد Gynocriticism کو انفرادی موضوع کے طور پر اہمیت دیتی ہیں اور بڑی حد تک اپنی فکر میں منطقی نظر آتی ہیں''۔

(نسائی بیداری اور متعلقہ تحریک)

اس کے علاوہ افسانے کے حوالے سے بھی ان کے پانچ مضامین شامل ہیں۔ ''افسانے کا فن''،

''افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ''، ''سعادت حسن منٹو کی ہمہ گیری''، ''غیاث احمد گدی کا افسانہ کوئی روشنی'' اور ''عبد الصمد کا افسانہ نجات کا تجزیاتی مطالعہ'' اختصاصی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے مطالعے سے یہ بات بآسانی کہی جا سکتی ہے کہ ہمایوں اشرف کو فکشن سے بھی اچھا خاصہ لگاؤ ہے۔میرا خیال ہے کہ اگر وہ صرف فکشن پر توجہ دیں تو اپنی ژرف بینی، قوت استدلال، وژن اور نتائج اخذ کرنے کی صلاحیت کی وجہ سے فکشن کو نئے تنقیدی جہات سے آشنا کرا سکتے ہیں۔انہوں نے اوّل الذکر دو مضامین میں افسانے کی تکنیک، اسلوب، موضوعات پر گہری نظر رکھتے ہوئے سیاسی وسماجی، تہذیبی وثقافتی اور ادبی پس منظر کا بھی بہ غائر مطالعہ کیا ہے۔ان میں ہمایوں اشرف کے مزاج و منہاج کی سنجیدگی کو محسوس کیا جا سکتا ہے۔ان کے گہرے مطالعے، گہرے علمی استعداد اور منطقیانہ بحث و تمحیص نے ان کی تحریروں کو استدلالی رجحان و میلان کا حامی بنا دیا ہے۔افسانہ میں کہانی پن کا مسئلہ کے حوالے سے ہمایوں اشرف ایک خاص تدلل و تعقل کے ساتھ اپنی باتیں منوانے کی کوشش کرتے ہیں اور اس میں کامیاب بھی ہوتے ہیں:

> ''داستانوں، ملفوظات، احادیث، قرآن، کتھا، حکایت، ضمیات کی مدد سے جو افسانے لکھے جا رہے ہیں، وہ بہترین تخلیقی قوت کا ثبوت بھی پیش کر رہے ہیں اور دوسری طرف ادنیٰ درجہ کے فنکاروں کی رسوائی کا بھی باعث ہیں۔ چنانچہ یہ غوغا کہ افسانے میں کہانی پن کا عنصر لازمی ہے، ایک بیکار سی بحث ہے۔علامتیں اگر سمجھ میں نہیں آتی ہیں اور اس بنا پر کسی کے ذہن میں کہانی پن پیدا نہیں ہوتا تو اس میں نہ تو فنکار کا قصور ہے، نہ تو علامت کا۔ بلکہ قصور اس ذہن کا ہے، جسے ابھی ارتقائی منزل طے کرنی ہے۔ دلچسپ امر یہ ہے کہ بہت سے عوامل، محرکات، فنکارانہ اسلوب، فلسفیانہ اور نفسیاتی امور سے ہمارے یہاں عدم آگہی ہمیں مجبور کرتی ہے کہ ہم اپنے احساس کمتری کا مظاہرہ ان کی اہمیت کے انکار سے کریں۔ ورنہ سچی بات تو یہ ہے کہ جس طرح نئے افسانے نے فنی طور پر کروٹیں لی ہیں، ان کے عملی تجزیے کی ضرورت ہے نہ کہ ان سے دور بھاگنے کی''۔ (افسانے میں کہانی پن کا مسئلہ)

اسی طرح ہمایوں اشرف نے غیاث احمد گدی کے افسانے ''کوئی روشنی'' اور عبدالصمد کا افسانہ ''نجات'' کا تجزیہ بھی تہذیبی ادب اور آداب کے ساتھ کیا ہے۔ ہمایوں اشرف نے ان افسانوں کے بطون میں داخل ہو کر ان کی تجسیم و تفہیم اور تقلیب و تحسین ہنرمندانہ طریقے پر کی ہے نیز فن پاروں اور فنکار کے امتیازات کو واضح کیا ہے۔یہ تجزیہ بامعنی اور تنقیدی بصیرت کا حامل ہے۔انہوں نے اپنے تجزیے میں مانگے کے اجالے سے کام نہیں لیا ہے بلکہ

انہوں نے ٹھوس اور مدلل انداز میں اپنے دعوے کو اپنی اصابتِ فکر پر رکھا ہے اور ہر جگہ معروضیت کا سہارا لیا ہے۔ اس سے ان کی علمی و ذہنی استعداد کا بخوبی اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ کتاب میں شامل دیگر مضامین بھی اپنی اہمیت منوانے کی قوت رکھتے ہیں۔ اپنے موضوع کے بارے میں وہ ضرور کوئی ایسا نکتہ رکھتے ہیں جس سے مضامین کی افادیت و معنویت بڑھ جاتی ہے۔

''فکشن کی بازیافت'' ہمایوں اشرف کی دوسری اہم تنقیدی کتاب ہے۔ اس کتاب میں فکشن، فکشن نگار اور فکشن تنقید کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے۔ گویا یہ کتاب فکشن کی بازیافت کی ایک مضبوط کڑی کی حیثیت سے ہمارے سامنے آتی ہے جس میں فکشن کی تفہیم اور ہمایوں اشرف کے فکری وفنی ابعاد و جہات کو دیکھا جا سکتا ہے۔ ''فکشن کی بازیافت'' ۲۴ مقالات کا مجموعہ ہے جو ایک گراں قدر تحفے کی شکل میں ادبی دنیا کے سامنے پیش ہوا ہے۔ اس کتاب میں ہمایوں اشرف کی سنجیدگی، ذمہ داری، ذہانت، پختگی، شعور، درک، محنت اور لگن بہ آسانی دیکھی جاسکتی ہیں اور یہی مطالعۂ ادب کا ماحصل کی صورت میں ہمارے سامنے آتا ہے۔

''فکشن کی بازیافت'' کی محتویات پر نظر ڈالنے سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ان میں نہ صرف موضوعات کی فراوانی ہے بلکہ تنوع اور تازگی بھی ہے۔ مزید برآں جن موضوعات کا احاطہ کیا گیا ہے یا جن نکات کو پیش کیا گیا ہے، ان پر ڈسکورس بھی ہوسکتا ہے اور مباحث کے دروازے بھی کھل سکتے ہیں۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ہمایوں اشرف نے جلد بازی میں یا رواروی میں کچھ نہیں لکھا ہے بلکہ موضوع کے متعلق اپنی معلومات اور علم میں اضافہ کیا ہے اور موضوع کا پورا حق ادا کرنے کی کوشش کی ہے۔ ذہنی آزادی، وسیع النظری، معروضیت، اختراعی و تجزیاتی انداز اور تنوع پسندی ہمایوں اشرف کی تنقید کے ٹولز ہیں جس کے حوالے سے وہ غور و فکر کی نئی راہیں ہموار کرتے ہیں اور اپنی گفتگو کو عالمانہ نکتہ رسی اور عالمی مطالعہ تک لے جاتے ہیں۔

ہمایوں اشرف بنیادی طور پر ترقی پسند افکار و نظریات کے حامی نظر آتے ہیں لیکن وہ غالی ترقی پسند کبھی نہیں رہے۔ انہوں نے ہمیشہ کھلے ذہن کے ساتھ تمام نظریات و رجحانات کا مطالعہ و مشاہدہ کیا اور سکّہ بند روایتی نقطۂ نظر سے انحراف کرتے ہوئے اپنا ایک ذہن ترتیب دیا۔ وہ نئے علوم، نئے ادبی رویّے اور نئے رجحانات و میلانات کی خبر رکھتے ہوئے ان کی تفصیلات سے آگاہ ہوتے رہتے ہیں اور اپنے علمی اطراف و اکناف کو وسعت دیتے رہتے ہیں۔ انہیں اس کا بخوبی علم ہے کہ جب تک ادب کا انسلاک عام طبقے سے نہیں ہوگا، اس میں وسعت و مقبولیت نہیں آئے گی۔ چند اذہان و اشخاص کے لئے لکھا جانے والا ادب، محدود و محصور ہو کر رہ جاتا ہے۔ اسی لئے

ہمایوں اشرف ''نئی ترقی پسندی'' کے مثبت افکار وعقائد کی بھرپور نمائندگی کرتے نظر آتے ہیں جس کا انعکاس ان کی دونوں کتابوں پر پڑتا دکھائی دیتا ہے۔

''فکشن کی بازیافت'' میں جہاں قاضی عبد الستار کے ناولوں سے گفتگو ہے، وہیں جمیل مظہری کے ناولٹ سے بھی بحث کی گئی ہے۔ اگر ایک طرف منٹو کے ناول کا تجزیہ کیا گیا ہے تو دوسری طرف الیاس احمد گدی کے ''فائر ایریا'' کا ناقدانہ جائزہ لیا گیا ہے۔ خواجہ احمد عباس، غیاث احمد گدی، قرۃ العین حیدر، شین مظفر پوری، سید محمد محسن، وہاب اشرفی، منظر کاظمی، شفیع مشہدی کی افسانہ نگاری کے اختصاص وامتیاز پر بھی روشنی ڈالی گئی ہے۔ اسی طرح انور امام، رحمٰن شاہی، بلند اقبال، اختر آزاد اور کہکشاں پروین کے افسانوی میلان ومزاج سے بھی ایک نئے انداز میں واقفیت کرائی گئی ہے۔ منٹو اور سہیل عظیم آبادی کے ڈرامے اور ریڈیائی ڈرامے بھی زیر بحث آئے ہیں۔ ساتھ ہی اپنے معاصرین کی نظر میں منٹو، وارث علوی کی منٹو شناسی، گوپی چند نارنگ کی فکشن تنقید اور افسانوی ادب جیسے موضوعات پر بھی سیر حاصل عالمانہ گفتگو کی گئی ہے۔ ہمایوں اشرف، منٹو پر کئی جلدوں میں کلیات مرتب کر چکے ہیں اور انہیں منٹو پر دسترس حاصل ہو چکی ہے۔ اس لئے کتاب میں منٹو کے حوالے سے انہوں نے چار مضامین شامل کئے ہیں۔ چاروں مضامین سنجیدگیٔ فکر کے ساتھ اپنے موضوع سے انصاف کرتے ہیں اور ہمایوں اشرف کے وسیع مطالعے کے ضامن ہیں۔ بالخصوص منٹو کی ڈراما نگاری پر ہمایوں اشرف نے جو تنقیدی جائزہ پیش کیا ہے، وہ دعوتِ غور وفکر دیتا ہے۔

ہمایوں اشرف کے تمام مضامین پڑھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ ''قاضی عبد الستار کے دو ناول''، ''سہیل عظیم آبادی کی ڈراما نگاری''، ''جمیل مظہری کی ناول نگاری''، ''الیاس احمد گدی کا تخلیقی جہاں''، ''شفیع مشہدی کی افسانہ نگاری''، وراث علوی اور ان کی منٹو شناسی''، ''گوپی چند نارنگ اور ان کی فکشن شعریات۔ ''تشکیل و تنقید: ایک مطالعہ'' اور ''افسانوی ادب: تحقیق وتجزیہ'' وغیرہ ایسے مضامین ہیں جو ہمایوں اشرف کی ذہنی بلوغیت اور ان کی فکر کی خبر دیتے ہیں۔ ان مضامین میں تفکّر بھی ہے اور تجزیہ بھی، تفہیم بھی ہے اور تحلیل بھی۔ پروفیسر گوپی چند نارنگ نے ادب کی مختلف اصناف اور موضوعات پر کھل کر گفتگو کی ہے اور تلاش وتحقیق، تشریح وتنقید، تجزیہ وتحلیل اور افہام وتفہیم کے ذریعہ اعلیٰ ادبی ذوق اور ذہن کی آبیاری بھی کی ہے نیز اردو تنقید میں فکشن تنقید کا باضابطہ ڈسکورس بھی قائم کیا ہے۔ ہمایوں اشرف نے گوپی چند نارنگ کی فکشن تنقید کا تجزیاتی مطالعہ ہنر مندی کے ساتھ کیا ہے اور ان کے اختصاصی پہلوؤں کو فنکاری کے ساتھ نمایاں کیا ہے۔ یہ اقتباس دیکھیں:

''نارنگ نے اردو فکشن پر گراں قدر کام کیا ہے۔ نارنگ نے فکشن شعریات کی تشکیل میں جو نمایاں کردار ادا کیا ہے، اس سے اردو دنیا اچھی طرح واقف ہے۔ انہوں نے ادبی تھیوری اور معاصر منظر نامے کے حوالے سے فکشن تنقید کے مسائل و میلانات پر بڑے عمدہ مضامین قلم بند کئے جس سے اردو تنقید میں فکشن شعریات یا بیانات کے نئے جہات اور میلانات روشن ہو جاتے ہیں۔ ناول اور افسانے کے مسائل، امکانات اور نظری و عملی مباحث پر بھی انہوں نے سیر حاصل گفتگو کی ہے۔ اس سلسلے میں وہ اپنے پسندیدہ ادیبوں کو نظر میں رکھتے ہیں اور ان کی خصوصیات سے قاری کو روشناس کرانا نہیں بھولتے''۔

(گوپی چند نارنگ اور ان کی فکشن شعریات۔تشکیل و تنقید: ایک مطالعہ)

ہمایوں اشرف نے اسی طرح کم و بیش ہر جگہ غیر جانب داری، فکری آزادی اور بے باکی کے ساتھ صداقت کا اظہار کیا ہے۔ انہوں نے اپنی تنقید میں محض حاشیہ آرائی سے کام نہیں لیا ہے بلکہ فکری نکتہ ریزی کے جواہر خاص کو اپنا نصب العین بنایا ہے اور یہی ان کے فکرِ انتقاد کی شناخت میں آسانی پیدا کرتی ہے۔

ڈاکٹر ہمایوں اشرف کی زبان میں کوئی ابہام اور پیچیدگی نہیں ہے۔ وہ مشکل نکات کو بھی اپنے طلسمی اسلوب میں سمیٹنے کا فن جانتے ہیں۔ لہجے کی تازگی، سادہ بیانی، شگفتہ و برجستہ نثر ان کی تحریروں میں مزید دلکشی اور حسن پیدا کر دیتی ہیں جو قاری کو اپنی گرفت میں لئے رہتی ہے۔ ان کی تحریریں جامد اور ساکت نہیں ہیں اور یہی ان کی کتاب کو باوزن و باوقار ٹھہراتی ہیں۔ میں اپنی گفتگو کو پروفیسر لطف الرحمٰن کے اس جملے پر ختم کرتا ہوں:

''ان کا (ہمایوں اشرف) خلوص، ان کی محویت اور ان کی ایمان داری اس بات کی ضمانت ہے کہ وہ اردو نقاد کی حیثیت سے وعدۂ فردا کا مرتبہ رکھتے ہیں''۔

اردو زبان ہی نہیں ایک تہذیب کا نام ہے

شمیم قاسمی سے مکالمہ : مختصر تعارف

انور آفاقی

معاصر اردو شعر وادب کے ایک بے حد ذہین، حساس دل اور طرحدار تخلیق کار کا اصل نام شمیم الدین احمد علی اور والد کا نام نصیر الدین احمد علی اور قلمی نام شمیم قاسمی ہے۔ ہر چند کہ انہوں نے افسانے بھی لکھے ہیں لیکن میں انہیں ایک البیلے اور باغی شاعر کے طور پر زیادہ جانتا ہوں۔ لوگ کہتے ہیں وہ مُوڈیل فن کار ہیں، اپنی شرطوں پر جیتے ہیں اور ملنے جلنے کے سلسلے میں ان کے اپنے تحفظات ہیں۔ یعنی بقولِ شاعر۔

ملنے جلنے کا سلیقہ ہے ضروری ورنہ

آدمی چند ملاقاتوں میں مر جاتا ہے

بہر حال ادبی طور پر میں انہیں تقریباً تیس برسوں سے جانتا ہوں۔ ۱۹۷۰ء کے دہے میں مختلف ادبی رسائل و جرائد میں ان کی ادبی کاوشوں کی اشاعت ہوتی رہی ہے۔ کئی دفعہ ہم دونوں کی تخلیقات ایک ہی رسالہ میں ساتھ ساتھ شائع ہوئیں۔ ماہنامہ ''روبی'' کا وہ شمارہ آج بھی میرے پاس محفوظ ہے جس میں ان کی نظم ''وہ لڑکی'' شائع ہوئی تھی۔ میری برسوں سے دیرینہ خواہش تھی کہ ذاتی طور پر میں ان سے ملوں اور یہ مبارک ساعت کشمیر کا سفر طے کرنے کے لیے پٹنہ سے فلائٹ پکڑنے کی صورت میں آئی جس کی تفصیل میں نے اپنی کتاب ''دیرینہ خواب کی تعبیر'' میں لکھی ہے پھر بھی شمیم قاسمی کو شخصی طور پر جاننے کے لیے میں نے یہ ضروری سمجھا کہ متذکرہ کتاب سے چند سطریں یہاں قلم بند کردوں: .....

''منصور (خوشتر) نے بتایا کہ ہم سب سبزی باغ چلیں گے، وہاں کھانا کھائیں گے اور پھر بک امپوریم سبزی باغ میں شمیم قاسمی کا دیدار کریں گے۔

ہم بک امپوریم سبزی باغ پہنچے جو ہوٹل سے بمشکل سوفیٹ کے فاصلے پر تھا۔ وہاں معلوم ہوا کہ شمیم بھائی گھر سے نکل چکے ہیں چند منٹوں میں پہنچنے والے ہیں۔ کچھ ہی دیر میں شمیم قاسمی اپنے لبوں پر مسکراہٹ بکھیرتے ہوئے سامنے حاضر ہوئے..... شمیم بھائی سے ادب وشعر پر گفتگو ہونے لگی..... چھ بج چکے تھے، لہٰذا ہوٹل سے نکلے، بک امپوریم پر چند منٹ رکنے کے بعد ہم لوگ (منصور خوشتر، انتخاب ہاشمی اور خاکسار) شاہراہ پر آ گئے۔ شمیم بھائی سراپا خلوص ومحبت بنے ہمارے ساتھ تھے۔ پھر خود ہی آٹو لینے سڑک کی طرف چلے گئے اور آٹو لے کر

آئے اور ہم سب کو اس میں بٹھایا۔سفر کی کامیابی اور سلامتی کی دعائیں دیں۔ہم ایئرپورٹ کی طرف روانہ ہوگئے مگر آنکھوں میں شمیم بھائی کا چہرہ اپنی تمام تر معصومیت کے ساتھ جلوہ افروز تھا۔ میں سوچتا رہا کہ آج بھی اتنے شریف النفس اور محبت کرنے والے لوگ موجود ہیں۔شاید ایسے ہی نیک صفت لوگوں کی وجہ سے شرافت کا بھرم باقی ہے۔رخصت ہوتے ہوئے اپنی محبت وخلوص اور اپنا پن سے ایسا مقروض کردیا کہ ان کے لیے دل کی عمیق گہرائیوں سے دعائیں نکلتی ہیں۔اللہ اس قدر محبت کرنے والے شمیم قاسمی (بھائی) کو سلامت رکھے،ان کی عمر دراز کرے۔

''شمیم قاسمی یکم جنوری ۱۹۵۴ء (بہ اعتبار سند) میں شیر شاہ سوری کی جنت سہسرام میں پیدا ہوئے۔ایم اے اردو، پی ایچ ڈی کی سندیں حاصل کیں،محکمہ تعلیم بہار میں اسسٹنٹ سکریٹری کی ملازمت کے بعد اب ریٹائر ہو چکے ہیں۔'' (دیرینہ خواب کی تعبیر:صفحہ ۱۹)

یہ سبھی جانتے ہیں کہ شمیم قاسمی ادبی گروہ بندی، ریاکاری اور چاپلوسی سے کوسوں دور ہیں۔وہ ادب اور زندگی کے باہمی رشتوں،اعلیٰ اور روایتی قدروں کا احترام ضرور کرتے ہیں لیکن لکیر کے فقیر ہرگز نہیں۔ان کا شخصی تعارف کراتے ہوئے عہد ساز ناقد پروفیسر وہاب اشرفی نے بھی اس کا اعتراف کیا ہے کہ :

''شمیم قاسمی میرے ساتھ عزیزوں کی طرح رہتے ہیں۔ان کا رویہ انتہائی مخلصانہ ہوتا ہے۔بہار انٹر میڈیٹ کاؤنسل میں وہ اعلیٰ عہدے پر فائز رہے ہیں۔جہاں میں چند سال پہلے چیئرمین تھا۔اس وقت مجھ سے قربت اور بڑھی لیکن انہوں نے مجھ سے کوئی فائدہ نہیں اٹھایا اور ایک صالح ورکر کی طرح اپنا کام انجام دیتے رہے۔حالانکہ شعروادب کے حوالے سے وہ مجھ سے قریب تر ہو سکتے تھے۔شمیم قاسمی اپنی شاعری میں لفظوں کا ایک خاص طریقے سے استعمال کرتے ہیں۔ اس ضمن میں ان کا رویہ وہی ہے جو ظفر اقبال کا ہے.....شمیم قاسمی نخوت نہیں پالتے۔ ملنے ملانے میں فطری انداز ہوتا ہے۔اپنے آپ پر ملمع نہیں چڑھاتے۔لہٰذا ہر ملاقات میں کوئی نہ کوئی نقش چھوڑ جاتے ہیں لیکن شاید مُوڈی ہیں اس لیے کہ کبھی ملاقات کے سلسلے میں مسلسل تکلیف اٹھاتے ہیں تو کبھی مہینوں غائب ہوجاتے ہیں۔پتہ نہیں ان کے ساتھ ایسا کیوں ہے۔

(قصہ بے سمت زندگی کا:وہاب اشرفی۔صفحہ:۲۴۸)

گزشتہ دو دہے میں شمیم قاسمی کے منفرد ڈکشن اور ان کی دیگر ادبی سرگرمیوں کے حوالے سے کئی اہم دانشوران ادب نے اپنے تاثرات/مضامین قلم بند کیے ہیں ان میں شمس الرحمٰن فاروقی،وہاب اشرفی،وارث علوی،صغریٰ مہدی ،پروفیسر طرزی (منظوم تنقید)،پروفیسر طلحہ رضوی برق،ارمان نجمی،ڈاکٹر مولا بخش،حقانی

القاسمی، شہاب ظفر اعظمی، اظہار خضر، خورشید اکرم اور ڈاکٹر آفاق عالم صدیقی وغیرہم کے نام لیے جا سکتے ہیں۔مزید تفصیل میں جائے بغیر میں آج ان کے روبرو ہوں۔ چند رسمی سوالات کے ساتھ۔میرے حسب ذیل انٹرویو میں شمیم قاسمی مزید کھل کر سامنے آئے ہیں۔ (انور آفاقی)

انور آفاقی: آپ نے قلم اور قرطاس سے کب دل لگایا؟

شمیم قاسمی: شکریہ آفاقی صاحب کہ آپ نے خاکسار سے ایک انٹرویو کا وقت مقرر کیا۔آپ کا پہلا سوال بہت عام سا ہے جس کے جواب میں کہنا چاہوں گا کہ بچپن بلکہ زمانۂ طالب علمی سے ہی میری اردو زبان وادب سے گہری وابستگی رہی ہے۔ظاہر ہے کہ جم کر مطالعہ کیا تو طبیعت لکھنے پڑھنے پر آمادہ ہوئی ۔۶۹-۱۹۶۸ء کے درمیان میں بچوں کے لیے کہانیاں لکھنے لگا تھا۔ٹوٹے پھوٹے اشعار بھی کہنے کی کوشش کرتا رہا۔ میں نے جس شہر میں آنکھیں کھولیں یعنی شیر شاہ کی نگری سہسرام یہاں کا ماحول شروع ہی سے شاعرانہ رہا ہے۔میرے اطراف کا ماحول بھی ادبی رہا۔اور اب تو یہ عالم ہے:

کتابیں ہیں قلم ہے اور میں ہوں
متاع دردو غم ہے اور میں ہوں
کہاں جا کے میں اپنا سر چھپاؤں
زمانے کا ستم ہے اور میں ہوں

انور آفاقی: آپ کی پہلی تخلیق کیا تھی اور کہاں شائع ہوئی؟...اشاعت کے بعد کیسا محسوس کیا....؟

شمیم قاسمی: سچ پوچھیے تو میری پہلی تخلیق نثری تھی۔ پھوپھی جان سے میں نے بچپن میں نیند کی کیفیت میں جاتے ہوئے جن اور پریوں کی کہانیاں سنی تھیں ان میں سے ایک کو اپنی زبان میں کاغذ پر اتار دیا تھا۔ پھر اس کہانی کا عنوان میں نے ''سفید گھوڑا'' رکھا تھا جو اپنے زمانے کے مشہور بچوں کے میگزین ''غنچہ'' بجنور میں شائع ہوئی تھی غالباً ۱۹۶۹ء کے آس پاس.....چند ماہ کے بعد مجھے رسالہ ملا۔ پکی روشنائی میں اپنی تحریر دیکھ کر واقعی بے پناہ خوشی ہوئی.....کئی کئی دنوں تک اپنے ہم عمر دوستوں عزیزوں کو دکھاتا رہا۔دل خوشی سے بلیوں اچھلتا رہا۔لاشعور میں خود نمائی کا غلبہ بھی طاری رہا۔ پھر شہر کی انصاری لائبریری، محلّہ کشور خان کے Reading Table پر اس شمارہ کو بہ اجازت لائبریرین وقتی طور پر رکھ دیا کہ لوگ دیکھیں کہ شمیم قاسمی کہانی کار ہو گیا.....کہاں گئے وہ معصوم شب و روز ؟ کاش کہ کوئی میرا بچپن لوٹا دے اور میں ایک بار پھر ماورائی نوعیت کی کہانیوں کے طلسم میں کھو جاؤں۔

انور آفاقی: شاعری اور افسانہ نگاری دونوں الگ صنف ادب ہیں۔ان دونوں میں آپ کی پسندیدہ صنف کون سی ہے...؟

شمیم قاسمی: آپ کا یہ سوال قدرے مجھے دھرم سنکٹ میں ڈال رہا ہے۔میں بیک وقت نثر نگار بھی ہوں اور شاعر بھی ۔میرے عصر آشنا مضامین کا ایک مجموعہ ''آمد ورفت'' بھی شائع ہو چکا ہے جس میں تقریباً ۲۵ مضامین ہیں۔شعروادب کی مختلف اصناف پر میں نے طبع آزمائی کی ہے۔اب کوئی یہ سوال کرے کہ آپ کو گلاب کی خوشبو پسند ہے یا چنبیلی کی؟....میں تو خوشبوؤں کا رسیا ہوں میرا نام ہی شمیم ہے ۔دونوں کی بہترین خوشبو ہے۔میں تو خوشبوؤں کے جال میں گھرا ہوں ۔مختصر یہ کہ افسانے ہوں کہ شاعری حسب ضرورت دونوں اصناف میں مسائل روز وشب کا توانا اظہار کرنے پر قادر ہوں ۔اب یہ الگ بات کہ:

کب نثر سے ہاری غزل

ہے نظم پر بھاری غزل

انور آفاقی: شاعری اور افسانہ نگاری کے علاوہ اور کن اصنافِ ادب سے شوق رکھتے ہیں اور طبع آزمائی کر رہے ہیں؟ ذرا تفصیل سے بتائیں۔لکھنے پڑھنے کے لیے کیسے وقت نکال لیتے ہیں....؟

شمیم قاسمی: آفاقی صاحب،ایسا ہے کہ میں نے شاعری کے لیے بہت زیادہ وقت نکالنے کی ضرورت کبھی محسوس نہیں کی۔ویسے بھی شاعری کو میں کوئی جامیٹری یا ریاضی کا پہاڑہ نہیں سمجھتا۔اگر آپ کا شعری ذوق بالیدہ ہے شاعری کے فنی رموز سے ایک ذرا واقف ہوں۔موڈ خوشگوار ہو تو پھر کہہ سکتے ہیں کہ:

شعر کہنے کے لیے کشتی نہ کی

ذہن کو تھوڑا جھنجھوڑا ہو گیا

برسوں سرکار کی غلامی میں رہا ۱۹۷۰ء سے ۱۹۸۰ء کے درمیان فرصت کے لمحات میسر ہوا کرتے تھے۔طبیعت میں بھی روانی تھی،امنگیں جوان تھیں،جذباتی ہیجان کی جگہ معصومیت تھی تو کہانی کے تانے بانے بُن لیا کرتا تھا۔اور یوں مہینہ دو مہینہ پر ایک کہانی کی تخلیق ہو جاتی تھی۔ان کہانیوں کو فیئر کرنا بھی ایک مسئلہ تھا۔اس زمانے میں کمپیوٹر ایجاد نہیں ہوا تھا اور پھر لکھنے پڑھنے والوں کے وسائل بھی محدود تھے۔کہانیاں صاف کرتے وقت انگلیوں میں اکثر درد ہو جایا کرتا تھا جس کی وجہ سے کئی کہانیوں کو میں نے اپنے اندر ہی ماردیا۔یہ سچ ہے کہ عدیم الفرصت ہونے کی وجہ سے بھی میدان افسانہ نگاری سے دور ہوتا گیا۔ازدواجی اور دفتری ذمہ داریوں میں گھرنے

کے باوجود عظیم آباد کی ادبی سرگرمیوں سے ایک حد تک وابستہ رہا۔ رشتۂ لوح وقلم کو منقطع نہیں ہونے دیا۔ میرے بعض ادبی احباب اور سینیئر دانشوران شعروادب کو یہ دیکھ کر حیرت ہوتی تھی کہ میں کیسے دفتری امور کے ساتھ ساتھ اپنے ادبی سفر میں بھی توانا دم ہوں۔ مایہ ناز ادیب و ناقد پروفیسر اعجاز علی ارشد (سابق وائس چانسلر مولانا مظہرالحق یونی ورسٹی) نے بھی میری مصروفیات کے مدنظر اپنی حیرت کا اظہار کرتے ہوئے یہ واضح کیا ہے کہ: ''دراصل شمیم قاسمی کی ادبی شخصیت کو کسی ایک خانے میں رکھنا مشکل ہے۔ بنیادی طور پر انہیں شاعر کہنا ہی درست محسوس ہوتا ہے چونکہ اب تک ان کے کئی شعری مجموعے زیور طبع سے آراستہ ہو چکے ہیں جس میں غزلیں بھی ہیں نظمیں بھی مگر تقریباً پندرہ برس پہلے ان کے افسانوں کا بھی ایک مجموعہ منظر عام پر آ چکا ہے۔ جس میں عصری رجحانات ومیلانات کی فن کاری پیش کش نے فکشن کے نقادوں کو اپنی طرف متوجہ کیا تھا۔ وہ بعض اہم ادبی شخصیات و مسائل سے متعلق مضامین/تبصرے بھی لکھتے رہے ہیں جن میں ان کا تیکھا مگر تخلیقی اسلوب دل کشی کا سبب بنتا ہے......میں سمجھتا ہوں کہ غیر ادبی مشغولیات کے مصروف ترین اوقات میں سے شاعری کے لیے وقت نکالنا اپنے آپ میں ادب سے مخلص اور غیر مشروط وابستگی کا ثبوت ہے جو اس عہد میں بڑی بات ہے۔'' (بہار کی بہار۔ صفحہ:۱۳۳)

فرصت کے زمانے میں میرے کئی افسانے...آجکل، تحریک، کتاب، مورچہ ویکلی، زرافشاں، پیکر حیدرآباد، جمنا تٹ، شاعر، بیسویں صدی اور زبان وادب، پٹنہ وغیرہ میں شائع ہوئے ہیں۔ جہاں تک دیگر اصناف سخن میں طبع آزمائی کا سوال ہے تو اس ضمن میں مجھے بس اتنا کہنا ہے کہ ''آزاد غزل ہو کہ غزل نمایا پھر افسانچہ ایک ذرا زبان کا ذائقہ بدلنے کے خیال سے میں نے اس قبیل کی اصناف کو وقتی طور پر گلے لگایا۔ میرے ادبی دوست اور بے حد مخلص انسان پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے بعض متروک اصناف ادب پر طبع آزمائی کرنے کے لیے اُکسایا ضرور ہے۔ مجھے ادبی طور پر متحرک رکھنے کے لیے پروفیسر مناظر نے ہر عہد میں اپنے طور پر ترتیب دیئے گئے منتخب شعرا کی غزلوں کے کئی مجموعے میں مجھے شامل کیا ۔۸۵-۱۹۸۰ء کے درمیان میرے ادبی سفر کے جمود کو توڑنے میں بھی ان کا بڑا ہاتھ رہا ہے۔ اخیر میں آپ کے سوال کا واضح جواب میرے اس شعر میں مل جائے گا:

بس غزل ہی ہے ڈارلنگ میری
یوں تو زیر قلم ہیں سب اصناف

انور آفاقی: ''پانچ سلاخوں والا پنجرہ'' جیسی یادگار کہانی لکھنے کی تحریک کیسے ملی؟. آپ نے اب تک کل کتنے افسانے لکھے...؟

شمیم قاسمی: کہانی کی بنیادی تھیم جمہوری نظام ملک میں سفید پوش لیکن کرپٹ سیاست دانوں کی بالا دستی اور نت نئے ہتھکنڈے استعمال کر کے عوام کو بیوقوف بنا کر منتخب ہونے والے بیشتر ایم۔ پی کے کالے کرتوت کو فوکس کرتی ہے۔ پارلیامانی الیکشن میں جو ایم پی منتخب ہوتا ہے وہ اپنے شہر اور گاؤں کے ضرورت مند افراد اور معصوم ووٹرس کو ترقی کے نام پر اپنے مخصوص علاقے میں خوش حالی لانے کا وعدہ کر کے ٹھگتا رہا ہے۔ الیکشن جیتنے کے بعد انہیں سبز باغ دکھا کر رفو چکر ہو جاتا ہے اور محض پانچ برسوں میں نہ صرف اپنا social status بڑھا لیتا ہے بلکہ جھوٹ فریب اور رشوت خوری سے کروڑ پتی/ ارب پتی بن جاتا ہے، اور ہمارے معصوم ووٹرس ان پانچ برسوں کے لیے جیسے پنجرہ کا قیدی بن کر رہ جاتے ہیں۔ اس کو یوں سمجھئے کہ شکاری جال بچھاتا ہے، دانہ پانی ڈالتا ہے اور پھر پرندوں کو قید کر لیتا ہے۔ دراصل علامتی پیرایۂ اظہار میں لکھی گئی اس کہانی میں جو احتجاجی رویّہ ہے وہ ہماری جمالیاتی حسّیات کو بیدار کرتا ہے اور شاید یہی وجہ ہے کہ اس کہانی نے ہمارے بیشتر قارئین اور ہم عصر افسانہ نگاروں کو متاثر کیا ہے۔ اس کہانی کا ہندی ترجمہ رابن شا پُشپ نے کیا تھا جو ''اردو کی شریشٹھ کتھا'' (ہندی) میں بھی شامل ہے۔ اس کے علاوہ اس کہانی کا بنگلہ ترجمہ پورولیا بنگال کے کسی دلیپ فوجدار نام کے شخص/ ادیب نے کیا تھا۔

انور آفاقی: کیا مستقبل میں دس سلاخوں کا پنجرہ لکھنے کا ارادہ ہے...؟

شمیم قاسمی: ہا... ہا... ہا..... ارے بھائی! ملک کے جمہوری نظام میں اگر ایسی کوئی گنجائش ہو کہ اب ہر دس برس بعد ایم۔ پی کے لیے الیکشن ہو تو پھر....؟ مزید انارکی پھیلے گی۔ ہم سب کو سر جوڑ کر سوچنا ہوگا۔ ملک کی موجودہ صورت حال اور ''جملوں کی سرکار'' سے بچہ بچہ واقف ہے۔ بول مت چُپ رہو :

جو چپ رہے گی زباں ہماری
لہو پکارے گا آستیں کا

انور آفاقی: کیا آپ کو عشق کا روگ بھی کبھی لگا ہے...؟ یہ سوال میں اس لیے پوچھ رہا ہوں کہ لوگ کہتے ہیں کہ کامیاب شاعری وہی کر سکتا ہے جس نے عشق کیا ہو۔

شمیم قاسمی: ہمارے بزرگوں کا ایسا ماننا ہے کہ عشق کہتے ہیں جسے وہ خلل ہے دماغ کا۔ البتہ ہماری نسل کے لوگ اپنا اپنا بوریا بستر سمیٹ کر ایک گہری اور ٹھنڈی آہ بھرتے ہوئے واقعی پُر زور طریقے سے یعنی بھونپو بجا کر اس کا اعتراف کیے بیٹھے ہیں کہ عشق واقعی ایک لا علاج روگ ہے ؎

یہ اچھا ہوتا کہ ہم شعر و یرہی کہتے

یہ عشق وِشق یقیناً ہے کام جھنجھٹ کا

مجھے تسلیم ہے کہ کوئی روگ بے سبب نہیں ہوتا۔ کہتے ہیں کہ فرائڈ اور اس کے مقلدین کی رائے میں جب کوئی جبلت براہ راست تسکین نہیں پاتی ہے تو وہ تسکین (spritual satisfaction) کے دوسرے ذرائع ڈھونڈھ لیتی ہے۔ شاعری یا فنی تخلیق بھی شاید اسی طرح کی تسکین کا ذریعہ ہے۔ آپ کا مزید یہ پوچھنا کہ ''شاعری وہی کرسکتا ہے جس نے عشق کیا ہو۔'' اس کا جواب آپ سے بہتر بھلا کون دے سکتا ہے؟ آپ صاحب دیوان شاعر ہیں۔ آپ کا مجموعۂ کلام ''لمسوں کی خوشبو'' کا دوسرا ایڈیشن میری نظر میں ہے جو آپ کو ایک کامیاب شاعر ثابت کرنے کے لیے کافی ہے۔ اب جہاں تک میرا ذاتی معاملہ ہے، برسوں پہلے کہی گئی اپنی ایک غزل کا مطلع آپ کی سماعتوں کے حوالے ہے:۔

وہ ایک چہرہ جو برسوں نفس نفس میں تھا

تمام عمر مٔیں عرفان دسترس میں تھا

انور آفاقی: میں ذاتی طور پر آپ کو ایک باغی شاعر کہتا ہوں۔ اس پر آپ کا کیا ردِ عمل ہے....؟

شمیم قاسمی: دیکھیے صاحب! میں کہیں سے بھی باغی نہیں ہوں۔ باغی سے ''باغپت'' کی یاد تازہ ہو جاتی ہے۔ اگر واقعی باغی ہوتا تو اس شہرِ سخن سے باہر ہو گیا ہوتا۔ البتہ آپ مجھے مُوڈیل، خود شناس، ضدی اور قدرے غیر روایتی، احتجاجی شعری رویوں کا شاعر ضرور کہہ سکتے ہیں۔ میں تو برسوں سے ایک قسم کے عذاب دانش کی بھٹی میں سلگ رہا ہوں، تپ رہا ہوں..... کندن بننا شاید میرا مقدر نہیں ہے۔ اپنی تخلیقی صلاحیت کے بل بوتے پر بزمِ سخن میں نمایاں ہوں۔ بھیڑ میں پہچان لیا جاتا ہوں ہر چند کہ :

اور اس بھیڑ میں اکیلا ہوں

یہ جو اک بھیڑ ہے مرے اطراف

بجھ رہے ہیں چراغ مجلس کے

کون اٹھا مرے سخن کے خلاف

انور آفاقی: آپ اردو ادب کی مختلف تحریک اور رجحانات سے آگاہ ہیں۔ اپنے پیش رووں کو پڑھتے رہے ہیں لیکن بیشتر ناقدین کا ایسا ماننا ہے کہ آپ اپنے ڈھب یا انداز کی شاعری کرتے رہے ہیں۔ غیر شاعرانہ لفظوں کو بڑی حسن اسلوبی سے شعر کا جامہ پہناتے ہیں۔ آپ کی غزل میں لسانی شکست و ریخت کو نمایاں طور پر دیکھا جا سکتا

ہے۔اپنے چند اشعار سنائیے اور ہاں آپ کو وہاب اشرفی صاحب نے دیہی لفظیات کا شاعر کیوں کہا ہے؟ ممکن ہو تو کچھ تفصیل سے روشنی ڈالیں۔

شمیم قاسمی: آپ کے اس سوال میں کئی سوالات چھپے ہیں جن کے جوابات یقیناً تفصیل طلب ہیں ۔دیکھیے ،اردو ادب کی مختلف تحریکات ور رجحانات پر کسی حد تک میری نظر رہی ہے۔واجبی سا مطالعہ بھی رہا ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ کوئی ادبی نظریہ یا پھر تحریک کا ایک محدود دائرۂ عمل ہوتا ہے۔تغیر و تبدل تو ایک فطری پروسس ہے۔نظریئے تبدیل ہوتے رہتے ہیں کہ یہ جامد نہیں ہوتے۔کسی مخصوص نظریئے کی عینک لگا کر میں نے کبھی ادب وشعر پڑھا ہی نہیں۔ہاں یہ بھی سچ ہے کہ میں نے جس زمانے میں لکھنا پڑھنا شروع کیا تھا وہ جدیدیت پسند افکار ونظریات کا تھا۔اُن دنوں میرے مطالعہ میں ''کتاب''لکھنؤ کے ساتھ ساتھ ''شب خون''الہ آباد بھی رہا۔شب خون کے اوراق/مشمولات سے میری ذہنی وابستگی بڑھتی گئی۔لیکن میں شدت پسند جدیدیوں میں کبھی شامل نہیں رہا۔یوں لاشعوری طور پر میں نظریہ ساز جدید ناقد وشاعر شمس الرحمٰن فاروقی سے متاثر ہوتا گیا۔ظاہر ہے کہ ان کی تنقیدی بصیرت اور ان کے سائنٹیفک مطالعہ تنقید کا ایک زمانہ معترف ہے۔اردو کی جدید تنقید میں ان کی Dynamic شخصیت اور قد آوری سے کون انکار کرسکتا ہے بھلا۔بہر حال زمانہ کوئی بھی رہا ہو میں اردو شعر وادب کے ارتقائی سفر یا معاصر ادب کو کسی محدود وژن اور نظریاتی عینک سے دیکھنے کا قائل نہیں کہ ہر عہد اور ہر موسم کا شعر وادب عصری اور آفاقی صداقتوں کا مظہر ہوتا ہے۔چنانچہ کسی بھی تخلیقی ،تنقیدی فن پارے کا مطالعہ ذہنی یکسوئی اور کشادہ نظری کا طالب ہوتا ہے۔تبھی یہ ہمارے لیے نتیجہ خیز ہوسکتا ہے۔

آپ کا یہ بھی ایک سوال کہ میں اپنے ڈھب کی شاعری کرتا ہوں ،تو بھائی میرے...ہر شاعر اپنے ہی انداز کی شاعری کرنے کا دعویدار ہے۔بزعم خود سبھی منفرد اور قد آور نمائندہ شاعر کہلوانے کا ہَوکا پالے ہوئے ہیں۔''من ترا حاجی بگویم تو مرا حاجی بگو'' کا ورد جاری ہے.....ایسے میں مجھے یہاں خود سے میاں مٹھو بنا قطعی پسند نہیں۔ہاں اتنا تو سبھی تسلیم کرتے ہیں کہ میں نے غزل کے متعینہ ڈکشن کو توڑا ہے (تفصیل کے لیے مشاہیر ادب کے خطوط/مضامین پڑھیں)اور صنف غزل میں اپنی سی راہ نکالی ہے۔بقول وہاب اشرفی :

''غزل گو شعراء کی بھیڑ میں شمیم قاسمی اپنے مخصوص شعری ڈکشن کی وجہ سے خاصے پہچانے جاتے ہیں ۔''اور نئی نسل کے نمائندہ ناقد ڈاکٹر فیاض احمد وجیہ (جے این یو) کی رائے ہے کہ ''شمیم قاسمی نے لسانی سطح پر جس نوع کی توڑ پھوڑ کی ہے اس کو کسی حد تک تخلیقی عرصہ کے شعوری عمل سے تعبیر کیا جاسکتا ہے.....بعض لفظوں/لسانی

واردات کے گنوئی پن میں احساس ہوتا ہے کہ شمیم قاسمی غزل کی مرصع تہذیب سے شعوری طور پر ایک زرا دامن جھٹک کر صارفی کلچر کی زبان استعمال کرر ہے ہیں۔کبھی یوں بھی لگتا ہے کہ غزل کو دیہی اور قصباتی ثقافت وتہذیب اور زبان کے ''دیہی رس'' سے متعارف کرار ہے ہیں۔ (مطبوعہ: آمدورفت)

اب یہ الگ بات کہ :

بلا سے ہاتھ نہ آئے کلید فکر سخن!
میں شعر کہتا ہوں جب بھی تو اپنے ہی کٹ کا

......

گھنگھر والے بیل کی جوڑی
اور کہاں منظر ریہٹ کا
یہ تو خدا کا خاص کرم ہے
سر پر سایہ ہے کرکٹ کا
دین سے بھی رکھتے ہیں نسبت
کھانے کو کھاتے ہیں ''جھٹکا''

......

قید زباں سے یوں نکلے ہم
روزی کو پڑھتے ہیں روجی

اور مجھے اس کا بھی اعتراف ہے :

غزل وزل کبھی ہوتی تھی ڈارلنگ میری
تو دیکھنے ہی سے بنتی تھی تب فٹنگ میری

......

بہت مشکل ہے کوئی راہ نکلے
پرانی راہ کی تردید کرکے

......

اپنی پہچان ہی مشکل ہے بہت
یہ غزل گوئی بھی ٹف ہے سو ہے

......

جب بھی ملبوس نو بدلتی ہے
ناچتی ہے مری غزل چھم چھم

......

بزمِ اغیار میں بھی اترائے
یہ غزل ہے میاں رکھیل نہیں

میری شاعری/غزل کے مطالعہ سے آپ محسوس کریں گے کہ الفاظ کے مروّجہ یعنی روایتی اور لغوی معنی کی جکڑ بندیوں کے آہنی فریم سے کہیں کہیں چھلانگ لگانے کی میں نے اپنی سی کوشش ضرور کی ہے۔ کبھی یوں بھی محسوس ہوگا کہ زبان و بیان کی سطح پر میں ایک ذرا کھلواڑ کرنے لگا ہوں اور یہ کہ قواعد زبان سے بے پروا ہو گیا ہوں لیکن یقین جانئے انتہا پسند نہیں ہوں کہ آدابِ شاعری کا میں نے بہت حد تک خیال رکھا ہے۔ لیکن یہ بھی سچ ہے کہ کسی ''کنویں کا مینڈک'' بننا بھی مجھے کب پسند رہا ہے؟

صنف غزل کی حرمت اور اس کی نازک بدنی کا خیال رکھتے ہوئے میں نے غزل کے چوکھٹے میں خود کو فٹ کرتے وقت تھوڑی سی منمانی ضرور کی ہے۔ میرے یہاں لسانی شکست و ریخت کا در آنا بھی کہیں شعوری تو کہیں لاشعوری تخلیقی عمل رہا ہے۔ تنگنائے غزل کا رونا دھونا میرے یہاں بالکل نہیں ملے گا۔

نقشۂ خواب ایک صحرا ہے
کیکٹس بن کے میں اُبھرتا ہوں
تنگ ہو لاکھ رہگزارِ سخن
اپنی من مانی سے پسرتا ہوں

زندگی ادب اور اس کے متعلقات پر میں مثبت سوچ رکھتا ہوں۔ optomistic approach کے بغیر تمام مناظر و مظاہر دھواں دھواں سے نظر آتے ہیں۔ میرا ایسا ماننا ہے کہ مثبت فکر و نظر اور تجسس کے بنا عرفانِ ذات و کائنات کا سفر لایعنی ہے۔

سفر تمام ہوا بس انہی خیالوں میں

ہوا چلے تو نصیبہ میں دیکھوں گھونگھٹ کا

......

فقط یونہی نہیں آبِ رواں ہوں

میں اس کی سوچ میں بھی بہہ رہا ہوں

انور آفاقی: اب تک کی گفتگو سے بخوبی اندازہ ہوا کہ آپ دیگر اصنافِ ادب کے مقابلہ میں شاعری یا صنفِ غزل کو ترجیح دیتے ہیں۔ کیا افسانہ نگاری یا فکشن دوئم درجہ کی چیز ہے...؟

شمیم قاسمی: دوئم یا سوئم والی بات نہیں ہے۔ ہر زمانہ میں صنف غزل کو بلند مقام حاصل رہا ہے۔

ہم ہوئے تم ہوئے کہ میؔر ہوئے

اس کی زلفوں کے سب اسیر ہوئے

سچ پوچھیے تو آج بھی اچھی اور بڑی شاعری کو تخلیقی ادب میں اولیت حاصل ہے۔ جہاں تک فکشن یا افسانہ نویسی کا معاملہ ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ میدانِ نثر میں اسے اولیت حاصل ضرور ہے لیکن یہ بھی ایک بڑا سچ ہے کہ مغربی ادب کے بیشتر دانشورانِ ادب یا فکشن کے ناقدین نے فکشن/ناول کی بیجا طوالت کے باعث اسے قابلِ اعتراض صنف قرار دیا ہے۔ سچ یہ بھی ہے کہ ناول یا فکشن کے مطالعہ کے لیے کافی وقت درکار ہوتا ہے۔ میرا تو ایسا ماننا ہے کہ بھاگم بھاگی کی صارفیت زدہ زندگی میں ہمارے پاس وقت کا فقدان ہے۔ دراصل فکشن یا ناول کا مطالعہ ہو کہ اسے قلم بند کرنا دونوں سطح پر ذہنی یکسوئی کے ساتھ یہ فُل ٹائم ورک ہے۔ اب شاعری یا غزل لکھنے کا معاملہ ہے تو یہ کہا جاسکتا ہے کہ ذہنِ شاعر میں کوئی اچھوتا سا خیال مانند بجلی کوندا، حساس دل سے جا لگا تو پھر ایک شعر اور کبھی کبھی چند لمحوں میں ایک غزل کا نزول ہو گیا۔ صنف افسانہ میں یہ ممکن نہیں.... ویسے آپ کے پچھلے سوال کے جواب میں بھی میں نے اس پر روشنی ڈالی ہے۔ مزید اب اس موضوع پر گفتگو ممکن ہے۔

انور آفاقی: کیا آپ کے ذہن میں کسی ناول/ناولٹ کا پلاٹ بھی کُلبلا رہا ہے؟ اگر ہاں، تو منصۂ شہود پر کب تک آنے کی توقع ہے؟

شمیم قاسمی: فی الحال تو میں کچھ کہہ نہیں سکتا۔ گزشتہ سوال کے جواب میں مَیں نے یہ واضح کیا تھا کہ ناول لکھنا اور پڑھنا دونوں ڈھیر سارے اوقات اور ذہنی یکسوئی کا متقاضی ہے۔ ادیب و شاعر بھی سماج کا ایک ذمہ دار

شہری ہے سو مجھے اعتراف ہے کہ میں گزشتہ برسوں سے گھریلو ذمہ داریوں اور سماجی سروکار سے حد درجہ بندھ گیا ہوں۔ سرکاری منصب سے سبکدوش ضرور ہو چکا ہوں لیکن ازدواجی اور رواجی زندگی کے مسائل روز و شب میں کچھ یوں گرفتار ہوں کہ طول طویل تحریروں کا تسلسل ٹوٹتا رہتا ہے۔ صاف لفظوں میں کہوں تو ناول لکھنے کے لیے میرے پاس فی الحال وقت اور ذہنی سکون میسر نہیں۔ گھریلو اور نجی ذمہ داریوں کی بطریق احسن ادائیگی میں اپنے اندر کے تخلیقی وفور کو باندھے ہوا ہوں۔ ہاں ۱۹۸۸ء میں میں نے ایک سوانحی ناول ''حافظے کا جنگل'' لکھنا ضرور شروع کیا تھا اور جس کا ایک طویل باب بعنوان ''شکارگاہ'' زبان و ادب، پٹنہ (بہار اردو اکادمی کا مجلّہ) میں شائع بھی ہوا تھا۔ دعا کیجیے کہ ڈھلتی ہوئی اس عمر کے کسی پڑاؤ پر میں اسے مکمل کر سکوں۔

انور آفاقی: اب میرا اگلا سوال بھی فکشن سے متعلق ہے اور وہ یہ ہے کہ........ عصمت چغتائی اور قرۃ العین حیدر نسائی ادب کے دو بڑے اور اہم نام ہیں۔ آپ دونوں میں سے کسے زیادہ پسند کرتے ہیں اور پسند کی وجہ؟

شمیم قاسمی: میری نگاہ میں دونوں نسائی جہانِ فکشن کے معتبر نام ہیں۔ اب یہ الگ بات ہے کہ میں نے قرۃ العین حیدر کو زیادہ پڑھا ہے۔ میں نے ذاتی طور پر ایسا محسوس کیا ہے کہ عینی آپا کے فکشن سفر میں ان کا نسائی تشخص برقرار نہیں رہتا وہ بیشتر مقامات پر ہمارے شاندار ماضی کی عظمتوں کی بازیافت اور ہماری وراثت وثقافت کے غیر محفوظ ہونے کا دکھ جھیلتے ہوئے نظر آتی ہیں۔ وہ بے حد ناسٹلجک ہیں۔ دراصل ماضی کی اسی زمزمہ خوانی نے انہیں ماضی گرفتہ قرار دیا ہے۔ وہ اپنے بیشتر ناولوں میں اپنے شاندار ماضی اور وراثتی سرمایوں کی زبوں حالی کو ایک تجربہ کار گائیڈ کے طور پر فوکس کرتی ہوئی، اپنے مخصوص طرب انگیز لہجے کے ساتھ مردانہ وار سامنے نظر آتی ہیں۔ اس کے برعکس عصمت عورت ذات کے مکمل وجود کو تسلیم کرتے ہوئے مرد اساس معاشرہ میں اس کے cauvinist ہونے پر قدغن لگاتی ہیں۔ نفسیاتی سطح پر بھی وہ عورت کی تہذیبی و معاشرتی حیثیت اور وقار کو نمایاں کرتی ہیں۔ ان کے یہاں زبان کی قلب ماہیت کو سمجھنا ہوگا۔ وہ زنانی اور مخصوص علاقے / قصبے میں بولی جانے والی یعنی روزمرہ کی زبان پر دسترس رکھتی ہیں۔ کہا جا سکتا ہے کہ آزادیٔ نسواں کی جھلک عصمت چغتائی کے طراری لہجہ میں نمایاں ہے۔ دونوں فکشن خواتین کا اپنا اپنا ادبی مقام معتبریت رکھتا ہے۔ کسی ایک کو نظر انداز کر کے نسائی ادب کا سفر آدھا ادھورا ہوگا۔

انور آفاقی: شکریہ شمیم بھائی۔ آپ نے اب تک میرے کیے گئے سوالات پر بھرپور جوابات دیئے۔ اب میرے محض دو تین سوالات رہ گئے ہیں۔ میرا اگلا سوال اردو زبان سے متعلق ہے۔ اردو اکاڈمیوں اور اردو کے لیے

سرکاری اداروں کے ترقیاتی منصوبوں اور کام کے طریقوں سے کیا آپ اتفاق رکھتے ہیں؟ کیا بہار میں سرکاری سطح پر اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے ثمرآور پروگرام یا اقدامات اٹھائے گئے ہیں؟ بہار میں اردو کا مستقبل....؟

شمیم قاسمی: جہاں تک اردو اکاڈمیوں کی کارگزاریوں کا معاملہ ہے۔ملک گیر سطح پر کیا کیا منصوبے ہیں۔میں کہہ نہیں سکتا۔البتہ اپنے چند تحفظات کے ساتھ میں کہہ سکتا ہوں کہ بہار میں اردو اکاڈمی گزشتہ برسوں میں بے حد فعال رہی ہے۔عالمی سطح کے موضوعی سیمینار،مشاعرے اور نشرواشاعت کے کئی تشفی بخش کام کیے ہیں۔کئی منصوبے علاقائی سطح پر بھی نافذ ہوئے جو اردو زبان کو عوام پسند بنائے ہوئے ہیں۔اب یہ الگ بات کہ ذاتی طور پر کسی کی حق تلفی ہوئی ہو تو میں کہہ نہیں سکتا۔ہمیں کسی مخصوص عینک سے اکاڈمی کو نہیں دیکھنا چاہئے۔اصل چیز ہے اجتماعی طور پر کام کرنے کا دائرہ عمل اور لگن۔اکاڈمی کی ماضی میں عمدہ کارکردگی رہی ہے۔حال کے دنوں میں اس پر جمود طاری ہے۔کسی بھی ریاستی سطح پر زبان و ادب کے فروغ کے جو منصوبے بنائے جاتے ہیں انہیں امپلیمنٹ کرنے کے لیے سرکاری ضابطے ہوتے ہیں۔ان سے باہر رہ کر اکاڈمی اردو کے فروغ کے لیے مزید کچھ نہیں کر سکتی۔بہار کی سرکاری زبان اردو ہے۔اردو ڈائرکٹوریٹ کے پاس بھی ایک بڑا بجٹ ہے۔اور اردو پرست امتیاز احمد کریمی بہ حیثیت ڈائرکٹر اپنی ذمہ داریوں کو بطریق احسن نبھا رہے ہیں۔بہار میں اردو کا مستقبل روشن ہے۔بس اردو آبادی کو بیدار اور اپنی زبان کے تئیں مخلص ہونیکی ضرورت ہے۔

انور آفاقی: عہد حاضر کے چند نامور ناقدوں کے علاوہ پیش رو جدید اردو تنقید پر اپنی رائے ظاہر کرتے ہوئے ان نقادوں کے نام بھی بتایئے جن سے آپ ذہنی وابستگی رکھتے ہیں یا متاثر رہے ہیں۔ناقد کا تنقیدی منصب کیا ہونا چاہئے؟اور کیا تازہ کار نسل کے ادباوشعرا سے آپ امیدیں وابستہ رکھتے ہیں؟ممکن ہو تو چند نام بھی بتائیں.....

شمیم قاسمی: یہاں بھی بیک وقت کئی سوالات گڈمڈ ہو گئے ہیں۔بہر حال پیش رو اردو ادب یا جدید شعرو ادب کے چند ایسے قدآور ناقدین ضرور ہیں جن سے میں ایک حد تک متاثر رہا ہوں اور جن کی علمی اور تنقیدی بصیرت کا ایک زمانہ معترف ہے۔ان میں سب سے پہلا نام نظریہ ساز جدید ناقد شمس الرحمٰن فاروقی کا ہے۔پچھلے سوال میں مَیں نے فاروقی صاحب کے حوالے سے جواب دیا ہے۔ان کے تنقیدی نظریات وضاحت طلب نہیں۔فاروقی کے فوراً بعد پروفیسر وہاب اشرفی کا نام ذہن میں آتا ہے۔ایک عہد ساز ناقد،رفیع القدر شخصیت، جن کے تنقیدی فتوحات میں کشادہ نظری ہے،فکری انجماد نہیں۔ان کی ناقدانہ دیدہ وری کے کئی عمدہ نمونے ہیں جن

سے نئی نسل نظری فکری طور پر استفادہ کرتی رہی ہے۔ یوں بھی وہاب اشرفی کا ادبی و ذاتی رویہ کم از کم بہار کی سطح پر نئی نسل کے تئیں مخلصانہ اور مربّیانہ رہا ہے۔ یوں وارث علوی کی اُکھاڑ پچھاڑ والی تنقیدی، فتنا سی تحریروں سے بھی متاثر رہا ہوں۔ علوی کا ایسا ماننا ہے کہ ''تنقید تخلیق کی نعلین بردار نہیں بلکہ ہم رکاب ہے......ادب میں ہنگامہ آرائی، چہل پہل اور گرما گرمی کی پہچان تنقید کے مزاج پر قائم ہے۔'' اب ایسے میں فی زمانہ ناقد کے تنقیدی منصب پر مزید روشنی ڈالنا بے معنی ہے۔ مذہبی مسلکی نظریات کے تضادات کی طرح دبستان تنقید میں بھی نظریاتی تصادم اور اپنی ڈفلی اپنا راگ کا بول بالا ہے اور مخالفین کا مُنہ کالا۔

جدید دبستان تنقید کے اس روشن باب میں مزید ایک اور نام جوڑیئے میری مراد ہے پروفیسر طرزی سے۔ جی ہاں! میں ذاتی طور پر پروفیسر عبدالمنان طرزی کو منظوم جہان تنقید کا اوّل و آخر ناقد تصور کرتا ہوں۔ ایک وسیع المطالعہ ہمہ رنگ شخصیت جس کی ناقدانہ بصیرت اور محققانہ زاویۂ نظر نے بابِ منظوم تنقید میں اپنے وہ منظوم تنقیدی جوہر دکھائے ہیں کہ ایک پوری ادبی نسل ان سے متاثر ہوئی ہے۔ موصوف کے منظوم تنقیدی افکار و اظہارات میں جو عالمانہ وسعت نظری اور علمی ترفع ہے اس کا اعتراف نہ کرنا ادبی کوتاہی ہوگی۔ آپ ان تک میرا سلام پہنچادیں۔

آپ کے ہر سوال میں کئی خانے ہیں جنہیں میں پوری طرح بھر نہیں سکتا لیکن انہیں میں نظرانداز بھی نہیں کرسکتا۔ تو اب لوٹتے ہیں نامور اور قدآور ناقدین شعر و ادب کے بعد ہمعصر اردو تنقید کے چند چہروں کی طرف۔ جدید شعر و ادب کے گلوب پر گزشتہ دو دہائیوں میں چند سنجیدہ تنقیدی چہروں نے ہمیں اپنی جانب متوجہ ضرور کرایا ہے لیکن ان میں کچھ ایسے بھی نام یا چہرے ہیں جنہیں ابھی جم کر مطالعہ کرنا چاہیے تھا لیکن وہ جم کر اور ڈٹ کر لکھ رہے ہیں.....اور صرف لکھ رہے ہیں.....اس قبیل کے ناقدوں کا مطالعہ بہت محدود ہے۔ ہنگامی اور وقتی موضوعات پر لکھتے وقت وہ اقتباسات کے ڈھیر لگاتے چلے جاتے ہیں یوں چراغ سے چراغ جلانے کی روایت برقرار ہے۔ دراصل ان کا اپنا کوئی تنقیدی زاویۂ نظر نہیں۔ اس قبیل کے نصابی اور موسمی قسم کے ناقدوں سے ایک ذرا ہٹ کر یعنی خود ساختہ ناقدوں کے جم غفیر میں البتہ چند تنقیدی چہرے دُور ہی سے اپنی چمک دکھلاتے، اپنی موجودگی درج کراتے نظر آرہے ہیں۔ کہا جاسکتا ہے کہ معاصر اردو تنقید کے حوالے سے یہ چہرے یہ نام اپنا تنقیدی تشخص بچانے میں سبقت لے گئے ہیں۔ ذہن پر زیادہ زور دیئے بغیر ہمارے سامنے فکشن کی تنقید کا ایک باوقار اور سنجیدہ نام ہے اظہار خضر کا۔ (دیکھیے ''زبان کی جمالیات'' اور ''اردو فکشن سے مصافحہ۔ تجزیئے) اظہار خضر کسی بھی قسم کی

ادبی لابنگ سے دُور اپنی فکشن تنقید کی دنیا میں مست ہیں۔ادب کے ایک مخصوص حلقہ میں ان کی تنقیدی تحریروں کا سنجیدگی سے مطالعہ کیا جاتا ہے۔ان کے مداحوں میں پروفیسر شکیل الرحمٰن بھی ہیں اور جوگندر پال، زاہدہ حنا اور گلزار بھی ہیں۔کسی بھی فن پارہ کا پہلے سنجیدہ مطالعہ اور پھر اپنے تنقیدی موقف کا برملا اظہار یہ، جو بڑا سائنٹفک ہوتا ہے.... اسے اظہار کا وصف خاص کہا جا سکتا ہے۔.....اسی فہرست میں لسانی تازگی اور فکری اڑان لیے اپنی منفرد تخلیقی تنقید /نثر کے ساتھ جلوہ افروز ہیں حقانی القاسمی۔ان کی تحریروں میں موضوعاتی تنوع کے ساتھ ان کا مخصوص کشادہ تنقیدی زاویۂ نظر بھی نمایاں ہے۔حسّاس دل عالمی شہرت یافتہ ناقد حقانی القاسمی کو مَیں جدید شعر و ادب کا ایک ایسا قلم مزدور کہتا رہا ہوں جو کسی صلہ کی پروا کیے بغیر اپنے تنقیدی تخلیقی سفر کو عبادت کا درجہ دیتا ہے اور اسے ایک مراقباتی عمل سمجھتا ہے (ادب کولاژ:۲۰۱۴ء) تخلیقی تنقید کے باب میں خورشید حیات (لفظ تم بولتے کیوں ہو:۲۰۱۷ء) بھی اپنی علاحدہ شان رکھتے ہیں۔شہاب ظفر اعظمی کا اردو ناول کے اسالیب پر عمدہ اور بے مثال کام ہے۔اس کتاب کی حیثیت دستاویزی ہے۔اس کے علاوہ ''جہانِ فکشن'' ان کے تنقیدی مضامین کا مجموعہ بھی لوگوں کی نظر میں ہے۔ویسے اعظمی مختلف موضوعات پر بھی گاہے بگاہے قلم اٹھاتے رہے ہیں۔بطور خاص نو واردانِ ادب کی ہمت افزائی میں وہ پیش پیش رہتے ہیں۔مختلف موضوعات پر طبع آزمائی کرتے ہوئے اکثر سیمینار میں شریک ہوتے ہیں اور اپنے موضوعاتی پیپرس پڑھ کر اسٹیج پر ہی داد و تحسین بٹورتے ہیں۔سچ پوچھیے تو تاثراتی تنقیدی مضامین لکھتے رہنا ان کا اوڑھنا بچھونا ہو گیا ہے۔فکشن کے ساتھ ساتھ اردو کے نسائی ادب پر بھی ان کی قابلِ لحاظ پکڑ ہے۔صفدر امام قادری بھی دنیائے تحقیق و تنقید کا ایک باوقار نام ہے۔سیاسی سماجی اُتھل پُتھل پر بھی ان کی گہری نظر ہے۔ایک ادبی صحافی اور سیاسی تجزیہ نگار کے طور پر بھی لوگ باگ انہیں احترام کی نظر سے دیکھتے ہیں۔(دیکھیے ''نئی پرانی کتابیں'' ۲۰۱۳ء، ''ذوق مطالعہ'' ۲۰۱۴ء اور ''عرضداشت'' ۲۰۱۸ء وغیرہ) سچ پوچھیے تو مختلف قسم کے نظریاتی تنقیدی حربوں سے لیس ان کا تنقیدی سفر بڑا پہلودار، معنی خیز اور شعر شور انگیز جیسا ہے۔صفدر بلاشبہہ وسیع المطالعہ ہیں۔کہہ سکتے ہیں کہ صفدر کا نظریۂ نقد بڑا استدلالی اور معروضی ہوتا ہے۔کسی فن پارہ کو پرکھنے کا ان کا اپنا مخصوص جراحی پیمانہ ہوتا ہے۔اس فیلڈ میں ان کے اپنے تحفظات ہیں۔دھوبی کے گدھوں اور ریس کے گھوڑوں کی انہیں خوب تمیز ہے۔بغیر کسی لاگ لپیٹ کے منصفانہ انداز اختیار کرتے ہوئے وہ اپنے تنقیدی نصب العین کو یا اپنے تنقیدی منصب کو خوب پہچانتے ہیں چنانچہ بعض احباب ''صفدری تنقید'' سے خائف بھی نظر آتے ہیں۔.....معاصر اردو تنقید کے اس سفر میں ڈاکٹر ہمایوں اشرف کا نام بھی کسی تعارف کا محتاج نہیں۔انہوں نے اپنی

محنت، کُل وقتی مطالعہ ادب اور جاں سوزی سے اردو شعر و ادب کی کئی نامور ہستیوں کے ادبی کارناموں کو اجاگر کرنے کے لیے عمدہ کتابیں ترتیب دیں اور سیر حاصل مقالے قلم بند کیے۔ گاہے بہ گاہے ان کی تنقیدی کاوشوں کی اشاعت معتبر ادبی رسائل میں ہوتی رہتی ہے۔ وہ ایک باشعور اور عصر آشنا ناقدِ ادب ہیں۔ ان کے مضامین کے مجموعوں میں ''فکشن کی بازیافت'' ۲۰۱۳ء کو اعتبار حاصل ہے۔ فکشن کی تنقید کو انہوں نے ایک نیا وژن دیا ہے۔ فکشن کی تنقید میں ہمایوں نے اب تک جو تجزیاتی مطالعے پیش کیے ہیں وہ باشعور قارئین ادب کی توجہ کے مستحق ہیں۔ تفہیم فکشن میں ہمایوں کا تنقیدی سفر بڑا زرخیز اور اپنے نصب العین کی طرف گامزن ہے۔ اس فہرست میں اور بھی کئی نام ہیں۔ جیسے ڈاکٹر نسیم احمد نسیم (بساطِ تنقید: ۲۰۱۷ء) شعر اساس تنقید: عطا عابدی (۲۰۱۶ء)، ڈاکٹر امام اعظم ''گیسوئے افکار'' (تنقیدی کتاب) اور ڈاکٹر انور ایرج کی تنقیدی کتاب (تخلیق تنقید کے حوالے سے مطبوعہ ۲۰۱۸ء) بھی میری نگاہ میں ہیں۔ ان سب کے مطالعہ سے جدید تنقیدی افکار و نظریات کا ایک نیا فکری جہان روشن ہوتا ہے۔ ان میں فکر و نظر کی کشادگی بھی ہے اور تخلیق و تنقید کے مابین نظریاتی تصادم بھی۔......اور بھی کئی نام ہیں جو فی الحال ذہن سے اوجھل ہیں ویسے بھی فہرست سازی میرا سبجکٹ نہیں۔ ممکن ہے کسی اور موقع پر میں تفصیل سے لکھوں...فی الحال اتنا کہوں گا کہ بطور خاص بہار میں معاصر اردو تنقید کا یہ کارواں بڑا توانا اور تازہ دم ہے۔ جدید اردو تنقید ہو کہ فکشن کی تنقید یہ کئی معرکے سر کرتا ہوا صاف دکھائی پڑتا ہے۔......

جہاں تک تازہ کار شعرا و ادبا کا تعلق ہے۔ میں اردو کی نئی نسل سے قطعی مایوس نہیں ہوں۔ شاعری ہو کہ تنقید یا پھر افسانوی ادب تمام اصناف سخن پر تشفی بخش ادبی تخلیقی اور تنقیدی سرگرمی جاری ہیں۔ تازہ کار نسل کے ادبا اور شعرا میں نوشاد احمد کریمی، احمد اشفاق، قسیم اختر، کامران غنی صبا، گلفام صدیقی، خان رضوان احمد، منصور خوشتر، عامر نظر، آفاق عالم صدیقی، عالم پرویز، مصداق اعظمی، پرویز عالم پرویز، غلام نبی کمار، احسان عالم، جہانگیر نایاب، رقصاں ہاشمی، جمیل اختر شفیق اور کہانی کار مجیر احمد آزاد وغیرہ کی شعری و نثری کاوشوں میں نئے امکانات نئی فکری اڑان کے دریچے روشن ہیں۔ تازہ کار نسل کے لیے میرا ایک شعر بھی نوٹ کر لیں:

خوشبو کی طرح پھیلو، چھا جاؤ زمانے پر
ثانی نہ ملے تم سا آواز لگانے پر

انور آفاقی: میرا آخری سوال۔ زندگی کو آپ کس طرح دیکھتے ہیں....؟

شمیم قاسمی: اس کا مختصر سا جواب ساحر لدھیانوی کے اس شعر میں چھپا ہے جس نے طلب علمی کے زمانے

میں بھی مجھے حد درجہ سنجیدہ بنائے رکھا:

دیکھا ہے زندگی کو کچھ اتنا قریب سے

چہرے تمام لگنے لگے ہیں عجیب سے

خود میرا یہ شعر صارفیت زدہ معاشرہ میں عصری زندگی کی کچھ یوں ترجمانی کرتا ہے:

یوں گھٹ رہی ہے جیسے کہ ٹنڈر نہیں ملا

یہ زندگی بھی اردو کا اخبار ہوگئی!

انور آفاقی: بلاشبہ آپ نے زندگی اور شعر و ادب کے مختلف پہلوؤں پر موثر ڈھنگ اور خوش اسلوبی سے اپنی بیباک رائے اور میرے تقریباً ہر سوال کا تشفی بخش جواب دیتے ہوئے میرے اس انٹرویو کو بامعنی بنا دیا۔ ....اب اس دعا کے ساتھ اجازت چاہوں گا کہ اللہ پاک آپ کو سلامت رکھے اور آپ کی فکری کائنات روز بروز پھلتی پھولتی رہے۔ آمین!

شمیم قاسمی: بے حد شکریہ انور آفاقی صاحب۔ آپ سے گفتگو کرتے ہوئے مجھے واقعی اچھا لگا۔ آپ کے سوال کرنے کا انداز بڑا فطری ہوتا ہے۔ جاتے جاتے میری بھی دُعائیں لیتے جائیں۔

(تاریخ مکالمہ نومبر ۲۰۲۰)

اُردو میں فکشن تنقید کا بنیاد گزار: صادق

ابراہیم افسر

اُردو افسانے کی عمر سو سال سے زیادہ ہے لیکن فکشن تنقید کی عمر اس سے بھی کم ہے۔ اُردو میں معدودے چند ناقدین نے ہی فکشن تنقید کے میدان میں کارہائے نمایاں انجام دیے ہیں۔ سید وقار عظیم اور دوسرے ناقدین بالخصوص عبادت بریلوی، محمود الٰہی، صادق، جعفر رضا، ڈاکٹر سلیم قزلباش، شمس الرحمٰن فاروقی، محمد حسن عسکری، گوپی چند نارنگ، قمر رئیس، ممتاز شیریں، صغیر افراہیم، شفیق انجم، ڈاکٹر خالد علوی وغیرہ نے اُردو فکشن تنقید کو نئی سمت و جہت عطا کی ہے۔ مذکورہ بالا ناقدین میں پروفیسر صادق نے فکشن تنقید کو کسی خاص چشمے سے دیکھنے اور کسی تحریک سے وابستہ ہوئے بغیر معروضی اور استدلالی طریقے سے آگے بڑھایا ہے۔ ان کی فکشن تنقید کا خاص جُز ارفعیت و ایجاز بھی ہے۔ انھوں نے اپنی تنقید میں دوٹوک انداز کا اختیار کرتے ہوئے ترقی پسند تحریک سے متاثر ہو کر لکھے گئے افسانے اور 1980 کے بعد لکھے جانے والے فکشن پر خاص توجہ مرکوز کی ہے۔ ان کی شہرت کا مدار ان کے تحقیقی مقالے ''ترقی پسند تحریک اور اُردو افسانہ'' ہے۔ افسانوں پر کام کرنے والوں کے لیے یہ کتاب کسی دستاویز سے کم نہیں۔ ترقی پسند تحریک اور اس کے اثرات پر متعدد کتابیں لکھی گئیں لیکن پروفیسر صادق کی مذکورہ بالا کتاب ترقی پسند افسانے کو سمجھنے اور سمجھانے میں اپنی مثال آپ ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت کا اندازہ اسی سے لگایا جا سکتا ہے کہ مشہور و معروف دانشوروں اور نقادوں نے اس کتاب کی خوب ستائش و تعریف کی۔ پروفیسر ارتضیٰ کریم نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا کہ ''اُردو فکشن اور خصوصاً ترقی پسند افسانے پر ڈاکٹر صادق کی گہری نظر ہے۔ انھوں نے اس ادبی تحریک کو زیر اثر لکھے گئے افسانے کی متنوع فکر و فنی جہات کا معروضی نقطۂ نظر سے مطالعہ کیا ہے۔ ترقی پسند افسانے کا معیار اور وقار متعین کرنے کی کوشش کی ہے۔'' خود پروفیسر صادق نے افسانے کی تنقید کے بارے میں اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے لکھا:

> ''آزادی کے بعد سے اب تک افسانے کی تنقید پر کوئی کتاب لکھی ہی نہیں گئی یا اگر لکھی گئی تو منظرِ عام پر نہیں آئی۔ ترقی پسند افسانہ نگاروں کو ان کے اپنے نقاد مل گئے تھے لیکن 1950 کے بعد نمایاں ہونے والی نسل کے

افسانہ نگاروں کے حصے میں کچھ چھٹ پٹ لکھنے والے ہی آئے ہیں اور وہ
بھی کتنے ساتھ معلم، چار طالب علم، تین شاعر و نقاد اور باقی بے چارے
خود افسانہ نگار۔ نتیجے کے طور پر کسی نے چار خانے بنا کر ان میں سارے
افسانہ نگاروں کو ان کے افسانوں سمیت بھر دیا۔ کسی نے کج لجی، رومانیت
کو فنی معراج قرار دیا۔ تو کسی نے مین را کی کہانی ''وہ'' لے کر اس کی ایسی
تحلیل وتشریح کر ڈالی جو رتن ناتھ سرشار کے صف شکن بٹیر والے افیم چی
کے قصے پر بھی بالکل فٹ بیٹھتی ہے۔ اور وہ لوگ جو کچھ نہ کر سکے تھے
انھوں نے اس بات پر بغلیں بجانی شروع کر دیں کہ اُردو افسانہ اب دنیا
کی ترقی یافتہ زبانوں نے آنکھ ملانے کے قابل ہو گیا ہے۔''

پروفیسر صادق کی شناخت بیک وقت مصور، نقاد، محقق، شاعر، مترجم، صحافی اور مدیر کی ہے۔ لیکن انھوں نے اپنی اعتدال پرور تنقید اور استدلالی تحریوں سے اُردو ادب کو سوچنے اور چونکنے پر مجبور کیا ہے۔ اُردو ادب میں افسانے کی تنقید پر کوئی خاص توجہ نہیں دی جاتی تھی۔ وقار عظیم کی کتابوں 'داستان سے افسانے تک'، 'فنِ افسانہ نگاری'، 'نیا افسانہ' اور 'منٹو کا فن' کے علاوہ اس ضمن میں کوئی خاص کام انجام نہیں دیا گیا۔ البتہ کچھ ایک نقادوں نے افسانے کی ہیئت، اسلوب اور فن کے حوالے سے چند مضامین سپر دِ قلم کیے۔ لیکن پروفیسر صادق نے وقار عظیم کی روایت سے آگے نکل کر فکشن تنقید پر نہ صرف باقاعدہ مکمل کتاب لکھی بلکہ لاتعداد مضامین بھی سپر دِ قلم کیے۔ انھوں نے سب سے پہلے یہ ثابت کیا کہ اُردو کا اولین افسانہ ''گزرا ہوا زمانہ ہے'' (جو پہلی مرتبہ تہذیب الاخلاق میں 31 مارچ 1873 کو شائع ہوا)، پریم چند کا افسانہ ''دنیا کا سب سے انمول رتن'' نہیں۔ صادق صاحب نے اُردو افسانے کے ارتقائی سفر کے بارے میں طویل گفتگو کی ہے۔ اس ضمن میں ان کا خیال ہے کہ انشاءاللہ خاں انشا کی ''رانی کیتکی کی کہانی''، محمد حسین آزاد کی کتاب ''نیرنگ خیال'' وغیرہ میں افسانوی انداز تو موجود ہے لیکن انھیں باقاعدہ افسانہ کہنا صحیح نہیں۔ لیکن ان کی نظر میں سرسید احمد خاں واحد تخلیق کار ہیں جنھوں نے اُردو نثر کو تصنع اور تکلف سے پاک صاف کرا سے سلیس اور روانی عطا کی۔ اس لحاظ سے پروفیسر صادق نے ''گزارہوا زمانہ'' کے فن، انداز، پیش کش وغیرہ کے بارے میں لکھا:

''گزارہوا زمانہ نہ تو داستانوی انداز کی تحریری ہے اور نہ ہی قصہ، اسے نہ تو

تمثیل کے زمرے میں رکھا جا سکتا ہے اور نہ ہی مضمون کہا جا سکتا ہے
۔اپنی خامیوں اور کوتاہیوں کے باوجود یہ اُردو کا اولین افسانہ ہے۔ویسے
اسے افسانے کا نام دیتے ہوئے ہلکی سی ہچکچاہٹ بھی محسوس ہو رہی سکتی
ہے کیوں کہ اُردو افسانے نے جس برق رفتاری سے ترقی کی راہیں طے
کی ہیں اور آج ہم اسے جس منزل پر دیکھ رہے ہیں ''گزرا ہوا زمانہ'' اس
سے کہیں پیچھے، بہت پیچھے نظر آتا ہے۔اس کے اور آج کے افسانے کے بیچ
قریب ایک صدی کا فرق و فاصلہ ہے۔اس ایک صدی میں افسانے کی
تعریف اس کی شکل وصورت ،اس کی زبان ،اس کی تکنیک سبھی کچھ
تجربوں اور تبدیلیوں سے دوچار ہو چکی ہے۔پھر بھی ''گزرا ہوا زمانہ'' میں
بیج کے روپ میں وہ چیزیں موجود ہیں جو اسے داستانوں، تمثیلوں، قصوں
اور مضمونوں سے الگ کر کے افسانہ ثابت کرتی ہیں۔''

پروفیسر صادق اُن لوگوں سے نالاں ہیں جو اُردو افسانے کی موت کی پیشین گوئی علی الاعلان کرتے ہیں۔انھوں نے اپنے مضمون ''افسانہ زندہ ہے'' میں ایسے لوگوں کو تنقید کا نشانہ بنایا جو افسانے کے تاریک مستقبل کے لیے فکر مند ہیں اور اس خوش فہمی میں مبتلا ہیں کہ ٹیلی ویژن اور فلم کے دور میں افسانہ پڑھے گا کون؟ لیکن ان تمام باتوں کے باوصف پروفیسر صادق نے بہت ہی پتے کی بات اپنے مضمون کے اختتام پر لکھی ہے۔ان کا ماننا ہے کہ
''افسانے کا سفر ابھی ختم نہیں ہوا کیوں کہ انسان ابھی زندہ ہے اور افسانہ جاری ہے۔''

پروفیسر صادق ''اُردو افسانہ اور پریم چند کی روایت''' میں لکھتے ہیں کہ پریم چند نے اپنے عہد کی مروجہ رومانی اور طلسمی داستانوں سے علاحدہ اپنے لیے ایک نئی راہ بنائی۔اس میں کوئی شک نہیں کہ پریم چند نے وہی لکھا جو انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔پریم چند نے اُردو افسانے کی داغ بیل ڈالتے ہوئے اسے جذباتیت اور رومانیت سے پاک کیا۔ان کے افسانوں کے کردار آسمانی یا دیو مالائی نہیں ہوتے بلکہ اسی دنیا کے وہ عام انسان ہوتے ہیں جنھیں حاشیے پر دھکیل دیا گیا ہے ہے۔پروفیسر صادق نے اس مضمون میں پریم چند کی فکری اساس اور فکری جہتوں پر بھی تبادلۂ خیال کیا ہے۔اس مضمون کی قرأت سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ پریم چند نے ترقی پسند تحریک کے پہلے اجلاس میں شرکت کرتے ہوئے جو صدارتی خطبہ پیش کیا وہ ان کے دل کی آواز تھی۔ان کی نظر میں

حسن کا اعلا معیار صرف گورا رنگ اور محلوں اور حویلیوں میں پیدا ہونے والے افکار و نظریات نہیں تھے بلکہ گاؤں کے آخری کونے پر کھڑے آدمی کے حقوق کے لیے جدو جہد کرنا بھی حسن کا معیار تھا۔غریبوں اور ناداروں کی آواز بے حِس سماج کے کانوں تک بہم پہنچانا مقصد تھا۔ویسے پریم چند کے خیالات و افکار میں ترقی پسند نظریات پہلے سے ہی موجود تھے۔انھوں نے اس جلسے میں شرکت کے بعد اپنے افسانوں میں کھل کر ترقی پسند نظریات کی داخلی کیفیت کی اشاعت کرنا شروع کر دی تھی۔پروفیسر صادق نے اُردو افسانے پر پریم چند کے اثرات کے بارے میں لکھتے ہیں:

''اُردو افسانہ، پریم چند کے ہاتھوں ایک قلیل سی مدت میں کمسنی کی حدیں لانگھ کر اس مقام پر آ کھڑا ہوا جہاں سے بلوغت کی حدیں شروع ہوتی ہیں۔پریم چند بلاشبہ ایک عظیم افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اس فن کے تمام امکانات کو بروئے کار لا کر اسے اپنے عہد کی زندگی سے قریب تر کر دیا۔اُردو افسانہ میں حقیقت نگاری کی وہ روایت جو دردمندی اور انسان دوستی ،آزادی اور روشن خیالی اور ظلم و جبر کے خلاف احتجاج کی روایت کہی جاتی ہے....اس میں کوئی شک نہیں کہ ادب کو پرکھنے کے لیے جو کسوٹی پریم چند نے بنائی ہے اس پر ان کا ادب کھرا اترتا ہے کیوں کہ اس میں تفکر ہے ،آزادی کا جذبہ ہے، حسن کا جوہر ہے،تعمیر کی روح ہے، زندگی کی حقیقتوں کی روشنی ہے جو ہم میں حرکت، ہنگامہ اور بے چینی پیدا کرتی ہے۔''

پروفیسر صادق نے سجاد ظہیر کے فکشن کے بارے میں لکھا ہے فکشن کی دنیا میں ان کے پانچ افسانے اور ایک مختصر سا ناول ان کا قلیل ترین سرمایہ ہے۔لیکن اس قلیل فکشن سرمایے کے باوجود ان کا قد بہت اونچا ہے۔سجاد ظہیر جس زمانے میں اُردو فکشن میں داخل ہوئے وہ زمانہ تغیرات اور تجربات کا زمانہ تھا۔ان کی مشہور زمانہ افسانوی کتاب 'انگارے' میں شامل افسانوں میں ان کے تفکر اور سوچنے کے انداز کے دیدار جا بجا ہوتے ہیں۔صادق نے اپنے خیالات میں اس بات کا اظہار کیا کہ سجاد ظہیر نے بھلے ہی کم لکھا ہو لیکن ان کا وژن اپنے ہم عصر افسانہ نگاروں سے بہت آگے تھا۔وہ اپنے وقت سے آگے کی سوچ رکھنے والے انسان تھے۔لندن میں انھوں نے جس طرح کا ماحول انھوں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا یا جن نظریات کو انھوں نے پڑھا ان کا اطلاق ہمیں ان کے افسانوں میں ہوتا ہے۔سجاد ظہیر فرسودہ اور غیر ضروری مذہبی رسومات کے بالکل قائل نہیں تھے۔انھوں نے اپنے افسانے 'جنت کی

بشارت' میں اس کا کھل کر اظہار کیا ہے۔جنسی اور نفسیاتی استحصال کے وہ سخت مخالف تھے۔سجاد ظہر نے اپنے دوسرے افسانوں ''نیند نہیں آتی''، ''گرمیوں کی رات'' اور ''پھر یہ ہنگامہ'' میں جنسی اور نفسیاتی کش مکش کو قارئین کے سامنے پیش کیا ہے۔ان کے روشن خیالوں سے تنگ آ کر ہی انگارے پر پابندی لگانے کی آواز بلند کی گئی۔بہر کیف! صادق نے اس بات کو بہ بانگ دہل کہا کہ سجاد ظہیر، کے افسانے پریم چند کے افسانے سے بہتر ہیں۔انھوں نے یہ بھی لکھا کہ ترقی پسند تحریک کے وجود میں آنے سے پہلے ہی سجاد ظہیر نے سماج کی کھوکلی اور فرسودہ روایات کو منہدم کرنے کے لیے زمین ہم وار کی بلکہ اس تحریک میں وہ پیش پیش رہے۔شعور کی رو اور آزاد تلازمہ خیال کا استعمال انھوں نے اپنے ادب میں بہ خوبی پیش کیا۔پروفیسر صادق نے پریم چند اور سجاد ظہیر کے فکشن کا موازنہ کرتے ہوئے لکھا:

> ''مجھے یہ کہنے میں کوئی باک نہیں کہ جدید اُردو افسانے کا نقطۂ آغاز پریم چند کا شاہ کار کہا جانے والا افسانہ ''کفن'' نہیں بلکہ 'انگارے' کے وہ افسانے ہیں جنھوں نے پریم چند کو بھی راہ دکھائی۔اسی طرح جدید اُردو ناول کا نقطۂ آغاز بھی بلاشبہ سجاد ظہیر کا ناول ''لندن کی ایک رات'' ہے جو فسانۂ آزاد، امراؤ جان ادا، اور گؤ دان کے بعد اُردو ناول کا اگلا قدم قرار دیا جاسکتا ہے۔یہاں یہ ذکر بھی دل چسپی سے خالی نہ ہوگا کہ 1936 میں جب ''گؤ دان'' پہلی مرتبہ ہندی میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آیا تب تک سجاد ظہیر ''لندن کی ایک رات'' لکھ چکے تھے اور 1939 میں جب ''گؤ دان'' اُردو میں شائع ہوا تو اس سے پہلے ''لندن کی ایک رات'' چھپ چکا تھا۔اس طور اُردو زبان میں ''لندن کی ایک رات'' کی اشاعت ''گؤ دان'' سے پہلے عمل میں آ چکی تھی۔میرے نزدیک یہ دونوں ناول ایک دوسرے کا تکملہ کہے جا سکتے ہیں کہ ''گؤ دان'' میں ہندوستان کے غریب اور محنت کش طبقے کی زندگی کی حقیقی تصویر کشی ملتی ہے جب کہ ''لندن کی ایک رات'' میں ہندوستان کے تعلیم یافتہ نوجوان اور امیر زادوں کے تجربات و مشاہدات اور ان کی فکر و عمل کی فن کارانہ عکاسی ملتی

ہے۔"

پروفیسر صادق نے اپنے ابتدائی ایام میں "بھارتیہ بھاشاؤں کی پرتھم مولِک کہانی اور آدھیہ کتھا کار" عنوان سے ہندی میں مضمون لکھا۔اس مضمون میں موصوف نے ہندوستانی افسانہ نگاروں کی پہلی اصل کہانی کو اپنے مضمون میں شامل کیا۔اس مضمون میں انھوں نے یہ ثابت کیا کہ ہندوستانی زبانوں میں طبع زاد کہانی لکھنے کی ابتدا سب سے پہلے اُردو زبان میں ہوئی۔ان کا یہ مضمون رسالہ "ساریکا" میں ایک طویل مدت تک تواتر کے ساتھ شائع ہوتا رہا۔بعد میں مشہور ہندی فکشن ادیب کملیشور نے اسے اپنی کتاب "پہلی کہانی" میں شامل کیا۔

بہر نوع! پروفیسر صادق نے اپنی فکشن تنقید سے اُردو فکشن کو نہ صرف مالا مال کیا بلکہ اس سمت میں کار ہائے نمایاں بھی انجام دیے ہیں۔ان کا غالب کی زندگی پر لکھا گیا ڈراما "اس شکل سے گزری" غالب کی شخصیت کو تحقیقی وتنقیدی تناظر میں سمجھنے معاون ومددگار ثابت ہوا ہے۔اُردو فکشن کے حوالے سے ان کی استدلالی باتیں خطِ سنگ کا درجہ رکھتی ہیں۔البتہ تحقیق میں کوئی بات حرفِ آخر نہیں ہوتی پھر بھی ان کی باتوں کو نظر انداز کرنا آسان نہیں۔فکشن تنقید کی دنیا میں قدم رکھنے والوں کے لیے صادق کی کتابیں اور ان کے افکار ونظریات قابل تقلید ہیں۔موجودہ دور میں ایسے افراد کم ہی ہیں جن کا وسیع مطالعہ اور ہندوستان کی مختلف زبانوں کے ادب سے گہری واقفیت ہو۔اس معاملے میں صادق صاحب کا کوئی مقابلہ نہیں۔ہندی اور مراٹھی ادب پر ان جیسی دسترس رکھنے والے شاذ و نادر ادیب ہیں۔ان کی نگاہ میں فکشن تنقید عیب جوئی کا کام نہیں بلکہ زندگی کے خوب صورت کینوس کو سمجھنے میں تنقیدی رنگوں کو فراموش کرنا ناگزیر ہے۔آخر میں بس اتنا ہی کہنا چاہتا ہوں کہ صادق کی تنقید میں مصوری اور مصوری میں تنقید صاف محسوس کی جاسکتی ہے۔

مغربی بنگال کی اہم خاتون نثر نگاراں اوران کی خدمات

(تحقیق)

شاذیہ فخر

ریسرچ اسکالر، آسنسول

دنیا بھر کی تہذیب زبان ہی کی گود میں تربیت پاتی رہی ہے۔ کسی بھی تہذیب اور قوم کے افکار و خیالات میں زبان و ادب کا اہم کردار رہا ہے۔ کسی بھی قوم کی زبان کی تشکیل اور ادب کے فروغ میں خواتین کے الفاظ، محاورات اور لب ولہجہ کا دخل ہوتا ہے۔ زمانۂ قدیم سے لیکر آج تک عورت کی سماجی حیثیت ہر دور میں مختلف رہی ہے۔ مگر ہر صورت میں مادری نظام کو فوقیت رہی۔ اسلام کی آمد کے بعد خواتین نے علم وادب کے میدان میں گراں قدر خدمات انجام دیں۔ ہندوستان میں بھی مسلم حکومت کے قیام کے بعد خواتین کی علمی وادبی حیثیت ممتاز رہی۔ جس کی شروعات عورتوں کی تخلیق کردہ تخلیقات سے بہ خوبی ہوتی ہے۔ ملکہ نور جہاں، شہزادی زیب النساء، ماہ لقا، چندابائی، لطف انساء امتیاز وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اردو زبان کے داستانوی عہد میں اس دور کی تہذیب، معاشرت اور زبان کا بخوبی اندازہ لگایا جاسکتا ہے۔ یہ داستانیں اس دور کی نمائندہ ہیں۔ ان داستانوں کا اردو زبان وادب کے ارتقاء میں بنیادی حصہ رہا ہے۔

جہاں تک بنگال میں اردو ادب کا تعلق ہے تو اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ زمانۂ قدیم سے ہی یہ سر زمین اردو ادب کا گہوارہ رہی ہے۔ تیرہویں صدی سے اٹھارویں صدی تک کے اردو کے تشکیلی دور میں برصغیر کے دوسرے علاقوں کی طرح بنگالے نے بھی گیسوئے اردو کو سنوارنے میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔ بلکہ پورے آب و تاب کے ساتھ اپنے جلوے دکھاتی رہی۔ اردو کے دوسرے شہروں کی طرح یہاں بھی شعر وشاعری کی ایک دنیا آباد ہے۔

شاعری کے ساتھ ساتھ نثر نے بھی اپنا ہاتھ پاؤں نکالا۔ انیسویں صدی میں شاعری اور افسانوی ادب کا اگر جائزہ لیا جائے تو مردوں کے تخلیق کردہ ادب میں بھی نسائی لب ولہجہ کی جھلکیاں نظر آتی ہیں۔ یوں تو انیسویں صدی اردو نثر کے لئے مبارک اور سازگار ثابت ہوئی ہے کیونکہ ۱۸۰۰ء اردو میں نثر کے تحریری سرمائے کی ابتداء صوفیائے کرام کے اقوال اور ملفوظات سے ہوئی ہے لیکن جدید نثر کی ابتداء فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی جیسا کہ رام بابو سکسینہ لکھتے ہیں :

''اردو نثر کی ابتداء فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے ہوئی'' (تاریخ ادب اردو ص/۱۰)

بنگال کے معروف محقق و نقاد ڈاکٹر جاوید نہال اپنی تحقیقی کتاب ''انیسویں صدی میں بنگال کا اردو ادب'' میں رقم طراز ہیں :

''ایک قوم جو سات سمندر پار سے آئی تھی اور جس کا تسلط ہندوستان میں اس طرح بڑھتا چلا جاتا تھا جیسے ساون بھادو کی گھٹا آسمان پر چھا جاتی ہے اس نے اردو کی دست گیری کی اور وہ اس لئے کہ ہندوستان سے واقف ہونے اور یہاں کی مہذب سوسائٹی میں ملنے جلنے کے لئے اس کا جاننا ضروری تھا۔'' (مقدمہ گلشن ہند، لاہور۔۱۹۰۶ء)

یوں تو فورٹ ولیم کالج کا قیام کمپنی کی ضروریات کے لئے عمل میں آیا تھا لیکن اس سے اردو ادب اور خاص کر نثری ادب کو بے حد فائدہ پہنچا اور فورٹ ولیم کالج کا قیام یعنی ۱۸۰۰ء سے ۱۸۴۵ء تک کا عرصہ بنگال کے ادب کا ہی نہیں بلکہ اردو کے نثری ادب کا ''عہد زریں'' کہلاتا ہے۔ یہ کہنا درست ہوگا کہ اس کالج کے قیام سے ہی اردو نثر کو تحریک ملی۔ جیسا کہ ڈاکٹر شانتی رنجن بھٹاچاریہ لکھتے ہیں :

''صحیح معنوں میں ادبی نثر کی باضابطہ تحریک فورٹ ولیم کالج کلکتہ سے شروع ہوئی اور بول چال کی زبان سے قریبی تعلق رکھتے ہوئے صفائی اور سلاست کے لحاظ سے ادبی نثر کی پہلی اینٹ اسی کالج میں رکھی گئی'' (پندرہ روزہ مغربی بنگال کلکتہ سے ماخوذ)

اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ فورٹ ولیم کالج اپنے وجود میں ایک تحریک کی حیثیت رکھتی ہے اور یہ تحریک اردو نثر کے ارتقا کی طرف پہلا قدم تھا۔ اردو نثر کا پہلا شاہکار باغ و بہار ہے۔ یوں تو اس سے پہلے بھی اردو نثر میں کتابیں موجود تھیں لیکن ان کا انداز مصنوعی، زبان گنجلک اور فارسی آمیز تھی۔ باغ و بہار، آسان، سادہ اور عام فہم زبان کا پہلا نمونہ ہے۔ یوں تو اردو نظم کی طرح اردو نثر کا سہرا دکن کے ہی سر ہے لیکن جدید نثر کی جنم بھومی بنگال کو کہا جاتا ہے۔

۱۸۰۰ء میں جب فورٹ ولیم کالج کا قیام عمل میں آیا تو یہیں سے اردو نثر کی باقاعدہ تحریک شروع ہوئی اور نثر کا ابتدائی اسلوب وجود میں آیا۔ تحقیق سے یہ بات ثابت ہوتی ہے کہ اردو میں طبع زاد افسانہ نگاری علامہ راشد الخیری کی کہانی ''ناثر اور خدیجہ'' ۱۹۰۳ء سے شروع ہوئی اسی سال سے خواتین فنکاروں کے افسانے بھی منظر عام پر آنے لگے۔ اکبری بیگم نے ''گلدستۂ محبت'' ۱۹۰۳ء لکھ کر بسم اللہ کیا۔ پھر صغریٰ ہمایوں کی کہانی ''مشیر نسواں''

(۱۹۰۶ء) طبع ہوئی اور ۱۹۱۵ء میں عباسی بیگم ''گرفتار قفس'' نذر سجاد حیدر ''خونِ ارمان'' آصف جہاں ''شش وپنج'' اور انجم آزاد ''ریل کا سفر'' وغیرہ کئی افسانے شائع ہوئے۔

یوں تو بنگال میں اردو افسانے کا باقاعدہ آغاز ۱۹۳۵ء کی تحریک کے ساتھ ہوا لیکن اس سے قبل یہاں ترجمے کا کام زیادہ ہوا جس میں مرد قلمکار کے ساتھ ساتھ خواتین قلمکاروں کا بھی ذکر ملتا ہے ان میں راحت آرا بیگم، طاہرہ دیوی شیرازی، خجستہ بانو، سہروردیہ بیگم، ڈاکٹر فرحت آرا کہکشاں، عذرا مناظ، نصرت جہاں، ڈاکٹر یاسمین اختر، خالدہ حسینی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔

غرض نثر کی وہ کوئی بھی صنف ہو خواہ ترجمہ، افسانہ، ناول پر بھی مستقل مزاجی کے ساتھ خواتین نے اپنے قلم کے جوہر دکھائے۔ ان خواتین ناول نگاروں میں بیگم مرزا احمد علی کا ناول ''سرلا'' (۱۹۶۰ء)، ناول ''خواب بے داری'' (۱۹۶۷ء)، ''موت کا سایہ'' (۱۹۷۱ء) اور ''گم نام ہم سفر'' (۱۹۷۶ء) کی خالق ایس۔ کے۔ صغریٰ سبزواری ''وفا کی ڈور'' (۱۹۷۴ء) کی خالق روحی قاضی، ناول ''جہاں آرا'' (۱۹۹۸ء) کی خالق کبریٰ بیگم اور ''دکھ کے بادل سکھ کی پھوار'' اور ''روٹھی طوفان سے ساحل تک'' کی خالق ثریا محمود ندرت کے نام قابل ذکر ہیں۔

اولین دور کی اگر ہم بات کریں تو راحت آرا بیگم خواتین افسانہ نگار کا وہ نام ہیں جو قابلِ احترام کا حامل ہے۔ آپ بنگال کی تہذیب اور کلچر سے بے پناہ محبت کرتی تھیں۔ آپ نہ صرف اچھی افسانہ نگار گزری ہیں، بلکہ مقالہ نگار، ڈرامہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی مترجم بھی تھیں۔ آپکو بنگلہ زبان پر دسترس حاصل تھی۔ آپ نے بنگلہ کے مشہور افسانوں کا اردو ترجمہ بھی کیا تھا۔

خجستہ بانو سہروردیہ بیگم کو ادب سے کافی دلچسپی تھی۔ وہ انگریزی مصنفین کے علاوہ مشہور نثر نگار مولانا راشد الخیری کی مقتقد خاص تھیں۔ انہوں نے انگریزی کے مشہور مصنف سر ہنری وڈ کے ایک ناول کا ترجمہ بھی کیا اور اسکا نام ''آئینۂ عبرت'' رکھا۔

ڈاکٹر شائستہ اختر سہروردی ۱۹۱۵ء میں کلکتہ کی فضا میں اپنی آنکھیں کھولیں ۱۹۴۶ء میں ہندوستان میں ہونے والی اسمبلی انتخابات میں وہ بنگال اسمبلی کی رکن منتخب ہوئیں۔ آپ ایک کامیاب افسانہ نگار تھیں۔ آپ تواتر سے افسانے لکھتیں۔ آپ کا پہلا افسانہ ''عصمت'' دہلی میں شائع ہوا۔ آپ کے افسانے ''ہمایوں''، ''ادبی دنیا''، ''تہذیب نسواں'' اور عالمگیر جیسے معیاری رسالوں میں چھپتے رہے۔

ان کے بعد جن خواتین قلمکاروں کا ذکر آتا ہے وہ ڈاکٹر فرحت آرا کہکشاں، نصرت جہاں، ڈاکٹر

یاسمین اختر، عذرا مناظ اور خالدہ حسینی کا ہے۔

ڈاکٹر فرحت آراء کہکشاں کئی زبانوں کی واقف کار ہیں اسی لئے ترجمہ نگاری ہو یا افسانہ نگاری کا فرض بڑی آسانی سے انجام دیتی ہیں۔ آپ انگریزی اردو زبان پر بھی دسترس رکھتی ہیں اور انہیں زبانوں میں ترجمہ بھی کرتی ہیں۔ آپ نے اپنے ایک مقالے کا ترجمہ اردو زبان میں کیا جو بھاگل پور یونیورسٹی کے جنرل میں شائع ہوا۔ اس مقالے کا عنوان ''اقبال اور ٹیگور'' تھا۔

نصرت جہاں کی پیدائش کلکتہ میں ہوئی۔ آپ کی وابستگی درس وتدریس سے ہے۔ انہوں نے نہ صرف ترجمہ نگاری میں اپنے قلم کا جوہر دکھایا بلکہ افسانہ نگاری میں کمال کی قدرت رکھتی ہیں۔ آپ نے جن کہانیوں کا ترجمہ اردو میں کیا تھا وہ سب کہانیوں کے مجموعے ''گل پوش لیپو'' میں شامل ہیں۔

ڈاکٹر یاسمین اختر ایک معتبر نثر نگار اور افسانہ نگار ہیں ترجمہ نگاری بھی انکا محبوب مشغلہ ہے۔ آپ کی تخلیقات اکثر اخبارات و رسائل کی زینت بنتی رہتی ہیں۔ آپ کلکتہ گرلس کالج میں پروفیسر ہیں۔ آپ بنگلہ زبان سے اردو میں ترجمہ کرتی ہیں بنگلہ شاعری اور نثر دونوں اصناف سخن کے ترجمے سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ خصوصاً ٹیگور، نذرل اور سرت چندر کی تخلیقات کے تراجم قابلِ ذکر ہیں۔

عذرا مناظ ایک معتبر افسانہ نگار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک اچھی مترجم بھی ہیں۔ آپ اردو، انگریزی اور بنگلہ زبانوں سے اچھی طرح واقف ہیں۔ انہوں نے ٹیگور کی کہانیوں کا بنگلہ سے اردو میں ترجمہ بھی کیا۔ انہوں نے بھبھوتی بھوشن چٹوپادھائے کی کہانی ''ڈاکاتر پرونامی'' کا اردو زبان میں ''ڈاکوؤں کی سلامی'' کے نام سے اور بیلہ مجمدار کی کہانی ''جادوگر'' کا بھی انہوں نے اردو میں ترجمہ کیا۔

خالدہ حسینی کا شمار بنگال کی کامیاب افسانہ نگار، محقق، اچھی مقالہ نویس، شاعرہ اور بہترین مترجم میں ہوتا ہے۔ آپ کی معرکتہ الآرا تصنیف ''ایشیاٹک سوسائٹی'' کلکتہ کی خدمات فارسی'' ہے جو ۱۹۹۷ء میں منظر عام پر آئی۔ آپ ہندی زبان سے اردو میں ترجمہ بھی کرتی ہیں۔ ممبئی، کلکتہ، دہلی اور حیدرآباد کے رسائل میں ہمیشہ چھپتی رہتی ہیں۔ ۲۰۱۸ء میں آ کی نظموں اور متفرق شخصی، ادبی اور معلوماتی مضامین پر مبنی ایک ۴۴۸ صفحات کی ضخیم کتاب ''فکر واحساس'' کے عنوان سے منظر عام پر آئی۔ اس کتاب کے مطالعے سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ محترمہ کے اندر بے شمار صلاحیتیں پوشیدہ ہیں۔ مستقبل میں ان سے اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔

ساتویں دہائی طلوع ہوتے ہی ترقی پسند تحریک کا خاتمہ ہوگیا نئے قاری اور نئی نسل پیدا ہوئی جس نے نئ

علامتوں کی جستجو اور اساطیری ادب کا مطالعہ کیا۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ 60 سے 80 تک سیاسی، تہذیبی، معاشرتی اور ثقافتی سطح پر بہت سے انقلابات آئے روایت سے بغاوت ہماری تاریخ کی ایک جیتی جاگتی مثال بن گئی ہے۔ اسی دور میں بنگال کی خاتون قلمکاروں کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے جن میں روحی انعام، فخر النساء کریم، شہیر مسرور، ڈاکٹر شہناز نبی، کہکشاں پروین، کلثوم ناز، ڈاکٹر شاہین سلطانہ صابرہ خاتون حنا وغیرہ کے اسم گرامی قابل ذکر ہیں۔

بنگال کی خاتون افسانہ نگاروں کا کارواں راحت آرا کے بعد جن ناموں کا احاطہ کرتا ہے۔ ان میں ایک نام روحی قاضی کا بھی آتا ہے۔ روحی قاضی کے افسانے ملک کے معیاری رسائل ''خاتون مشرق'' دہلی اور ''سہیل'' گیا میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کا دو افسانوی مجموعہ ''سُلگتی چاندنی'' (۱۹۷۱ء) اور ''نئی کہانی'' (۱۹۹۷ء) میں منظر عام پر آئی۔ ان کے افسانوں میں نئے رجحانات اور جدید ہیت کے التزام کے باوجود روایتی قدروں کا احترام بھی پایا جاتا ہے۔ آپ نہ صرف اچھی افسانہ نگار ہیں بلکہ ایک کامیاب ناول نویس بھی ہیں آپ کا دو ناول ''وفا کی ڈور'' اور ''شامِ غم'' طبع شدہ ہیں۔

فخر النساء کریم سرزمین بنگال سے تعلق رکھنے والی ایک فعال افسانہ نگار تھیں آپ کے افسانے ملک کے مختلف رسائل وجرائد میں شائع ہوتے رہے۔ آپ کا ایک افسانہ ''یہ نہ تھی ہماری قسمت'' کے عنوان سے شائع ہوا۔ آپ کا ایک افسانوں کا مجموعہ ''ماضی کے جھروکے سے'' ۱۹۹۰ء میں زیور طباعت سے آراستہ ہوکر منظر عام پر آکر داد حاصل کر چکا ہے۔ فخر النساء کریم کی زبان صاف ستھری اور رواں ہے۔ ان کے افسانوں میں سماج کے دکھ درد اور کرب نمایاں ہیں۔ فنی اعتبار سے انکے افسانے بیانیہ ہیں اس لئے وہ ترسیل میں پورے طور پر کامیاب نظر آتی ہیں۔

بنگال کی جدید خواتین افسانہ نگاروں میں شہیرا مسرور کا مقام کافی بلند ہے وہ ملک کے معیاری رسائل و جرائد میں تواتر سے چھپتی رہتی ہیں۔ ''آگ بجھی ہوئی نہ جان'' آپ کی پہلی کہانی ہے جو ۱۹۷۶ء میں رسالہ خاتون مشرق میں چھپی۔ ''سفر سے واپسی'' ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے جو ۱۹۹۰ء میں منظر عام پر آیا۔ ان کے افسانوں میں ''آگ بجھی ہوئی نہ جان'' اور ''نسلوں کی کیل میں ٹنگا رشتہ'' اور ٹائٹل افسانہ ''سفر سے واپسی'' اردو ادب کے قابل ذکر افسانے شمار کئے جاتے ہیں جس کی مجموعی فضا خانگی اور گھریلو ہے۔ آپ نئی نسلوں کے لئے مشعل راہ ہیں۔ انکے افسانے اردو ادب میں سنگ میل کی حیثیت رکھتے ہیں۔

بنگال کی سرزمین پر گزشتہ چار دہائیوں سے دور حاضر تک مختلف اصناف پر تواتر کے ساتھ اپنے نقوش مرتسم کرنے والی ڈاکٹر شہناز نبی نہ صرف ایک خوش فکر شاعرہ ہیں بلکہ ایک کامیاب افسانہ نگار، ڈارمہ نگار، مترجم، محقق اور بالغ نظر ناقد بھی ہیں۔آپ کا ایک افسانہ ''ڈاکٹروں کی بستی'' کافی مشہور ہے۔آپ بچوں کے لئے بنگلہ زبان سے ترجمہ شدہ ڈرامے بہ عنوان ''دو بچوں کے ڈرامے'' ۱۹۸۹ء میں منظر عام پر کتابی شکل میں لائیں۔آپ کی کئی تحقیقی وتنقیدی کتابیں بھی منظر عام پر آچکی ہیں۔جن میں ''لسانیات اور دکنی ادبیات''، ''صید ہوس''،'' بیدی۔ ایک جائزہ''، ''منشوراتِ بنگالہ''، '' کلام نساخ'' (۲۰۰۷ء)،'' تانیثی تنقی'' (۲۰۰۹ء)، ''فیمنزم''،'' تاریخ وتنقید'' (۲۰۱۲ء)اوران کے مضامین کا مجموعہ ''تنقیدی مطالعہ'' قابل ذکر ہیں۔شہناز نبی اپنے موضوع کے ساتھ بھر پور انصاف کرتی نظر آتی ہیں۔شہناز نبی کے یہاں ترقی پسند تحریک کی گونج صاف طور پر سنائی دیتی ہے۔اس بات میں کوئی دورائے نہیں ہے کہ شہناز نبی کا ذہن ترقی پسند ہے۔

تسکین واسطی پر انکے ماما سید سہیل واسطی جو بنگال کے معروف افسانے نگار تھے انکے اثرات صاف طور پر دیکھنے کو ملتے ہیں۔انہوں نے بھی ماما سہیل واسطی کی طرح افسانوی ادب سے اپنی وابستگی کو افضیلت دی۔ آپ کی پہلی تخلیق '' آزادصدا'' کے عنوان سے جمشید پور، کالج میگزین میں چھپا۔اسکے بعد تسکین افسانے کی طرف راغب ہوئیں۔ آپ کا پہلا افسانہ ''سوکھی پتی'' بنگال کے معیاری جریدہ ماہنامہ ''انشاء'' کولکاتا میں مارچ/اپریل ۲۰۲۰ء میں چھپا، اسکے بعد دوسرا اور تیسرا افسانہ بھی ''انشاء'' جیسے نمائندہ رسالے میں شائع ہوا۔ ''انشاء'' کے مئی جون ۲۰۲۱ء کے شمارہ عید نمبر میں بہ عنوان ''عید کا تحفہ'' اور سالنامہ جنوری/فروری ۲۰۲۲ء کے شمارے میں ''چکی'' کی اشاعت ہوئی۔اس طرح ان کے ابتدائی دور کی یہ کہانیاں بنگال کے معیاری رسالے میں جگہ پائیں جس سے ان کے افسانے کے معیار کا تعین کیا جاسکتا ہے۔اردو کے معیاری جریدوں میں '' آج کل'' دہلی، '' شاعر'' ممبئی اور '' انشاء'' کولکاتا جیسے اہم جرائد میں نووارد قلمکاروں کی تخلیق کی اشاعت اس بات کا ضامن ہوتا ہے کہ فن کار کے اندر ادبی نمو کی قوت موجود ہے اور مستقبل میں ان سے معیاری افسانے کی امید کی جاسکتی ہے۔

ڈاکٹر شاہین سلطانہ صدر شعبہ اردو لیڈی برابورن کالج کلکتہ، اردو ادب میں اپنی ایک الگ شناخت رکھتی ہیں۔آپ انگریزی ادب میں بھی اچھی دسترس رکھتی ہیں۔ان کی ایک انگریزی کتاب '' Right step to success'' شائع ہوچکی ہے۔ان کی تحقیقی کتاب ''جدید اردو شاعری میں ہندوستانی اور عالمی مسائل کی عکاسی'' کے عنوان سے ستمبر ۲۰۱۶ء میں منظر عام پر آکر داد وتحسین حاصل کرچکی ہے۔جس میں انہوں نے شاعری کے

حوالے سے ہندوستان کے سلگتے ہوئے مسائل پر بھرپور روشنی ڈالی ہے۔ڈاکٹر شاہین سلطانہ بنیادی طور پر افسانہ نگار ہیں۔ان کا افسانوی مجموعہ بھی ''نیا گھر'' کے عنوان سے شائع ہو چکا ہے۔

کلثوم ناز ۱۹۷۰ء بنگال کے معروف فولادی شہر کلٹی میں پیدا ہوئیں۔آپ علمی وادبی گھرانے سے تعلق رکھتی ہیں۔آپ کلٹی کے استاد شاعر عاشق کلٹوی کی نواسی ہیں اور شاعر این۔اے ذکی کی بھانجی بھی ہیں۔محترمہ کو اپنے ماما اور نانا کی صحبتوں کا بھرپور اثر ہے اس لئے آپ کو ادب سے گہری دلچسپی رہی اسی دلچسپی نے آپ کو شاعری اور افسانے کی طرف متوجہ کیا۔آپ نے شاعری تو کم کی مگر آپ نے افسانے تواتر سے لکھے ل،آپ کی شاعری اور افسانے کے نمونے دستیاب نہیں۔آپ کا ایک افسانہ ''کنویں کا قیدی'' شائع ہو چکا ہے۔محترمہ کے افسانوں کی عظمت ان کے تصورات اور احساس کے بے پناہ کرب میں پنہاں ہے۔

ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا نئی نسل کی سنجیدہ اور باصلاحیت قلم کار ہیں۔آپ کے کئی افسانے اخباروں کی زینت بن چکے ہیں۔آپ نہ صرف افسانہ نگار ہیں بلکہ ایک اچھی شاعرہ بھی ہیں۔آپ مضامین بھی خوب لکھتی ہیں۔آپ کی پہلی کہانی '' آخری گلاب'' اخبار مشرق گلدستہ، کولکاتا میں چھپی۔علاوہ ازیں ان کے افسانے دیگر رسائل واخبارات میں شائع ہوتے رہے ہیں۔آپ کا ایک افسانہ بہ عنوان ''ایشور تیرا بھلا کرے گا'' کافی مقبول ہوا۔ان کا ایک افسانچہ ''دھرم بھرشٹ'' کلٹی سے شائع ہونے والے مجلّے غزلنامہ (۳) میں شامل اشاعت ہے۔

صوفیہ شیریں اپنے اصل نام سے ہی ادب میں متعارف ہیں۔آپ اپنے افسانے،تنقیدی مقالے اور ادبی سیمینار میں اپنی شراکت سے مغربی بنگال کے جدید منظرنامے میں رنگ بھرتی نظر آرہی ہیں۔صوفیہ کی ابتک تین کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں پہلی کتاب ''منٹو کی خاکہ نگاری'' (۲۰۱۶ء) ہے جو تحقیقی وتنقیدی مضامین کا انتخاب ہے۔دوسری تصنیف ''شین مظفر پوری ایک ہمہ جہت شخصیت'' (۲۰۱۸ء) کی اشاعت ہے اور تیسری کتاب ''شین مظفر پوری کے منتخب افسانے'' (۲۰۱۹ء) میں منظر عام پر آئی۔ان کتابوں کے مطالعے سے محترمہ کی صلاحیت کا بھرپور اندازہ ہوتا ہے۔

جہاں تک ہماری نگاہ جاتی ہے تو ہمیں ۸۱ تا حال کی دہائی میں خاتون افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست سامنے نظر آتی ہے۔جنھوں نے اردو ادب کو کئی لازاول افسانے دیے۔جن میں نئی اور پرانی نسلوں کے قلمکار موجود ہیں جو اپنی پوری آب وتاب کے ساتھ اپنے فن کی جولانی دکھا رہی ہیں ان میں مسرور تمنا،صبیحہ سُنبل، طلعت انجم فخر،نورالصباح،شہلا یاسمین،شاذیہ فخر (راقم الحروف) فاطمہ خاتون،صبیحہ تزئین وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

بنگال کی خواتین افسانہ نگاروں کے صف میں مسرور تمنا کسی تعارف کی محتاج نہیں۔ان کے علمی، ادبی اور نثری کارنامے ہی ان کی عظمت کا بیان ہیں۔آپ کا پہلا افسانوی مجموعہ ''بہاروں کی آہٹ'' ۲۰۰۹ء میں منظر عام پر آئی۔انکا دوسرا افسانوی مجموعہ ''مہکتے خواب'' کے نام سے شائع ہوا جو قابل ذکر ہیں۔اس مجموعے میں شامل اکثر افسانے کہانی کی بنت کرداروں کی مناسب تکنیک اور بندش کے لحاظ سے ان کے واقعات و حادثات کا سامنا کرنے کی خوبی افسانوں اور محولہ بالا مجموعے کی جان ہے۔اسی طرح ان افسانوں میں جو منظر کشی کی گئی ہے وہ اپنی مثال آپ ہے۔اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ مسرور تمنا ایک فعال قلم کار ہیں جو اپنے افسانوں میں عصری تقاضوں کا لحاظ رکھتی ہیں۔

فاطمہ خاتون نووارد افسانہ نگار ہیں۔فاطمہ تواتر سے افسانے لکھ رہی ہیں۔انکے افسانے روزنامہ اخبار مشرق کولکاتہ کے ادبی ایڈیشن کے علاوہ ''شہر نشاط'' پندرہ روزہ اور دیگر ادبی رسائل و جرائد میں چھپتے رہے ہیں۔ انکے افسانوں میں ''محبت''، ''دوستی''، ''میرا گھر''، ''رنگ بدلتی زندگی'' وغیرہ قابلِ ذکر ہیں۔آپ کا پہلا افسانہ'' امید پر ٹنگا انسان'' اخبار مشرق کولکاتہ میں شائع ہوا۔مستقبل میں اردو ادب کو آپ سے اچھی امیدیں وابستہ ہیں۔

صبیحہ سُنبل کو ادب وراثت میں ملی ہے۔ان کے والد محترم جناب احسان ثاقب ایک معروف شاعر ہی نہیں بلکہ ایک عمدہ افسانہ نگار بھی ہیں۔صبیحہ سُنبل ایک فعال قلمکار ہیں۔آپ کی پہلی کہانی بہ عنوان ''جلتا ہوا موسم'' رسالہ باجی، دہلی ۲۰۰۱ء میں شائع ہوئی۔اسکے بعد تواتر سے انکے افسانے اردو کے ادبی رسالوں اور اخبارؤ میں شائع ہوئے۔انکے افسانوں میں ''خوشبودار ہوا کی واپسی'' اور'' آج کا گاندھی'' قابل ذکر ہیں۔ ان کے افسانوں میں ازدواجی زندگی کی گھر دری سچائی اور تلخ و شیریں واقعات کا اظہار ملتا ہے۔ان کے افسانوں کے مطالعے سے محترمہ کی تخلیقی صلاحیت کا بھر پور اندازہ لگایا جا سکتا ہے۔

طلعت انجم فخر نسائی ادب کی ایک فعال افسانہ نگار ہیں۔جنہوں نے بے شمار افسانے اس نوعیت کے لکھے جن کے بنا پہ انہیں ۹۰ کی دہائی کی نسائی قلمکاروں کی جماعت میں سر فہرست رکھا جائے گا۔انہوں نے اتنی کم مدت میں ہی اردو ادب کو چار کتابیں دہی ہیں۔جن میں '' رونق نعیم لفظوں کے آئینے میں''، مناظر عاشق ہرگانوی پچھم بردوان کے ناقدین کا محاسبہ''، نسوانی چیخ'' (افسانوں کا مجموعہ) اور'' نگارشاتِ فخر'' مضامین کا انتخاب قابل ذکر ہیں۔محترمہ شاعری بھی کرتی ہیں۔شاعری میں زیادہ نظم سے دلچسپی رکھتی ہیں۔ان کی نظمیں، غزلیں مختلف جریدوں اور اخباروں میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔طلعت انجم فخر افسانہ نگاروں کی ایسی جماعت میں شامل ہیں

جنہوں نے اپنے قلم کو تانیثی ادب کے لئے وقف کیا ہے۔ان کے زیادہ تر افسانے معاشرتی حقائق اور سماجی موضوعات پر قلم بند ہیں۔انہوں نے عورت اور سماج کے مابین مسائل کو بنیاد بنا کر زیادہ تر کہانیاں لکھی ہیں۔ طلعت انجم فخر کی ادبی پیش رفت سے نسائی ادب خصوصاً بنگال کا مستقبل روشن و تابناک نظر آتا ہے۔

نور الصباح خواتین قلمکاروں میں ایک الگ شناخت رکھتی ہیں۔جن کے افسانے خواتین کے جذبات واحساسات کی ترجمانی کرتے ہیں۔آپ مختلف جریدوں اور اخباروں میں شائع ہوتی رہتی ہیں۔آپ مضامین کے علاوہ افسانے بھی لکھتی ہیں۔آپ کی پہلی تخلیق ''عجیب خواب'' کے عنوان سے ۲۰۰۳ء میں رسالہ اخبار مشرق روز نامہ کولکاتا میں شائع ہوئی۔درحقیقت نور الصباح اپنے افسانوں میں سماج کی ان خواتین کی ترجمانی کی ہے جو گھر کی چہار دیواری میں بند تھیں اور ان کی آواز باہر نہیں نکل سکتی تھی۔ایسی خواتین کو انہوں نے زبان دی اور بڑی کامیابی کے ساتھ ان کے درد وکرب کو پیش کیا۔ان کی زبان میں سلاست اور روانی ہے اور انداز بہت سیدھا سادہ ہے۔ان کا ایک افسانہ ''ایک بیوہ کی عید'' کے عنوان سے شائع ہوا۔محترمہ کا یہ افسانہ آسنسول کے معروف رسالہ اطلاعِ عام کے اپریل/ جون ۲۰۰۶ء کے شمارے میں چھپا تھا۔نور الصباح عورتوں کی نفسیات، دکھ، درد اور کرب کی بڑی کامیاب عکاسی کرتی ہیں اس پر ان کا انداز بیان انہیں دلچسپ بناتا ہے۔

صبیحہ تزئین بھی مضامین لکھتی ہیں اور افسانہ نگاری سے بھی گہری رغبت ہے۔محترمہ بھی افسانوی ادب کو اپنا میدان عمل بنا چکی ہیں۔ان کے افسانے ملک کے مختلف ادبی رسائل اور اخبارات میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔ محترمہ بنگال کے ادبی منظرنامے میں اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

خواتین افسانہ نگاروں کی بھیڑ میں شہلا یاسمین کسی تعارف کی محتاج نہیں۔رانی گنج کی شہلا یاسمین بطور افسانہ نگار و شاعرہ ادب میں اپنی شناخت بنا رہی تھیں۔ان کی تخلیقات اخبارات و رسائل کی زینت بھی بنتی رہتی تھیں۔لیکن ازدواجی الجھنوں میں الجھکر ادھر کچھ عرصے سے وہ بالکل خاموش ہیں۔

شاذیہ فخر (راقم الحروف) بھی شاعرہ و ادیبہ ہے۔راقم کے افسانے، مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہتے ہیں۔(راقم) ایک صاف ستھرا ادبی ذوق رکھتی ہے۔راقم نے بنگال کے معروف افسانہ نگار ڈاکٹر عشرت بیتاب کے افسانچوں کا انتخاب ''برہنہ سوچ'' کا اردو سے ہندی میں ''ننگن سوچ'' کے عنوان سے ترجمہ بھی کیا ہے۔جو ابھی زیر اشاعت ہے۔۲۰۱۸ء میں پہلی تحقیقی کتاب ''پچھم بردوان کا نسائی ادب'' منظر عام پر آچکی ہے۔اس سلسلے میں T.D.B رانی گنج کالج کی پروفیسر ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا یوں رقم طراز ہیں :

''شاذیہ فخر نے بہت کم عمری میں افسانچہ نگاری کے ذریعہ ادبی دنیا میں قدم رکھا ہے۔ان کی ایک تحقیقی کتاب ''پچھم بردوان کا نسائی ادب'' بھی ۲۰۱۸ء میں منظر عام پر آچکی ہے جس سے موصوفہ کے ذہنی و ادبی ارتقاء کا اندازہ ہوتا ہے۔''

(حرف احتساب سے ماخوذ۔ص ۱۱۹/۱۱۸)

صوبائی طور پر اس کتاب کو کافی پسند کیا گیا۔راقم کی دوسری تصنیف مینارِ فکروفن : معراج احمد معراج کے عنوان سے ۲۰۲۱ء میں منظر عام پر آئی جس میں معراج احمد معراج کی حیات و خدمات کے علاوہ ان کی نثری و شعری تخلیقات کے جائزے کا احاطہ کیا گیا ہے۔استاد شاعر معراج احمد معراج ایک جگہ (راقم) کے سلسلے میں رقمطراز ہیں :

''شاذیہ فخر ایک ہونہار طالبہ کے ہم رکاب ایک خوش فکر شاعرہ اور حرف شناس افسانہ نگار ہیں۔انکی پیدائش بہار کے راجگیر (نالندہ) میں ہوئی۔ان کا اصل کا نام شاذیہ پروین ہے اور شاذیہ فخر کے نام سے دنیائے شعر و ادب میں اپنی پہچان بنا رہی ہیں۔اردو میں ایم۔اے کی ڈگری حاصل کی ہے اور ابھی مگدھ یونیورسٹی سے ڈاکٹریٹ کی ڈگری کے لیے جی توڑ محنت کر رہی ہیں۔''

(تعارف نامہ، کتابی سلسلہ ۲ میں شامل مضمون شاذیہ فخر ادبی محاسن کے تناظر میں، ص۔۵۶/۵۵)

علاوہ ازیں شگوفہ تمنا، سہانہ پروین، ریشما پروین، درخشاں انجم بھی مستقل مزاجی سے نثر نگاری کی طرف مائل ہیں ان کے مضامین بھی تواتر سے شائع ہوتے رہتے ہیں۔ یہ لوگ سنجیدگی سے نثر لکھ رہی ہیں مضمون نگاری کے ساتھ ساتھ افسانچے کی طرف بھی مائل ہیں۔بنگال کے ادبی منظر نامے میں یہ سب اضافے کی حیثیت رکھتی ہیں۔

اس مختصر سے مقالے میں یوں تو مغربی بنگال میں نثر نگار خواتین کی ادبی خدمات کا سرسری جائزہ لیا گیا ہے۔لیکن اس سچائی سے انکار ممکن نہیں کہ یہاں نثر نگاروں بالخصوص خواتین نثر نگاروں کی کمی نہیں۔اٹھارویں صدی سے ہی یہاں خواتین نثر نگاروں کی ایک مضبوط جماعت رہی ہے جو تعداد میں کم سہی لیکن آج اکیسویں صدی کے آتے آتے ان کی تعداد اتنی کثیر ہوگئی کہ بغیر اس کے ذکر کے مغربی بنگال میں اردو ادب کے کینوس کو مکمل نہیں کہہ سکتے۔ سچی بات تو یہ ہے کہ مغربی بنگال کی خواتین نثر نگار خصوصاً نئی نسل، کامیاب فکشن نگار کی جو جماعت مسلسل عمل پیہم ہے ان سے بنگال کا نثری ادب یقیناً تابناک اور روشن ہے۔

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا

(مرزا غالب پر لکھا گیا ایک افسانہ)

نورالحسنین

جانے رات کا کونسا پہر تھا ۔مرزا کی اچانک نیند کھل گئی تھی ۔آسمان پر چاند روشن تھا اور سنہری کرنیں مرزا کی دیوڑھی پر برس رہی تھیں ۔مرزا نے اپنے بازو لیٹے ہوئے بنسی دھر کو دیکھا ۔دونوں پریوں کی کہانیاں کہتے کہتے دیوڑھی کے چھت پر ہی سو گئے تھے ۔مرزا کو بے چینی سی ہونے لگی اور خواب کھلی آنکھوں میں جھلملانے لگا تھا ۔کون تھی وہ؟ حور تھی یا پری؟ مرزا نے آسمان کی طرف دیکھا خواب کی پری کرنوں کے جھولے پر بیٹھی جھول رہی تھی ۔اُس کی مسکراہٹ تھی یا چاندی کے پھول برس رہے تھے ۔مرزا نے دیوانوں کی طرح بنسی دھر کو جگایا اور آسمان کی طرف دیکھنے کا اشارہ کیا۔

'' چاند بادلوں کی اوٹ میں جاوے ہے ۔۔۔'' بنسی دھر نے خمار آلود آنکھوں کو ملتے ہوئے کہا،'' اس میں نیا کیا ہووے ہے؟''

'' بنسی دھر اب تم سے کہوں تو کیا کہیں ۔ جو میری انکھیاں دیکھے ہے وہ تمہاری بصارت نہ ہووے ۔ آہ ۔۔۔میرا حال تو شاہ سراؔج کے اس شعر کی تفسیر ہووے ہے، مجھ پر اے محرم جاں پردۂ اسرار کوں کھول ☆ خوابِ غفلت سیں اُٹھا، دیدۂ بیدار کوں کھول۔

بنسی دھر نے حیرت سے مرزا کی طرف دیکھا اور مرزا کی نظریں آسمان کی جانب اُٹھ گئیں اور کانوں میں پائل کی چھم چھم کی آوازوں میں وہ کہہ رہی تھی، مجھے پہچان، اے وجاہت کے پیکر، میں عشق ہوں، میں نغمہ ہوں، میں دلبر بھی ہوں اور دلدار بھی ۔۔۔ محبت کے نازک حسین لمحات سے میں سیر ہو چکی ہوں ۔اب تو ہی میری منزل ہے میرے نوعمر دلبر ۔۔۔میں تجھ میں ایسا حلول کر جاؤں گی کہ تو میری ہی زبان بولے گا، اور تیرے ہر لفظ پر دنیا عش عش کرے گی، کیونکہ اب میں کسی دانشور کی پناہیں چاہتی ہوں، اور وہ تو ہے ۔۔۔میں تیرا انتظار کروں گی اور تو بھی میرا انتظار کر ۔۔۔انتظار ۔۔۔ہاں انتظار کر ۔۔ ۔''

آسمان پر سناٹا تھا اور چاند مسکرا رہا تھا۔

''بنسی دھر وہ کون ہوگی جو اس طرح مجھ سے مخاطب تھی۔'' لیکن بنسی دھر تو کب کا نیند کی آغوش میں جا چکا تھا۔

اس واقعے کے بعد دس بارہ برس کے لڑکے کی عجب حالت ہوگئی تھی ، وہ جو اپنے ہم عمر دوستوں کے ساتھ شطرنج، پتنگ بازی اور فقرہ بازی میں اپنا جواب نہیں رکھتا تھا، اب اپنے آپ میں ڈوبا ڈوبا سا رہنے لگا تھا، اُٹھتے بیٹھتے بار بار وہی چہرہ اُس کی آنکھوں میں دکھائی دینے لگا تھا۔ ایک مسلسل بے چینی تھی ۔وہ کبھی آگرہ کے جنگلوں کی طرف نکل جاتا، کبھی کبھی جمنا کے کنارے وہ گھنٹوں بیٹھا رہتا، بات کرتا تو لگتا زبان سے مصرعے جھڑ رہے ہیں ۔، دوست احباب اُس کی تلاش میں رہتے اور اُس کی عجب عالمانہ گفتگو کا لطف اُٹھاتے، اُس کی اس کیفیت نے اُس کے نانا کو بھی پریشان کر دیا، اور اُنھیں اس کا علاج اُس کی شادی ہی میں نظر آنے لگا۔ اُنھوں نے سلسلہ جنبانی شروع کیا اور آخر تیرا برس کی عمر میں اُس کی شادی دہلی کے ایک باثروت خاندان کے فرد مرزا الٰہی بخش کی بیٹی امراؤ بیگم کے ساتھ کر دی ۔ اُسی رات مرزا نوشہ نے اُسے چاند کی سنہری سیڑھی سے اُترتے ہوئے دیکھا۔ مرزا کی آنکھیں پلک مارنا بھول گئیں اور وہ اُن کے مقابل کھڑی تھی اور کہہ رہی تھی، ''مرزا نوشہ تیری اس شادی کا فیصلہ تیرے نانا کا نہیں میرا تھا۔ میں تجھے ادب کے پائے تخت دہلی پہنچانا چاہتی ہوں تا کہ تو باکمالوں کے درمیان رہے اور وہاں تیرے اور میرے عشق کا چرچہ ہو، تیری زبان سے میں بولوں اور داد تجھے ملے۔''

'' لیکن تو ہے کون؟ کچھ تو اپنے بارے میں بتا؟''

وہ حسینہ ایسے مسکرائی کہ ساری فضا روشن ہوگئی، اُس کے لبوں میں جنبش کیا ہوئی، ساری کائنات تھم گئی ،اُس کے الفاظ موتیوں کے خزانے لٹانے لگے،'' سن مرزا نوشہ۔۔۔ میں غزل ہوں، میں عشق ہوں، میں نغمہ ہوں، میں دلبر بھی ہوں اور دلدار بھی ، میرا سفر ایران سے شروع ہوا، ہندوستان میں میرے گیسوؤں سے پہلے پہل کس نے کھلواڑ کیا، مجھے یاد نہیں ۔۔۔ مجھے تو بس یاد ہے وہ زمانہ۔۔۔ میرے شباب کا زمانہ۔۔۔ جب دل ونظر کی تشنہ کامی کا علاج اربابِ نشاط کے عشوہ ادا میں ڈھونڈا جاتا ۔ یہاں کام و دہن کی تلخی بھی دور کی جاتی ،نظروں کے تیر، ہونٹوں کی سرخی، ابروؤں کی تیغیں اپنا جوہر دکھاتیں ،شراب و کباب، رقص و سرور اور شعر وسخن کی محفلیں سجتیں ، اور ایک دوسرے کے لیے روح کا سامان بن جاتیں، میں اسی ناز و غمزوں کے الفاظ کے پیکر میں ڈھل جاتی اور پھر رنگ و مستی کا وہ سماں بندھتا کہ آنکھیں چندھیا جاتیں ۔لیکن وہ میرا ایک پڑاؤ تھا، میں وہاں سے نکلی تو وَلی اورنگ آبادی کی تازگی اور شگفتگی کی اسیر ہوگئی ، میں نے اُس کی صحبتوں میں عشق کی ایک انوکھی لذت پائی ، وہ بھی میرا ایک پڑاؤ ہی تھا، وہاں سے نکلی تو شاہ سراؔج کے تصوف نے مجھے باندھ لیا، ایک نیا رمز، عشق کا ایک نیا مزاج ، میں اُس سے بھی خوب سیر ہوگئی، لیکن خود سپردگی کا یہ انداز کب تک، تقدس کے اس ماحول سے آزاد ہوئی تو میں میرؔ کی چوکھٹ پر پہنچی ،

تو مجھے ہجر کی تڑپ اور وصال کی لذت سے آشنائی ہوئی، اب جو میں نے اپنا جائزہ لیا تو مجھے خیال آیا کہ کچھ اور چاہیے وسعت میرے بیاں کے لیے، مرزا نوشہ مجھے یقین ہے کہ تو ہی مجھے اس روائتی معاشرے اور روائتی بوطیقا کے تصورات سے نکال کر علامتی طرزِ فکر سے روشناس کروا سکتا ہے اور ایک بحرِ بے کنار تک پہنچا سکتا ہے۔"

"ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" مرزا نوشہ نے اس بار پوری جسارت کے ساتھ غزل کی آنکھوں میں دیکھا" دیکھتا ہوں اُسے، تھی جس کی تمنا مجھ کو۔ آج بیداری میں ہے خوابِ زلیخا مجھ کو" مرزا نوشہ پر ایک عجب سی سرشاری کی کیفیت طاری ہوگئی۔

"اور سن اے مرزا نوشہ۔۔۔ آج سے تو اسد اللہ خان اسدؔ نہیں بلکہ مرزا اسد اللہ خان غالبؔ کہلائے گا۔ کیونکہ آنے والے کل تو شہرادب پر غالب رہے گا۔"

مرزا نوشہ پر نشہ سا طاری ہوگیا۔ خمار آلود نگاہوں کو اُس نے جیسے ہی اوپر اُٹھایا تو آسمان سے واہ واہ اور سبحان اللہ کی آوازیں برس رہی تھیں۔ اُس نے دل ہی دل میں آہستہ سے کہا۔۔۔ میں غالب ہوں۔۔۔ میں غالب ہوں۔۔۔ میں غالب ہوں اور پھر اُس کی آواز، آوازِ جرس میں تبدیل ہوگئی۔۔۔ میں غالب ہوں۔۔۔ میں غالب ہوں۔۔۔ میں غالب ہوں۔۔۔۔

اور پھر مرزا غالب دہلی چلے آئے۔ عالم غیب کے مسافر نے اُنھیں" محرم رازِ نہانِ روزگار" اور "راز دان خوئے دہر بنا دیا تھا وہ رازہائے ہستی سے واقف ہوگئے تھے اور اُن کی شاعری کا مقصد قانونِ راز کی نوا سنجی ہو گیا تھا۔ یہاں اُن کے شب و روز بے تکلف محفلیں تھیں۔ باکمالوں کی سنگت تھی، غالبؔ کی زبان سے نکلا ہوا ہر شعر گنج ہائے معنی کا طلسم تھا۔ امراؤ بیگم کی بے پناہ محبتیں تھیں اور غالبؔ کی مکالمہ بازی عروج پر تھی۔ خاتون خانہ نے ایک دن شکایت کی،" بے نیازی حد سے گزری بندہ پرور کب تلک۔ ہم کہیں حال دل اور آپ فرمائیں کیا؟

غالب نے شوخ نظروں سے بیگم کی جانب دیکھا" عشق مجھ کو نہیں۔۔۔

" اچھا تو۔۔۔ وحشت ہی سہی۔" اُنھیں برجستہ جواب ملا

" امراؤ بیگم۔۔۔ میری وحشت تیری شہرت ہی سہی۔" وہ جانے کے لیے جیسے ہی اُٹھے، بیگم نے اپنے دونوں ہاتھ پھیلا کر اُنھیں روکنا چاہا" قطع کیجیے نہ تعلق ہم سے۔ کچھ نہیں تو عداوت ہی سہی۔"

غالب کے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی" بیگم۔۔۔ عاشقی صبر طلب۔۔۔!"

" لیکن حضور۔۔۔ تمنا بیتاب۔۔۔"

غالبؔ نے بیگم کے اُٹھے ہوئے ہاتھوں کو نیچے کرتے ہوئے جواب دیا،'' یارب وہ نہ سمجھیں ہیں نہ سمجھیں گے میری بات ۔ دے اور دل اُن کو جو نہ دے مجھ کو زباں اور۔''

امراؤ بیگم نے اُداس نظروں سے اُن کی طرف دیکھا،'' ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے لیکن ۔ خاک ہو جائیں گے ہم تم کو خبر ہونے تک۔''

'' واللہ بیگم تم تو اُداس ہو گئیں۔'' غالب نے محبت بھری نظروں سے امراؤ بیگم کی آنکھوں میں دیکھا ،'' تم تو ہمارے مزاج کو جانتیں ہیں۔ یہ تو بس یونہی ۔۔۔ چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد، والا معاملہ تھا۔ کیا تم نہیں جانتیں مجھے تم سے کتنی محبت ہے؟ اور کیوں نہ ہو صورت کی تم اچھی سیرت کی تم اچھی ۔۔۔''

امراؤ بیگم کی آنکھیں بھر آئیں۔

غالب بھی تڑپ اُٹھے ،'' تم تو ۔۔۔ ارے تم تو رونے لگیں۔'' غالب نے اُن کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں بھر لیا،'' جانِ غالب، قرارِ غالب ۔۔ ہم آپ ہی کو اپنا مقصود جانتے ہیں۔'' امراؤ بیگم کے آنسوں بھرے چہرے پر مسکراہٹ پھیل گئی اور وہ پرے ہٹتے ہوئے گویا ہوئیں،'' کئی دنوں سے آپ نے کوئی غزل بھی نہیں کہی۔''

'' ہاں ۔۔۔'' غالب کو جیسے کوئی یاد آ گیا، دوستوں کی جھرمٹ میں ہم تو جیسے اُسے بھول ہی گئے تھے ۔'' تبھی غالب کے ذہن میں چھنا کہ ہوا ۔۔۔ لیکن میں کہاں بھولی ہوں مرزا نوشہ ۔۔۔ اب میں تجھ سے کس روپ میں ملوں گی اس کا تو تصور بھی نہیں کر سکتا۔ ذرا گھر سے تو باہر نکل ۔۔۔ اور مرزا غالب گھر سے باہر نکل گئے۔

وہ اپنے ہی تصور میں چلے جاتے تھے۔ جانکار بندگی عرض کرتے اور وہ سر کو ہلکی سی جنبش دیتے اور آگے بڑھ جاتے۔ ہلکے ہلکے قدموں سے راستہ طئے ہو رہا تھا کہ اچانک اُن کے قدم رُک گئے ۔اُنھوں نے اپنے ہی کلام کو سُر کی رنگینیوں میں ڈوبا ہوا پایا، اُنھوں نے اپنا سر اوپر اُٹھایا، یہ کون مغنیہ ہے کہ میں جتنا کھینچتا ہوں اور کھینچتا جاتا ہوں ۔ آواز اُن کے کانوں میں رس گھول رہی تھی، کبھی نیکی بھی اُس کے جی میں گر آ جائے ہے مجھ سے ۔ جفائیں کر کے اپنی یاد شرما جائے ہے مجھ سے۔

سامنے ہی زینہ تھا۔ وہ تیزی سے اُس پر چڑھ گئے ۔ دروازہ بند تھا۔ اُنھوں نے دستک دی۔ چودھویں بیگم نے دروازہ کھولا، غالبؔ کی حیرت کی انتہا نہ تھی۔ یہ تو وہی دلبر تھی ۔ وہی حور تھی وہی پری تھی۔ کیا چودھویں بیگم کے قالب میں وہ ڈھل گئیں؟ پھر جیسے گھنگھروں بج اُٹھے،'' یہ کس بہشت شمائل کی آمد آمد ہے؟''

غالب محوِ حیرت تھے،'' کب وہ سنتا ہے کہانی میری۔ اور پھر وہ بھی زبانی میری۔

'' کہیں آپ ۔۔۔ کہیں آپ ۔۔۔'' چودھویں بیگم اس سے آگے کچھ نہ کہہ سکیں۔

'' پوچھتے ہیں وہ کہ غالب کون ہے۔'' غالب نے اپنی داڑھی پر ہاتھ پھیرا، '' کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟ ''

'' ہائے اللہ۔۔'' وہ خوشی سے سرشار ہوگئیں، '' یہ بے خودی بے سبب تو نہیں۔۔۔

'' بنا کر فقیروں کا ہم بھیس غالب۔تماشۂ اہلِ کرم دیکھتے ہیں۔''

''حضور اندر تشریف لائیں۔'' چودھویں بیگم نے اندر کی جانب قدم اُٹھایا، '' آہ۔۔ یہ نہ تھی ہماری قسمت کے وصالِ یار ہوتا، لیکن ایک آس تھی، ایک اُمید تھی کہ کبھی تو ہماری چاہت رنگ لائے گی۔ کبھی تو آپ کے قدم اِدھر بھی آئیں گے۔ مرزا نوشہ ہمیں تو آپ کا تمام کلام ازبر ہے۔ بس نظریں آپ کے دیدار کی پیاسی تھی، اور آج سیراب ہوگئیں۔ ارے آپ تشریف رکھیے نا۔۔۔

مرزا نے ابھی گاؤ تکیے سے ٹیک ہی لگایا تھا کہ باندی نے حقّہ لگا دیا، اُنھوں نے ترچھی نظروں سے چودھویں بیگم کی طرف دیکھا، '' سنبھلنے دے مجھے اے نا اُمیدی، نہ بھاگا جائے ہے مجھ سے نہ ٹھہرا جائے ہے مجھ سے۔''

'' اے حضور۔۔۔ کہاں کھو گئے ۔۔۔ یہ بیاباں نہیں۔۔۔ بندی کا کوٹھا ہے۔ اوروں کے لیے دل بہلائی کی جا سہی، لیکن یہاں آپ کے لیے دل بچھتا ہے۔ کس قیامت کے انتظار کے بعد یہ گھڑی آئی ہے، کاش یہ حساب ہمارے دل کی دھڑکنیں دے پاتیں۔''

دونوں کی نظروں کے تیر ایک دوسرے کو گھائل کر رہے تھے۔ عشق کی آگ روشن ہو چکی تھی ۔ اُنھوں نے جونہی ہاتھ بڑھایا، دلِ بے مدعا اُن کی بانہوں میں جھول گیا۔ اُن کے لب گویا تھا اور اُس کی آنکھیں بند تھیں ، '' صد جلوہ روبرو ہے، جو مژگاں اُٹھایئے۔'' وفورِ جذبات سے غالب کی آنکھیں بھی جھک گئی تھیں،'' طاقت کہاں کہ دید کا احساں اُٹھایئے۔''

یہ ملاقاتیں رنگ لائیں۔ وقت گزرتا گیا۔ احباب کی محفلیں، مشاعرے، بذلہ سنجیاں، غالب کی زبان سے رنگ و معنیٰ کی پھلجھڑیاں اپنی بہاریں دکھانے لگیں۔ اشعار میں تقلید کے خلاف جہاد، نئے مضامین، وہ اُن شعراء کو خاطر میں نہ لاتے، جن کی معراجِ تمنا عام فہم اور عام پسند خیالات کو گوارا صورت میں نظم کرنے ہی پر منحصر تھی ۔ اُن کا یہ عالم تھا، کسی پر پھبتی کس دی، کسی کے ایک شعر پر اپنا پورا دیوان نچھاور کر دیا، تو کسی سے کہا، تم اگر شعر نہ

کھو گے تو خود پر ظلم کرو گے۔ غالب کی مشکل پسندی کا طوطی بولتا تھا۔ بادشاہ کی اُستادی بھی ایک تمغے کی صورت سر فروشانِ شعر و سخن سے داد طلب کر رہی تھی۔ وہ آنکھ بند کرتے تو گنجینۂ معنی کے طلسم ہاتھ باندھے حاضر ہو جاتے۔ ایسی ہی ایک گھڑی تھی۔ غالب کو اپنے آپ میں ڈوبا ہوا جو چودھویں بیگم نے دیکھا تو سوال کیا، '' اے حضرت کس سوچ میں گم ہیں۔۔۔؟ ''

غالب نے آنکھیں کھولیں اُن کے سامنے ایک حُسنِ بے باک زُلفیں کھولے موجود تھا۔ ترنگ کی ایک لہر نے انگڑائی لی، ''اے قرارِ غالب، اے تسکینِ غالب، نیند اُس کی ہے، دماغ اُس کا ہے، راتیں اُس کی ہیں۔ تیری زُلفیں جس کے بازوؤں پر پریشاں ہو گئیں۔''

چودھویں بیگم کے چہرے پر شرارت رقص کرنے لگی، ''یعنی حضور اب بھی۔ چاہتے ہیں خوبرویوں کو اسد۔ آپ کی صورت تو دیکھا چاہیے۔''

'' جانِ غالب۔۔۔ نہ دیکھو عبرت نگاہ سے۔۔۔ غالب سراپا رہنِ عشق و ناگریزِ الفت ہی سہی

''الفت سے آپ کی کس کو پرہیز۔۔۔ لیکن مرزا نوشہ ۔۔۔ دیا ہے دل اگر ، کچھ تو اپنے بارے بھی بتانا چاہیے۔۔۔ ''

'' ہاں۔۔۔ بتانا تو چاہیے۔۔۔ غالب نے چودھویں بیگم کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہنا شروع کیا، سنو آرزوئے غالب۔۔ مجھ سے میری ہی داستان سنو۔۔۔ میں مرزا اسد اللہ خان، عرف مرزا نوشہ، غالب تخلص، قوم کا تُرک سلجوقی، سلطان سلجوقی کی اولاد میں سے ہوں، دادا قوقان بیگ شاہ عالم کے عہد میں سمرقند سے دلّی آئے، پچاس گھوڑے اور نقارۂ نشان سے بادشاہ کے نوکر ہوئے، پہاسو کا پرگنہ سرکار سے ملا، والد عبداللہ بیگ خان دلی کی ریاست چھوڑ کر اکبر آباد میں جا رہے، میں اکبر آباد میں پیدا ہوا، اور والد راجہ راؤ بختیار سنگھ کے ملازم ہوئے اور وہ ایک لڑائی میں بہادری سے لڑتے ہوئے مارے گئے۔ اُس وقت میری عمر پانچ برس کی تھی، اس کے بعد میری پرورش میری ننھیال میں ہوئی اور جب میں تیرا برس کا ہوا تو میری شادی امراؤ بیگم سے ہو گئی، وہ اُس وقت گیارہ برس کی تھیں اور اپنے وقت کے گلفام مرزا الٰہی بخش کی دختر نیک اختر تھیں۔ وقت کے ساتھ ساتھ میں اکبر آباد سے دلّی چلا آیا۔۔۔ بس یہی کہانی ہے میری۔''

'' واللہ مرزا صاحب اب پتہ چلا کہ آپ یونہی نہیں کہتے تھے کہ کچھ شاعری ہی نہیں ذریعے عزت مجھے۔'' چودھویں بیگم غالب کے سینے سے لگ گئیں، ''میرا محبوب تو شہزادہ ہے۔''

''ہاں ہم جیسوں ہی کے لیے شاید یہ کہاوت بنی ہے۔۔۔پدرم سلطان بود۔''

''آپ اپنی شوخی سے باز نہیں آئیں گے۔''

''اب کہاں کی شوخی چودھویں بیگم ۔'' غالب کی نظریں جھروکے سے نظر آنے والے آسمان کو تکنے لگی تھیں،'' میری شاعری کا خمیر نشاط وسرور سے اُٹھا تھا لیکن حالات نے غم والم میں ڈبو دیا، نشاط رجائیت کے قالب میں ڈھل گئی، غم نے قنوطیت کا لبادہ اوڑھ لیا، وہ طرز معاشرت جس نے مجھے حسین تصورات بخشے تھے، جس کے باعث میرا دل ودماغ روشن تھا، وقت کے ہاتھوں میں ہی اپنے آپ سے دور ہو گیا۔ ایک غم ہو تو بیان کروں۔'' وہ اپنی جگہ سے اُٹھے اور زینے سے نیچے اُتر گئے۔ لیکن اُن کی سوچ اُسی طرح جاری تھی۔۔۔۱۸۵۷ء کی جنگ تاریخ کا ایک ورق ہو سکتی ہے۔۔۔ لیکن یہ کوئی نے سمجھے کہ میں اپنی بے رونقی اور تباہی کے غم میں مرتا ہوں۔ جو دکھ مجھ کو ہے اُس کا بیان تو معلوم ہے، مگر اس بیان کی طرف اشارہ کرتا ہوں، انگریز قوم کے ہاتھوں جو قتل ہوئے اُن میں میرا کوئی اُمید گاہ تھا اور کوئی میرا شفیق اور کوئی دوست دار، کوئی میرا یار اور کوئی میرا شاگرد، کچھ عزیز، کچھ معشوق۔۔۔ سو وہ سب کے سب خاک میں مل گئے۔ ایک عزیز کا ماتم کتنا سخت ہوتا ہے جو اتنے عزیزوں کا ماتم دار ہو، اُس کو زیست کیوں نہ دشوار ہو۔ ہائے ہائے اتنے یار مرے کہ جو اب میں مروں گا تو میرا کوئی رونے والا نہ ہوگا۔''

اُن کے قدم اپنے گھر کی جانب اُٹھ رہے تھے لیکن سوچ کا چکر اُسی طرح گردش کر رہا تھا۔۔۔ یہ زندگی ہے یا کوئی بحرِ بے کنار۔۔ بڑھاپا، معاشی ناآسودگیاں، پینشن کے جھگڑے، مقدمہ بازیاں، حالات کی کج روی ۔۔کوئی جیے تو کیونکر جیے۔

روز روز کے بگڑتے حالات نے مرزا غالب کو اور بھی کمزور کر دیا تھا۔ امراؤ بیگم اُن کی صحت کا ہر طرح خیال رکھتیں۔ اُن کی خدمت میں کوئی کوتاہی نہ کرتیں۔ وہ اُن کے پائتی بیٹھی اُن کے پاؤں داب رہی تھیں۔ مرزا ٹکٹکی باندھے اُنھیں دیکھ رہے تھے۔ دو ایک بار دونوں کی نظریں ٹکرائیں بھی لیکن اُمراؤ بیگم نے گردن جھکا لی تو غالب نے کہنا شروع کیا،''نواب مرزا الٰہی بخش کی دخترِ نیک اختر، نہایت ناز ونعم میں پرورش پانے والی لاڈلی بیٹی ، نجم الدولہ دبیر الملک، اُستاد شاہ کی بیگم بن کر آپ نے کیا پایا؟''

''یہ نہ کہیے۔۔''امراؤ بیگم نے اپنا چہرہ اوپر اُٹھایا،'' میں نے آپ کی بیگم بن کر وہ پایا جو شاید ہی کسی کو نصیب ہو سکے۔ رہی دکھ سکھ کی باتیں یہ تو آنی جاتی ہیں۔''

''بیگم ایک غبار تھا دل پر جو دھل گیا۔'' غالب اُٹھ کر بیٹھ گئے،'' بہت تھک گیا ہوں۔۔۔ بیگم کلو سے

کہیں میناو جام لگا دے۔‘‘

’’جی بہتر۔۔۔‘‘امراؤ بیگم کلو کو آوازیں دیتی ہوئی خواب گاہ سے باہر چلی گئیں۔غالب پر اُن کی ہی سوچ سوار تھی،’’ آہ یہ وقتِ پیری۔۔۔نامرادی کے دن۔۔۔میرا حال سوائے میرے خدا کے کوئی نہیں جانتا۔ آدمی کثرتِ غم سے سودائی ہو جاتا ہے،عقل جاتی رہتی ہے،اگر اس ہجوم میں میری قوت میں فرق آ گیا تو کیا عجب ہے۔پوچھو کہ کیا غم ہیں؟غم مرگ،غم فراق،غمِ رزق،غمِ عزت،اب میرا کوئی رفیق نہیں ہے۔۔بس تنہائی۔۔‘‘ ٹھیک اُسی وقت اُنھیں ہچکی سی آئی اور خواب گاہ روشن ہوگی اور اُنھوں نے دیکھا،سنہری سیڑھی پر سوار غزل واپس جا رہی ہے

اُنھوں نے فوراً اُسے آواز دی،’’ اے غزل۔۔۔مجھے اس طرح اکیلا چھوڑ کر کہاں جا رہی ہو۔۔اے جانِ عزیز۔۔اے میری دلبر۔۔۔واپس آ۔۔‘‘مرزا نے اُسے اپنے دونوں ہاتھوں سے واپس آنے کا اشارہ کیا، غزل نے پلٹ کر ایک نظر اُن پر ڈالی اور سیڑھی پر کھڑے کھڑے ہی جواب دیا،’’ مرزا نوشہ۔۔۔آپ مجھے کیوں بلا رہے ہیں؟اب آپ کے پاس کیا رہ گیا ہے۔وہ دن تو ہوا ہوئے جب آپ کہتے تھے،غالب کا ہے اندازِ بیاں اور۔۔۔ لیکن اب کیا کہیں گے۔۔۔؟ ‘‘

غالب نے مایوسی کے عالم میں اُس کی طرف دیکھا،’’ آہ۔۔۔ہم کہاں کے دانا تھے،کس ہنر میں یکتا تھے۔‘‘

غزل کے چہرے پر بے مروت مسکراہٹ کھیل رہی تھی،’’ اور یہی نہیں۔۔۔اب تو آپ عمر کی آخری حد میں ہیں۔لاغر اور کمزور۔۔۔جبکہ مجھے تو۔۔۔‘‘

’’بے وفا۔۔۔‘‘غالب کے لہجے میں قدرے تلخی در آئی،’’ میں نے تجھے جانِ غالب کہا تھا اور آج تو دیدۂ عبرت نگاہ ثابت ہو رہی ہے؟‘‘

غزل سیڑھی سے ایک قدم نیچے اُتر آئی،’’ مرزا اسداللہ خان غالب۔۔۔میں بے وفا نہیں ہوں،ہاں مجبور ضرور ہوں۔۔۔کیونکہ میں وقت کی آواز ہوں،مجھ پر وہی قابو پا سکتا ہے جو توانا جسم اور توانا دماغ کا مالک ہو ۔۔۔اور آپ۔۔آپ تو۔۔۔

غالب کی نظریں جھک گئیں،’’ ہاں۔۔۔ گو ہاتھ کو جنبش نہیں،آنکھوں میں تو دم ہے۔رہنے دو ابھی ساغر و مینا میرے آگے۔‘‘

'' مرزا نوشہ۔۔۔یہ وہ حاجت ہے جس کا روا رکھنا اب محال ہے۔''

'' نہیں نہیں۔۔۔تم مجھ سے مذاق کر رہی ہو۔'' غالب پر التجائی لہجہ سوار تھا،'' میں جانتا ہوں، میں تمہارے دل کا قرار ہوں، اے آبروئے سخن یوں مجھے بے تاب نہ کر۔۔۔آ۔۔۔آ میرے قریب آ۔۔۔کیا اس طویل مسافت کے باوجود میں تجھ پر قابو نہ پا سکا؟ کیا تیرے دل میں میرا کوئی مقام نہیں ہے؟''

لیکن غزل نے سیڑھی چڑھنا شروع کر دیا تھا اور ساتھ ہی اُس کے دل سے آواز اُٹھ رہی تھی،'' مرزا غالب۔۔! تو تو میرے انگ انگ میں سما گیا ہے۔تیرا ایک ایک لفظ میری روح بن چکا ہے،تو نے تو میرے مزاج کو بدل دیا، میری کھوئی ہوئی انا کو ڈھونڈ ھ نکالا، تجھے معنی و مطالب کے نئے نئے لباس عطا کیے، بھلا میں تجھے کیسے فراموش کر سکتی ہوں،تو تو اب خود میرا نام ہے، میری آبرو ہے، میری پہچان ہے۔سچ تو یہ ہے کہ اب خود مجھے تیرے بغیر قرار ممکن نہیں۔۔۔'' غزل نے بلندی سے زمین کی طرف دیکھا،'' میں جس ارادے سے ایران سے نکلی تھی مرزا بھی میرا ایک پڑاؤ تھا ۔ یہ سچ ہے کہ اُس نے مجھے بے حد رجھایا،خود بھی فدا ہوا، میں بھی اُس کی دیوانی ہوئی، اور اُسے اپنا دیوانہ بھی بنایا،لیکن میں پھر بھی کسی سہاگن کی طرح اُن کے بازوؤں میں دم نہیں توڑ سکتی ،میرے زلفیں کھلی ہوئی ہیں۔اندھیرے میں مجھے کہیں ہاتھ دکھائی دے رہے ہیں وقت کا حکم اب جدائی ہے۔''

اُس نے پلٹ کر اغالب کی طرف دیکھا،'' الوداع۔۔۔اے میرے شاعر الوداع۔۔الوداع۔۔۔ اور غزل نئی منزلوں کی طرف نکل گئی۔۔۔میں غزل ہوں، میں نغمہ ہوں، میں دلبر بھی اور دلدار بھی ہوں، میں غزل ہوں۔میں غزل ہوں۔میں غزل ہوں۔

امراؤ بیگم اُن کی خواب گاہ میں داخل ہوئی تو دیکھا،مرزا نوشہ اکیلے ہی کچھ بڑبڑا رہے ہیں۔وہ لمحہ بھر کو رُکیں اور پھر پوچھا،'' یا اکیلے میں کس سے باتیں ہو رہی ہیں؟''

مرزا غالب اُن کی طرف دیکھا،'' بیگم۔۔۔یہ تم نہیں سمجھ سکو گی۔انھیں بھی تم نہیں دیکھ پاؤ گی۔۔۔یہ نثر جہاں ہیں۔۔۔اب ہم ان ہی سے اپنا دل بہلائیں گے۔''

'' ہائے اللہ یہ آپ اس عمر میں کیسی باتیں کر رہے ہیں؟''

اور پھر وہ مرزا نوشہ کو حیرت سے دیکھتی رہ گئیں۔

سُنی اَن سُنی

نذیر فتح پوری

''وہ رات نہایت کالی تھی جس رات میرا سایہ مجھ سے جدا ہوا تھا۔''

میں یہ کہانی کسی اور کو نہیں سنا رہا ہوں، بلکہ اپنے آپ کو سنا رہا ہوں۔ہم کہانیاں دوسروں کے لیے لکھتے ہیں۔ دوسروں کو سناتے ہیں اور دوسرے ہی ہماری کہانیاں پڑھتے ہیں۔ اس کے بعد ہم اپنی کہانیوں کے لیے دوسروں کی رائے کا انتظار کرتے ہیں، اسی لیے جب میں نے نئی کہانی ''اَن سُنی'' کے عنوان سے لکھی تو سب سے پہلے ایک محفلِ افسانہ منعقد کی۔ شہر کے چار بڑے افسانہ نگاروں کو مدعو کیا۔ چار چھے دوسرے درجے کے افسانہ نگاروں کو بھی دعوت دی۔ دو تین نقاد اِن فن قسم کے اشخاص کو بھی بطور خاص مدعو کیا۔ اس محفل میں سامعین کے لیے گنجائش نہ تھی کیونکہ یہ ایک چھوٹا سا کمرہ تھا جو میرے ہمسائے کی مہربانی سے مجھے اعزازی طور پر ملا تھا۔ اس کمرے میں جتنے لوگوں کی گنجائش تھی اتنے ہی لوگوں کو مدعو کیا گیا تھا۔

پروگرام سے پہلے مجھے ایک فون آیا۔

''آپ نے مجھے مدعو نہیں کیا۔''؟

''کون''؟ میں نے استفسار کیا۔

''آپ مجھے نہیں جانتے''۔ جواب ملا۔

''پھر میں آپ کو کس طرح مدعو کرتا۔''؟

جب آپ ''بزمِ تنقید'' کا انعقاد کر رہے ہیں تو آپ پر لازم تھا کہ آپ مجھے تلاش کرتے''۔

میں نے پوچھا۔

''کیا آپ نقاد ہیں۔''؟

''جی نہیں۔''

''کیا افسانہ نگار ہیں۔''؟

''جی نہیں۔''!

''پھر کس حیثیت سے آپ کو بلایا جاتا۔''؟

''گویا اس شہر میں حیثیت دیکھ کر دعوت دی جاتی ہے۔''

''جی ہاں، سامعین کے لیے یہاں کوئی جگہ نہیں۔''

''آپ سے کس نے کہا کہ سامع کی حیثیت سے مجھے بلائیں۔''؟

''پھر۔''؟ میں نے پوچھ لیا۔

''میں مستقل کا افسانہ نگار ہوں۔کل جب آپ نہیں ہوں گے تو آپ کی خالی جگہ میں ہی پُر کروں گا۔''اس نے نہایت اعتماد بھرے لہجے میں کہا۔

''کیا آپ میری سانسیں گن رہے ہیں''۔ مجھے طیش آ گیا۔

''ایک دن تو کالی رات آنے والی ہے۔ جب انسان کا سایہ انسان سے جدا ہو جائے گا۔آپ کی ''اَن سُنی'' سننے والا مجھ سے بہتر اس شہر میں کوئی نہیں۔''

اس کے بعد سلسلہ منقطع ہو گیا۔

''ہو گا کوئی''۔ میں نے دل ہی دل میں سوچا اور جلسے کی تیاری میں جٹ گیا۔

جلسے کی صدارت ایک ایسے افسانہ نگار کو سونپی گئی تھی جو شہر میں سب سے پرانا تصور کیا جاتا تھا۔تاہم دس بارہ سال سے اس نے کوئی نیا افسانہ نہیں لکھا تھا۔مہمانِ خاص کے طور پر ایک ناقد کو خود صدر صاحب نے الگ سے مدعو کیا تھا۔

میں نے صدر محترم کی اجازت سے اپنی نئی کہانی ''اَن سُنی'' پیش کرنے کی کوشش کی۔

''وہ رات نہایت کالی تھی جس رات میرا سایہ مجھ سے جدا ہوا تھا۔''

کہانی کافی طویل تھی۔کالی رات کی طرح۔درمیان ہی میں صدر صاحب نے مجھے ٹوک دیا۔

''چائے کا انتظام نہیں کیا آپ نے۔''؟

میں نے جواب دیا۔

''محفل کے اختتام کے بعد صرف چائے ہی تو ہے جو میری طرف سے شرکاء میں پیش کی جائے گی''۔باقی تو آپ حضرات کی جانب سے مجھے ہی ملنے والا ہے۔داد و تحسین۔اعزاز و پذیرائی''۔

صدر محترم کی تیوریوں پر بل پڑ گئے۔

''پھر افسانے کے کچھ حصے حذف کر دیجیے۔محفلوں میں اتنے طویل افسانے نہیں سنائے جاتے''۔

صدر صاحب نے حکم صادر فرمایا۔

میں نے جواب دیا۔

''جب افسانہ ادھورا ہوگا تو اس کے ساتھ کیسے انصاف ہوگا۔ آخر آپ حضرات کی علیت کا سوال بھی تو ہے''۔

اتنا کہہ کر میں نے ایک اچٹتی سی نظر حاضرین کے چہروں پر ڈالی لیکن صدر صاحب کے چہرے کو نظر انداز کر دیا۔ اور ایک کے بعد ایک صفحہ پلٹنے لگا۔

افسانہ اپنے اختتام کو پہنچا۔ میں نے دیکھا حاضرین کو جیسے سانپ سونگھ گیا ہو۔

''کوئی تو اس سناٹے کو توڑنے کے لیے پہلا قدم اٹھائے''۔؟ میں نے احتجاج درج کرایا۔ میری بات پر حاضرین میں سے ایک صاحب نے ہمت دکھائی۔ کہنے لگے۔

''میں کہتا ہوں، آپ شاعری کرتے ہیں، کیا یہ آپ کے لیے کافی نہیں تھا، عبث آپ افسانے کی آگ میں کود پڑے''۔

میں نے کہا۔

''یہ کلیہ تو نہیں کہ جو شاعری کرتا ہو وہ افسانہ یا کہانی نہ لکھے''۔

دوسرے نے زبان کھولی۔

''نہیں نہیں کوئی بھی کہانی لکھ سکتا ہے۔ افسانہ لکھ سکتا ہے۔ کل میرے ہمسائے کی بھینس سے سر راہ ملاقات ہوئی۔ میں نے پوچھا آج کل کیا چل رہا ہے''۔؟

کہنے لگی ''کہانیاں لکھ رہی ہوں۔''

میں نے پوچھا، ''اور دودھ''۔؟

بولی، ''دودھ اپنی جگہ۔ جب انسان کہانی لکھ سکتا ہے تو میں کیوں نہیں لکھ سکتی''۔

پہلے شخص نے مداخلت کرتے ہوئے کہا۔

''انسان نہیں، شاعر کہاں ہوگا''۔

آپ کیوں درمیان میں رفتار شکن بن رہے ہیں، بھینس مجھ سے مخاطب تھی آپ سے نہیں''۔

''کیا بھینس غلطی نہیں کر سکتی''۔؟ پہلے شخص نے پھر مداخلت کی۔

دوسرا شخص میری طرف متوجہ ہوا۔

’’آپ انھیں خاموش رکھیئے، یہ میرے مزاج پر، گراں گزر رہے ہیں‘‘۔

میں نے ملتجیانہ نظروں سے پہلے شخص کی طرف دیکھتے ہوئے اشاروں ہی اشاروں میں اسے خاموش رہنے کی گزارش کی۔لیکن وہ بھی سارے ہتھیاروں سے لیس ہو کر آیا تھا۔ کہنے لگا۔

’’ان کو بھینس کے آگے بین بجانے دیجیئے۔ میں خاموشی اختیار کرتا ہوں‘‘۔

غصہ تو مجھے بہت آیا لیکن بات مہمان اور میزبان کے درمیان آ کر الجھ گئی۔ میں نے دوسرے شخص سے اپنی بات مکمل کرنے کی گزارش کی۔

وہ شخص گویا ہوا۔

’’بھینس نے کہا جب انسان کہانی لکھ سکتا ہے تو میں کیوں نہیں لکھ سکتی، انسان اتنا خود غرض ہے کہ وہ صرف اپنے دکھ درد کی کہانی لکھتا ہے۔کیا کسی انسان نے کبھی بھینسوں کے مسائل پر کہانی یا کوئی افسانہ لکھا‘‘۔؟

اسی دوران ایک نقاد قسم کا انسان کھڑا ہو کر کہنے لگا۔

’’بات کرنے کا سلیقہ نہیں نادانوں کو‘‘۔ پھر وہ کہنے لگا۔

’’فنونِ لطیفہ کو بھینس سے جوڑ کر محفل کو بدحظ کر دیا۔ جب کسی تخلیقی شہ پارے پر انتقادی نگاہ نہیں ڈال سکتے تو پھر فصحا کے روبرو لب کشائی کی کیا ضرورت ہے‘‘۔

ایک اور شخص درمیان سے نمودار ہو کر لب کشا ہوا۔اس کی نظر میرے چہرے پر تھی۔اس کا لہجہ استہزائیہ تھا۔

’’یہ تو ہمارے میزبان کی سراسر توہین ہے۔ آخر بھینس میں اور ہمارے میزبان میں کچھ فرق ہے کہ نہیں‘‘۔؟

میری آنکھوں میں قہر اترنے ہی والا تھا کہ میرے اندر کے میزبان نے اس کا گریبان پکڑ لیا۔اتنے میں ایک دوسرے صاحب اٹھ کر بہت ہی مہذب انداز میں مخاطب ہوئے۔

’’یہ افسانہ نہ کسی انسان کا ہے نہ کسی بھینس سے اس کا کوئی علاقہ ہے۔ یہ تو سراسر ایک علامتی افسانہ ہے۔لیکن اب تو علامتیں مفقود ہو چکی ہیں۔آپ مُردوں میں جان ڈالنے کی کوشش کیوں کر رہے ہیں‘‘۔وہ مجھ سے مخاطب تھے۔

ایک صاحب اپنی شیروانی کی سلوٹوں کو درست کرتے ہوئے کھڑے ہوئے اور اپنی رائے کا اظہار کرنے لگے۔

’’جی نہیں محترم! میں سچ کہوں گا اور سچ کے سوا کچھ نہ کہوں گا۔ یہ قطعی علامتی افسانہ نہیں ہے۔ مجھے تو اس

افسانے میں تجریدیت کا عنصر نظر آتا ہے۔ لیکن میں سوچتا ہوں کہ یہ تجریدیت کس بلا کا نام ہے؟ آج تک کسی دانشور نے اس کی وضاحت وصراحت کرنے کی کوشش نہیں کی''۔

ایک بزرگ جو کسی زمانے میں منشی پریم چند کی طرز پر افسانے لکھا کرتے تھے۔ بڑی مشکل سے اپنے برابر بیٹھے ہوئے شخص کی مدد سے کھڑے ہوکر فرمانے لگے۔

''یہ نہ علامتی افسانہ ہے نہ تجریدیت سے اس کی علیک سلیک ہے۔ یہ تو زندگی سے جڑا ہوا ایک سیدھا سادہ افسانہ ہے۔ عوامی افسانہ، مجھے تو اس میں منشی پریم چند کی کہانیوں کی جھلک نظر آتی ہے۔ آج کل ایسی کھری، سچی اور زندگی کی عکاسی کرنے والی کہانی کہاں لکھی جارہی ہے۔ اب تو کہانی کو مکڑی کا جالا بنا دیا گیا ہے۔ الجھی ڈور کی مانند، جس کا سرا ہاتھ ہی نہیں لگتا۔ میں اپنے میزبان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ انھوں نے پریم چندیدیت کو از سرِ نو حیاتِ تازہ بخشنے کی سعیِ بلیغ کی ہے''۔

ایک صاحب کھڑے ہوکر کہنے لگے۔

''مجھے سعیِ بلیغ پر شدید اعتراض ہے۔ یہاں سعیِ جمیل کا محل تھا''۔

پھر ایک بار میرے دانت ایک دوسرے میں پیوست ہونے لگے اور مٹھیاں بھنچنے لگیں۔ لیکن ایک بار پھر میرے اندر کے میزبان نے میری زبان پر تالا ڈال دیا۔

اسی دوران ایک صاحب جو بہت دیر سے سر جھکائے بیٹھے تھے وہ کھڑے ہوکر کہنے لگے۔

''دیکھیے صاحبان! یہ نہ علامتی افسانہ ہے، نہ اس میں تجریدیت ہی کہیں نظر آتی ہے اور پریم چندیدیت سے تو اس کا دور دور کا بھی واسطہ نہیں۔ خاکسار کی نظر میں یہ ایک جدید افسانہ ہے۔ افسانے کا اسلوب دیکھیے، اندازِ بیان دیکھئے، زبان دیکھئے۔ دیکھئے کیا کہتا ہے افسانہ نگار۔

''وہ رات نہایت کالی تھی جس رات میرا سایہ مجھ سے جدا ہوا تھا''۔

محفل میں تنہائی، بھیڑ میں اکیلے پن کا احساس، اندھیرے میں سائے کی تلاش، سمندر میں ڈوبتے لوگوں کے پیاس کی شدت سے سکڑتے

سمٹتے ہونٹ۔ اور جدید افسانے کی علامت کیا ہوسکتی ہے۔ یہ تمام عناصر متذکرہ افسانے میں موجود ہیں اس لیے یہ ایک خالص جدید افسانہ ہے۔ خاکسار کی رائے تو یہ ہے کہ اسے جدید افسانہ تسلیم کرلیا جائے''۔

آخری نقاد جو نقادِ اعظم کے نام سے اپنا تعارف خود ہی پیش کرتے ہیں۔ کھڑے ہوئے، چند لمحے خاموشی سے محفل

میں موجود لوگوں کا جائزہ لیا اور پھر لب کشا ہوئے۔

''ادب کے سب بڑے نقاد میرا لوہا مانتے ہیں کیونکہ افسانے کی تنقید میں مجھے ید طولیٰ حاصل ہے۔ میں افسانے میں وہ خصائص تلاش کر لیتا ہوں جن کا افسانے میں دور دور تک پتا نہیں ہوتا۔ ہمارے معزز میزبان نے پہلی بار افسانہ سپرد قلم کر کے اپنے آپ کو افسانہ نگاروں کی صف میں شامل کرنے کی سعیِ لا حاصل کی ہے۔ جی ہاں! یہ نہ سعیِ بلیغ ہے نہ سعیِ جمیل، یہ سراسر سعیِ لا حاصل ہے۔ اب تک تو یہ روایت رہی ہے کہ ایک ناکام شاعر نقاد بن جاتا ہے لیکن میری ذات اس سے مستثنیٰ ہے۔ میں تو پیدائشی نقاد ہوں۔ مگر آج ایک ناکام شاعر نے ایک افسانہ نگار بننے کی کوشش کی ہے۔ میں اسے سعیِ لا حاصل کے طور پر دیکھ رہا ہوں۔ وہ جو شیلے نے کہا تھا افسانے کے بارے میں۔ خیر شیلے کی بات چھوڑیے ہم منٹو کی بات کرتے ہیں۔ منٹو نے افسانے کے ضمن میں کیا پتے کی بات کہی تھی لیکن نئی نسل نہ شیلے کو جانتی ہے نہ منٹو کو مانتی ہے۔

ایک صاحب نے مداخلت کرتے ہوئے پوچھ لیا۔

''کیا کہا تھا منٹو نے افسانے کے بارے میں''۔؟

نقادِ اعظم نے قہر آلو نظروں سے سوالی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''ہم سوال گزاری کو پسند نہیں کرتے، آپ صرف ہماری گفتگو سنتے جائیں۔ کیونکہ بقول میر تقی میر:

''مستند ہے میرا فرمایا ہوا''

''لیکن آپ نے منٹو کی بات کی ہے۔ ہم معلوم کرنا چاہتے ہیں کہ منٹو نے افسانے سے متعلق کیا کہا تھا''۔

''افسانے سے متعلق تو کرشن چندر نے بھی بہت کچھ کہا تھا۔ کیا آپ نے کرشن چندر کو پڑھا ہے، وہ قلم کا جادوگر تھا، چاندنی میں ڈھلی اور شبنم میں دُھلی زبان لکھتا تھا کرشن چندر۔ نئی نسل کو لازم ہے کہ وہ صرف کرشن چندر کو پڑھے''۔

''لیکن آپ یہ کیوں نہیں بتا رہے ہیں کہ کیا کہا تھا کرشن چندر نے افسانے کے بارے میں''۔

''افسانے کے بارے میں تو شمس الرحمٰن فاروقی نے کیا کم کہا ہے۔ آپ نے وارث علوی کی انتقادیاتی تحریر نہیں پڑھی۔ آپ گوپی چند نارنگ اور وزیر آغا کو بھی یقیناً نہیں جانتے ہوں گے۔ ان نابغۂ روزگار نقادوں نے کیا کچھ نہیں لکھا افسانے کے بارے میں''۔

پھر ایک صاحب کھڑے ہو گئے۔

''لیکن ان میں سے کسی نے افسانہ نہیں لکھا، افسانہ تو ہمارے میزبان نے لکھا ہے جس کی ہم تمام لوگ مل کر تردید و تضحیک کر رہے ہیں۔آپ نے تو حد کردی، ہمارے میزبان کو نا کام افسانہ نگار ہی نہیں نا کام شاعر بھی قرار دے دیا۔کیا یہ آپ کی جارحیت نہیں ہے''۔؟

نقادِ اعظم نے پھنکارتے ہوئے کہا۔

''ابھی آپ نے ہمارے انتقادیاتی مزاج کی جارحیت کہاں دیکھی ہے۔وہ جو کسی نے کہا تھا۔

''زمیں کھا گئی آسماں کیسے کیسے''

تنقید جب بے لگام ہو جاتی ہے تو بڑے بڑے رستموں کو دھول چٹا دیتی ہے''۔

اتنے میں ایک نوجوان شخص کمرے میں داخل ہوا۔جنس اور ٹی شرٹ پہنے ہوئے، سر پر لمبے بالوں کی چوٹی، بے ترتیب داڑھی اور موٹی موٹی مونچھیں، گلے میں بڑے بڑے موتیوں کی مالا، سیدھے ہاتھ میں لوہے کا کڑا۔آتے ہیں لب کشا ہوا، بے حد جارحانہ انداز تھا۔

''میں نے پوری کہانی سنی، معزز نقادانِ فن کے تبصرے بھی سنے، یہ الگ بات ہے کہ ہمارے اور آپ کے درمیان دروازے کا پردہ حائل رہا۔لیکن یہ ریشم کے دبیز پردے نئی نسل کی سماعتوں میں رکاوٹ نہیں بن سکتے۔ میری خواہش کے باوجود معزز میزبان نے مجھے مدعو نہیں کیا۔لیکن ہم تو آوازوں کے پارکھ ہیں اور دیواروں کے کان ہمارے معاون۔لہٰذا جو فرمایا گیا وہ سب سنا گیا۔یہ افسانہ جس کا عنوان ''اَن سُنی'' تھا ہم نے لفظ بہ لفظ سنا۔ اب یہ ان سنی کہانی نہیں بلکہ سنا سنایا افسانہ ہے۔اس کے تمام کردار بھی دیکھے بھالے ہیں۔ جانچے پرکھے ہیں۔اس لیے میں کسی نقاد کو نہیں مانتا، اساتذہ کے تحریر کردہ لفظوں کی جگالی کرنے والے نقاد کسی تخلیقی فنکار کے کرب کو کیا جانے۔؟ یہ افسانہ جو ابھی سنایا گیا اور سنا گیا۔اس میں پوشیدہ تلخیوں کو نقاد کیسے محسوس کر سکتے ہیں۔اس افسانے میں جدیدیت کی بیخ کیوں لگائی جارہی ہے۔کیا عام زندگی میں کوئی انسان تنہائی کا شکار نہیں ہوسکتا۔کیا ہماری اور آپ کی زندگی میں کالی راتیں نہیں آئیں؟ میں کہتا ہوں، اسے عصری افسانہ کہنا غلط نہیں ہوگا۔اس محفل میں میزبان افسانہ نگار کے علاوہ تمام لوگ اپنی اپنی عمر کے آخری پڑاؤ پر ہیں۔ان میں نئی نسل کا درد جاننے اور محسوس کرنے والا کوئی نہیں۔ میں میزبان افسانہ نگار کو دلی مبارکباد پیش کرتا ہوں کہ موصوف نے اپنے پہلے ہی افسانے کے ذریعے اپنی فکری سمتوں کا تعین کر لیا اور پہلے ہی افسانے کے ذریعے ہم ایسے نوجوان کو اپنا ہمنوا بنالیا''۔

جب اجنبی نوجوان کی بات مکمل ہوگئی تو میں نے دیکھا سارے برگزیدہ چہرے مراقبے میں تھے۔

کچی مٹی کا مکان

پروفیسر اسلم جمشید پوری

لمبی چوڑی چمچماتی گاڑی جب گاؤں میں داخل ہوئی تو گاؤں کے بچے حیرانی سے دیکھ رہے تھے۔گاڑی قبرستان کے سامنے والے مکان کے پاس رکی۔گاڑی سے احسن ،ان کا بیٹا ارشد اور بیٹی منیرہ اترے۔مکان دکھاتے ہوئے احسن نے بیٹے سے کہا۔

''ارشد۔یہ ہے ہمارا موروثی مکان۔۔''

''بابا۔۔ یہ مکان ہے۔یہ تو بالکل کھنڈر ہے۔کچھ ٹوٹی پھوٹی دیواریں،اینٹیں،مٹی کا ڈھیر۔کوڑ کباڑ۔۔'' اپنی ناک پر رومال رکھتے ہوئے ارشد نے کہا۔'' بابا۔۔اسے تو مٹی کا ڈھیر ہی سمجھیں۔۔۔''

''نہیں بیٹا۔۔یہ ہمارے بزرگوں کی نشانی ہے۔اسے مرمت کرا کے ٹھیک کرایا جاسکتا ہے۔ہم لوگ کبھی کبھار آجایا کریں گے۔دیکھو یہ آنگن۔۔۔یہاں تمہاری دادی کا چولہا ہوا کرتا تھا۔۔۔''

احسن ایک ایک حصے کو غور سے دیکھ رہے تھے۔اور بچوں کو بتا رہے تھے۔۔۔جبکہ ارشد اور منیرہ گرد وغبار اور بدبو سے بچتے پھر رہے تھے۔

''بیٹے کچی مٹی کا یہ مکان تمہارے دادا اور دادی نے خون پسینہ ایک کر کے بنوایا تھا۔۔''

احسن مکان کا کونہ کونہ چھانتے یادوں کے مکڑ جال میں پھنس گئے۔ان کے سامنے ایک ایک چہرہ فلم کی طرح سامنے آنے لگا۔بی بی۔۔۔بابو جی۔۔۔بابا۔۔۔اماں۔۔۔سب سے واضح چہرہ بی بی کا تھا۔

بی بی کے آخری دن بہت تکلیف دہ تھے۔چار پائی سے چپک کر رہ گئی تھیں،پیشاب،پاخانہ بھی چار پائی ہی پر کر رہی تھیں۔ٹانگیں ٹھنڈی ہو رہی تھیں۔اوپر کے حصے میں زندگی کی رمق باقی تھی۔چہرہ سفیدی مائل ہو چلا تھا۔صرف آنکھیں تھیں جو،بولنے کی اداکاری کر رہی تھیں،وہ بھی آنسو سے لبریز رہتیں۔یوں بھی شوگر کے مریض کا حال تو سب کو پتہ ہی ہے کہ کس قدر دردانگیز ہوتا ہے۔جسم دن بہ دن سوکھتا جاتا ہے۔اندر کے اعضاء آہستہ آہستہ جواب دینے لگتے ہیں۔دیگر امراض بھی لاحق ہو جاتے ہیں۔اسی لیے شوگر کو ام الامراض بھی کہا جاتا ہے کہ شوگر کے مریض کو بی پی بھی ہو جاتا ہے،یعنی خون کا دباؤ کبھی بھی معتدل نہیں رہتا۔پل میں تولہ پل میں ماشہ کے مصداق بی پی میں مدوجزر آتے رہتے ہیں۔ایسے مریض کو دل کا عارضہ اور دماغ کی بیماری بھی ہو جاتی ہے۔اللہ کا شکر ہے کہ

بی بی کو ان میں سے کوئی بیماری نہیں تھی۔ حیرت کی بات یہ بھی ہے کہ بی بی کے جب بھی ٹیسٹ کروائے گئے، اندرونی اعضاء، ہم جوانوں سے بھی زیادہ درست تھے، بس شوگر نے انہیں بے حد کمزور اور لاغر کردیا تھا۔ ایسا لگتا قالب پر ایک کھال منڈھی ہو۔ ویسے تو انہیں شوگر کی بیماری نہ جانے کب سے تھی لیکن ہمیں اس کا علم یہی کوئی دس بارہ برس قبل اس وقت ہوا جب بینائی کی کمزوری کے سبب ان کی آنکھوں کا آپریشن کرانے کی نوبت آئی۔ تو آنکھوں کے ڈاکٹر نے احتیاطاً شوگر ٹیسٹ کروایا تو بی بی کو تقریباً ۳۵۰ شوگر نکلی۔ ڈاکٹر اور ہم سب حیران اور پریشان تھے کہ اب آپریشن کیسے ہوگا؟ لیکن ایک ہفتے کی دوا اور پرہیز کے بعد جب شوگر کم ہوئی تو ان کی آنکھوں کے یکے بعد دیگرے آپریشن ہوئے۔ اپنی زندگی کے قیمتی آخری دس سال بی بی نے شوگر سے مذاق کرتے ہوئے گذارے۔ پرہیز کی بجائے میٹھی اشیاء کا خوب استعمال کرتیں۔

اس سے قبل کہ میں بی بی کی کہانی کو مزید وسعت دوں، ضروری ہے کہ بتادوں کہ وہ تین بیٹوں اور دو بیٹیوں والی تھیں۔ ایک جفا شعار عورت، ایک وفادار بیوی اور ایک انتہائی شفیق ماں۔ چار بھائیوں کی اکلوتی بہن۔ والد کا بچپن ہی میں انتقال ہوگیا تھا۔ دادا نے پرورش کی، دادا کا زمانہ عیش وعشرت کا زمانہ تھا۔ گھر پر بیلوں کی شاندار جوڑی، تین چار بھینسیں، پچاس بیگھہ کے قریب کھیتی کی زمین۔ ٹھاکروں کے گاؤں میں اقلیت میں رہنے کے باوجود مسلمانوں کی اپنی شان تھی۔ خصوصاً بی بی کے دادا اپنی آن بان میں کسی ٹھاکر اور پردھان سے کم نہ تھے۔ بیٹھک پر ہر وقت حقہ گرم رہتا۔ مہمان آتے تو ہر طرح کی تواضع ہوتی۔ ایسے ماحول میں بی بی نے آنکھیں کھولیں۔ کھیت کھلیان کے کام، گھر کی ذمہ داری، لڑکپن اور پھر جوانی ___ بی بی، چار بھائیوں میں تین سے بڑی اور ایک سے چھوٹی تھیں۔ تینوں چھوٹے بھائی بی بی کہتے تو آہستہ آہستہ بی بی ایسا مشہور ہوا کہ ان کا اصلی نام حمیدن بہت پیچھے رہ گیا۔

بی بی چپ چاپ، خاموش سی، بستر پر دراز آنکھوں سے تصویریں اتارتی رہتیں۔ سب نا امید ہو چلے تھے کہ اب کوئی امید نہیں۔ دوائیاں تقریباً بند کردی گئی تھیں، کسی ڈاکٹر نے سمجھا دیا تھا کہ اب ان میں کچھ نہیں رکھا ہے۔ آپ لوگ گھر پر جو خدمت کر سکتے ہیں کرلیں اور اب خدمتیں کی جارہی تھیں۔ شوگر کے مریض کو چمچ سے کولڈ ڈرنک پلائی جارہی تھی۔ کوئی پوچھتا۔

''ارے بھئی کولڈ ڈرنک کیوں پلا رہے ہو۔''

تو گھر کی ذمہ دار خاتون کا جواب آتا۔

''اماں کو کولڈ ڈرنک بہت پسند تھی۔آخری وقت،ان کی خواہش پوری کرنا ہمارا فرض ہے۔''

بی بی کی آنکھیں اور دل زندہ تھے۔ دل سمندر میں نہ جانے کیا کیا جذبات موجزن تھے،زبان انہیں لفظوں میں ڈھالنے سے قاصر تھی کہ بعض مریضوں کے ساتھ ایسا ہوتا ہے کہ آخری ایام میں،ایک ایک کر کے اعضا ساتھ چھوڑنے لگتے ہیں۔کچھ کی بھوک پہلے مرجاتی ہے، کچھ کی زبان، گویائی سے محروم ہو جاتی ہے، کچھ کا دماغ کام کرنا بند کر دیتا ہے،اور کچھ کی قوت سماعت دم توڑ دیتی ہے۔بی بی کی سماعت باقی تھی، گویائی چلی گئی تھی۔وہ سب کچھ سن سکتی تھیں۔اپنے آس پاس ہورہی ہر بات ان کے کانوں سے دماغ اور دل تک جاتی تھی۔حتیٰ کہ اپنے خلاف ہونے والی باتیں بھی سننا ان کی مجبوری تھی۔ان باتوں کا ردعمل طوفان کی شکل میں، دل سے اٹھتا ضرور تھا مگر آنکھ نامی جزیرے تک آتے آتے برس پڑتا تھا۔زبان اسے لفظوں میں ڈھالنے میں ناکام تھی تو اس کام کی ذمہ داری بھی آنکھوں نے سنبھال لی تھی۔آنکھوں کی بھی کیا زبان تھی، بس آنسو نامی قطرے کو سمندر بنا کر آنکھوں کے دور تک پھیلے احاطے میں جل تھل کر دیتی تھی۔آنکھ کے احاطے کا یہ جل تھل کبھی کم کبھی زیادہ ہوتا رہتا۔بی بی کا حوصلہ، ہمت اور قوت ضبط غضب کے تھے، یہ جل تھل کبھی بھی آنکھ نامی جھیل کے کناروں کو نہیں توڑ پاتا تھا۔آنسوؤں کی زبان کی قرأت جاننے والا سب سمجھ جاتا۔ورنہ'' آنکھوں میں پانی آ گیا ہے'' کہہ کر آنکھیں کسی کپڑے سے صاف کر دی جاتیں کہ بی بی کے ہاتھ بھی شل ہو کر فاضل اعضاء میں شمار ہو چکے تھے۔

بی بی جب جوانی کی دہلیز پر قدم رکھنے لگی تو دادا کو شادی کی فکر ہوئی۔ بہت سے لڑکے دیکھے گئے۔لیکن ایک رشتہ ایسا آیا، جس میں ایک بڑی کھوٹ ہونے کے باوجود، دادا کو پسند آ گیا۔لڑکا رحیم الدین دسویں پاس نوجوان تھا Steel Fabrication کے کام کا ماہر، محنتی، ایماندار اور کسرتی بدن کا مالک تھا مگر لڑکے میں ایک بڑی کھوٹ اور ایک ہلکی سی کمی تھی۔ایک تو لڑکا دو ہیجا (ایک بار شادی ہو چکی ہو) تھا، پہلی بیوی سال بھر قبل ہی انتقال کر گئی تھی۔اس سے کوئی اولاد نہیں تھی۔دوسری کمی لڑکے کا رنگ تھا جو سیاہی مائل تھا۔دادا جہاں دیدہ تھے۔لڑکے اور خاندان کو پرکھ چکے تھے۔رشتہ ہو گیا۔شاندار شادی ہوئی۔ بارات نے تین دن قیام کیا۔خوب خاطر تواضع ہوئی۔ انواع واقسام کے کھانے، گھر کا گھی۔سب کچھ جی بھر کر کھانے کی چھوٹ تھی۔ باراتیوں نے خوب سیر ہو کر کھایا۔ اچھا خاصا جہیز لیے بی بی گاؤں دھنورا آ گئی تھی۔ یہاں آ کر پتہ چلا کہ ساس، سسر، جیٹھ، دیور کے علاوہ تایا زاد سسر کے بچے، زیادہ تر ان سے بڑے،یعنی ایک بھرا پرا گھر تھا۔بی بی کے شوہر رحیم الدین ملازمت کے لیے گاؤں سے باہر جاتے رہتے تھے۔ جب کبھی ماہ۔دو ماہ اور لمبے وقفے کے بعد گاؤں آتے تو گاؤں کے لوگ انہیں گھیر کر بیٹھ

جاتے۔ان سے شہر کے قصے اور حیرت انگیز باتیں سنتے ،کوئی ان کا نام نہیں لیتا بلکہ سبھی بڑے چھوٹے انہیں بابو جی بلکہ زیادہ تر لوگ انہیں باؤ جی کہتے۔ گھر، پاس پڑوس کے گاؤں، ملنے جلنے والے اور رشتہ داروں میں بھی ان کی شہرت 'باؤ جی' کے نام سے ہوگئی تھی۔لوگ انہیں احترام کی نظر سے دیکھتے۔اپنے لڑائی جھگڑوں کے تصفیے، زمین کی تقسیم اور شادی بیاہ میں مشوروں کے لیے انہیں بلایا جاتا۔ان کا کہا پتھر کی لکیر ہوتا۔باؤ جی کا اپنے خاندان میں ایک خاص رتبہ تھا اور ہوتا بھی کیوں نہ، وہ گاؤں کے پہلے شخص تھے، جو خود پڑھے اور دوسروں کو بھی تعلیم کی راہ دکھائی۔ خاندان میں متعدد بچوں کو تعلیم کی تکمیل میں تعاون کیا۔ گاؤں میں نئی روشنی لانے کا سبب بنے تھے۔ گھر میں بھی سب ان کی قدر کرتے۔ بی بی نے شادی کے بعد سے ہی گھر سنبھال لیا تھا کہ وہ گھر کی بڑی بہو تھی۔باؤ جی کے دو سگے بھائی تھے۔ایک بڑے،ایک چھوٹے۔ بڑے بھائی عبدالحکیم بچپن میں ماتا نکل جانے اور طویل بیماری کے سبب بینائی سے محروم ہو گئے تھے۔چھوٹے بھائی جان محمد نے چوتھی پانچویں تک کسی طرح پڑھائی کی تھی۔باؤ جی کے پانچ تایازاد بھائی اور تین بہنیں تھیں۔باؤ جی کے والد ابراہیم علاقے کی نامور شخصیت تھے۔اپنے کام میں ماہر تھے۔اپنے بڑے بھائی کے پانچ بیٹوں اور تین بیٹیوں کی شادیاں کیں۔ کھیتی باڑی کی زمین خریدی اور پھر گاؤں کے اندر بنے چھوٹے سے گھر کو الوداع کہہ کر گاؤں کے باہر پچھمی علاقے میں مٹی کا بڑا سا گھر بنوایا۔اسی گھر کے مختلف حصے میں باؤ جی کے والد اور تایا کے بچے آباد تھے۔ بڑا وسیع وعریض آنگن تھا۔آنگن کے چاروں طرف کچے مکان بنے تھے، بیچ میں راستہ تھا۔راستے پر بڑا سا لکڑی کا دروازہ تھا جس کے اندر ایک طرف باؤ جی کے والد بابا ابراہیم کی چارپائی، حقہ اور کچھ مونڈھے پڑے ہوئے تھے۔سڑک سے گذرنے والے بابا کو نمستے اور سلام کیے بغیر نہ جاتے، کچھ تو رک کر حقہ گڑگڑاتے اور بابا سے دنیا جہاں کی باتیں کرتیں۔بابا، باؤ جی کے بارے میں بڑے فخر سے لوگوں کو بتاتے۔

''ارے بھیم سنگھ...تو ئے پتو ہے رحیم الدین کو دیس والے، وہی ماتانی، نے پگڑی باندھی ہے۔''

''بابا یو پگڑی کائے کو باندھی۔''

''ارے تم نا جانو گے۔ جب کوئی کائی کو اپنا استاد مانے ہے نا، تب وا کو پگڑی باندھے ہے۔ سمجھ گو۔''

''ارے واہ... یو ہوئی نابات، باؤ جی نے تو نام روشن کر دو۔''

گھونگھٹ نکالے... ہاتھ میں پانی اور گڑ لے کر بی بی جب بابا کے پاس آئی تو وہاں بیٹھے لوگوں نے بابا سے کہا۔

''بابا...لالی آئی ہے... پانی لے لیو........''

''لا بٹیا...تو نے اچھا کیا.....مجھے پیاس لگ رہی تھی۔''

بی بی پانی دے کر اندر چلی گئی۔ بابا پانی پی کر بہو کی تعریف کرنے لگے۔

''بھئی ہمیں بہو بہت اچھی ملی ہے...خدا، یا کے بھاگ اچھے کرے۔''

بی بی کی حالت اچھی نہیں تھی۔اب سے آٹھ نو مہینے قبل بھی ایک بار بی بی کی طبیعت بہت خراب ہوگئی تھی۔انہوں نے بولنا چالنا چھوڑ دیا تھا۔ ہاتھ پیر ٹھنڈے ہو چلے تھے۔تقریباً سب نے مان لیا تھا کہ بی بی اب نہیں بچیں گی، لیکن چھوٹے بیٹے احسن کو یقین نہیں تھا، وہ ڈاکٹر کو بلا لائے۔ڈاکٹر نے آکر نبض دیکھی، بی پی چیک کیا، شوگر کا ٹیسٹ لیا اور لمبی سانس لے کر اطمینان کا اظہار کیا۔

''کچھ نہیں......بس شوگر ڈاؤن ہوگئی تھی۔جلدی سے پانی میں زیادہ سی چینی گھول کر پلائیں...اور مریض کے پاس زیادہ بھیڑ نہ کریں۔ٹھیک ہو جائیں گی۔میں دوائیں لکھ رہا ہوں....''

اور واقعی معجزاتی طور پر شربت پینے کے بعد بی بی کی آنکھیں کھلتی چلی گئیں۔زندگی کی رمق واپس آرہی تھی۔آخری وقت کا انتظار کرنے والوں کا انتظار طویل ہو گیا تھا۔ایسا محسوس ہو رہا تھا بی بی کی جان جسم نامی کچے مکان میں کہیں اٹکی ہوئی ہے۔شاید ابھی اور بہت کچھ دیکھنا باقی ہو۔

بی بی نے گھر گرہستی سنبھال لی تھی۔باؤجی کے گھر بہت زیادہ خوش حالی نہیں تھی۔یوں بھی اس زمانے میں عام طور پر ہر شے کی کمی ہی تھی۔کھانے کو گیہوں تو کم کم ہی نصیب ہوتا۔جو، باجرا، مکئی کی روٹیاں عام طور پر دو وقت کھانے کو میسر آتیں۔بی بی علی الصبح اٹھ جاتی اور چکی پر زور آزمائی کرتی۔کبھی جو، کبھی گیہوں اور کبھی مکئی پیس کر آٹا بناتی۔بی بی کی صحت اچھی تھی، وہ کام سے کبھی نہیں تھکتی۔روزانہ تقریباً پانچ کلو آٹا پیس لیتی۔ساس رمضانو بیگم کی خاطر مدارت میں کبھی پیچھے نہیں رہتی۔بابا ابراہیم، نابینا جیٹھ عبدالحکیم، دیور جان محمد، پھر اپنے بچے۔بڑا بیٹا یٰسین، بڑی بیٹی نرگس، پھر احسن اور اختر اور سب سے چھوٹی گلشن۔تقریباً دس بارہ لوگوں کا کھانا تیار کرنا، کھیت کے کام بھی کرنا۔صبح شام، جانوروں کی سانی، ان کے گوبر وغیرہ کی صفائی ستھرائی۔دن بھر مشین بنی رہتی۔دیور کی شادی ہوئی، بہو آئی۔لیکن بی بی کے کام میں کوئی کمی نہیں آئی۔پہلی بار بی بی کی آنکھوں میں آنسو تب آئے جب باؤجی کام کے چکر میں دور دراز شہر چلے گئے۔سال بھر تک ان کا کوئی پتہ نہ چلا۔کوئی خیر خبر، چٹھی نہ تار۔ایسے میں گھر والوں کے رویے میں تبدیلی آگئی تھی۔بچوں کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ان کے پاس ڈھنگ کے کپڑے بھی نہیں تھے۔جب بی

بی کا بھائی انہیں لینے آیا تو بچوں کے اور خود ان کے پاس ایسے کپڑے نہیں تھے کہ وہ میکے جاتیں۔ راستے میں بچوں کے ماموں نے سب کو کپڑے دلوائے۔ بی بی کی آنکھیں بھر آئی تھیں اور یہ بھری آنکھیں جلدی خشک نہیں ہوئیں۔ بابو جی کی خیر خبر کافی دنوں بعد آئی، خوشی کی اس گھڑی نے بھی آنکھوں پر رحم نہیں کیا تقریباً دو سال بعد بابو جی گھر لوٹے تو بی بی کی جان میں جان آئی۔ بابو جی کے آتے ہی گھر والوں نے الٹے، ان کی شکایت کا انبار لگا دیا۔ وہ باؤ جی سے بہت ڈرتی تھی۔ ان کا احترام بھی کرتی اور ہر وقت حکم کی پابند رہتی۔ بابو جی صبح اٹھتے ہی چائے پینے کے عادی تھے۔ بی بی چائے بنا کر پیش کرتی، پھر غسل خانے میں بالٹی میں پانی بھر کر رکھتی۔ گرم پانی بھی اور دوسرا سامان بھی۔ بابو جی ہر موسم میں گرم پانی سے نہانے کے عادی تھے۔ باہر رہ کر بابو جی کے مزاج میں حاکمانہ پن آ گیا تھا۔ وہ بیٹھے بیٹھے حکم فرماتے۔ بی بی ہر حکم پر جی آئی ہی کہتی۔ وہ شوہر اور گھر والوں کی آرام کی خاطر ہمیشہ بے آرام ہی رہیں۔

ایک بار بابو جی شہر سے آئے ہوئے تھے۔ باہر بیٹھک میں گاؤں والوں سے شہر کی باتیں کر رہے تھے کہ نجانے کیا جی میں آئی۔ چہکتے ہوئے بولے۔

''بھئی آج آپ کو پکوریاں کھلواتے ہیں۔۔۔''

اُس وقت پانچ چھ لوگ موجود تھے۔ بابو جی فوراً اندر آئے۔

''بھئی حمیدن۔۔۔ کڑھائی چڑھاؤ۔ پکوریاں بناؤ۔۔۔ اور ہاں تمہیں پتہ ہے مجھے ارد کی دال کی پکوریاں اچھی لگتی ہیں۔''

''جی۔۔۔ مجھے پتہ ہے اور پوے (گل گلّے) بھی۔۔۔''

''ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔''

بی بی اکیلی ڈھیر سارے سامان کے ساتھ تیل، کڑھائی اور لکڑیوں کی آگ سے جوجھتی رہی۔۔۔ گرم گرم پکوان باہر جاتے رہے۔ جتنا آٹا گوندھا گیا تھا سب لگ گیا۔ باہر والے سیر ہو گئے تھے۔ بچے کچھے پر بچوں نے ہاتھ صاف کر دیا تھا۔ بی بی کے حصّے میں صبر ہی آیا تھا جو بارہا ان کا مقدر بنتا تھا۔

چارپائی پر لیٹے لیٹے جب بہت طویل عرصہ گذر گیا تو بی بی کو ایک اور مرض نے آ گھیرا، انہیں Bed Soul ہو گئے۔ کمر میں بڑے بڑے گھاؤ ہو گئے تھے۔ احسن کے گھر ہر طرح کی سہولت موجود تھی۔ بی بی کی مرہم پٹی کے لیے ایک کمپاؤنڈر کا انتظام کیا گیا۔ وہ روزانہ آتا، گہرے زخم کو پہلے صاف کرتا اور پھر مرہم لگا کر پٹی کر دیتا۔

ویسے احسن نے ایسے مرض سے بچنے کے لیے ایک الیکٹرک گدا لادیا تھا جو بجلی سے چلتا تھا اور Vibration پیدا کرتا تھا۔ بی بی کو کچھ آرام تو ہوا۔ ویسے آرام بھی کیا تھا۔ پیشاب کے لیے نلکی اور تھیلی لگی ہوئی تھی اور بیت الخلاء کے لیے پیڈ کا انتظام تھا۔ لیکن روزانہ پیڈ بدلنا، صفائی ستھرائی کا عمل خاصا تکلیف دہ تھا۔ احسن کی بیوی سمیرہ بحسن و خوبی یہ سب کام کر رہی تھی اور بی بی کی دعائیں لیتی۔ لیکن سب کو احساس تھا کہ اب بی بی زیادہ دن کی مہمان نہیں جب کہ ان کی قوت سماعت، آواز، دماغ سب کچھ بالکل درست تھے۔ کئی بار جب انہیں یہ احساس ہو جاتا کہ تیمار دار بے زاری کا اظہار کر رہے ہیں اور ان کی موت کا انتظار ہو رہا ہے تو بڑے طمطراق سے بولتیں:

''مرے میری جوتی۔ تم سب یہ نا سمجھنا کہ میں جلد چلی جاؤں گی...''

ایک مریض کی زبان سے ایسے جملے، کبھی ہنساتے تو کبھی دیر تک رلاتے۔

بابو جی کے دور دراز کے شہر میں بس جانے کے بعد گھر کے حالات میں تیزی سے تبدیلی آئی۔ بی بی جو اب تک ایک بیٹا اور ایک بیٹی کی ماں بن چکی تھی بابو جی کے ساتھ شہر آ گئی تھی۔ گاؤں میں دیور اور دیورانی، نابینا جیٹھ، بابا اور اماں تھیں۔ شہر میں آ کر بی بی کے تین اولادیں اور ہوئیں۔ دو بیٹے اور ایک بیٹی۔ یوں تو کل آٹھ اولادیں ہوئیں تھیں لیکن تین بچے بچپن ہی میں اللہ کو پیارے ہو گئے تھے۔ بی بی اب پانچ بچوں کی ماں تھیں۔ پانچ چھ سال شہر میں رہ کر انہیں پھر واپس گاؤں آنا پڑا کہ اب دیور اور دیورانی شہر پہنچ گئے تھے اور گاؤں میں ایک بہو کی ضرورت تو تھی ہی۔ بی بی نے ایک بار پھر گاؤں کا گھر سنبھال لیا تھا۔ کچھ دنوں بعد ہی اماں رمضانو بھی چل بسیں۔ اب ایسا ہو گیا تھا کہ بابو جی برسوں، شہر میں رہتے کہ وہاں سے آنا آسان بھی نہیں تھا۔ تین دن کا لمبا سفر اور کافی پیسوں کی ضرورت پڑتی تھی۔ بی بی اکیلی بابو جی کے والد، بڑے بھائی اور اپنے دو بچوں کی دیکھ ریکھ کرتی۔ بابا بستر سے لگے تو ان کی خاطر مدارت میں کوئی کسر نہ اٹھا رکھی۔ کئی بار تو بابا کی غلاظت بھی صاف کرنی پڑی اور ان کے گندے اور بدبودار کپڑے دھوتے وقت کبھی بی بی نے اف نہیں کیا۔ لیکن جب گھر کا بٹوارہ ہوا تو بی بی خالی ہاتھ رہ گئی۔ ساس کا زیور پہلے ہی ٹھکانے لگ چکا تھا۔ ٹوٹے ہوئے کچھ برتن اور بوسیدہ سے بستر۔ بی بی نے صبر کیا۔ اپنے آنسوؤں کو آنکھوں سے باہر آنے نہیں دیا۔ ادھر بابو جی نے لگا لگایا کارخانہ چھوٹے بھائی کے حوالے کر دیا اور خود اپنے ہنر کی بدولت کسی دوسرے کارخانے میں ملازمت کر لی۔ نتیجہ صاف تھا، چھوٹے بھائی کے وارے نیارے ہوتے رہے اور بابو جی اور بی بی ایک دوسرے سے دور رہتے ہوئے زندگی کی گاڑی کو بمشکل تمام کھینچ رہے تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ بابو جی نے بہت اچھی اچھی ملازمتیں کیں۔ خوب اچھی تنخواہ پائی اور اسی حساب سے خرچ بھی

کیا۔کبھی مستقبل کی فکر نہ کی۔دوسری طرف بی بی نے ایسے دن دیکھے کہ سلیقہ، کفایت شعاری اور دور اندیشی گھر کرتی گئی۔گھر کو کم خرچ ہی میں سلیقے اور عمدگی سے چلاتی پھر بھی کبھی کبھی بھو کے پیٹ بھی سونا پڑتا۔دن رات محنت مشقت کے بعد جب رات کو بھوکے پیٹ سونا پڑے تو انسان پر کیا گذرتی ہے یہ کوئی بی بی سے پوچھے۔لیکن بی بی نے کبھی شکوہ، شکایت نہ کی۔صبر، اللہ توکل اور کم گوئی سے انہوں نے مشکل سے مشکل وقت بھی گذار لیا۔دادا بھی رخصت ہوئے۔بڑے بیٹے اور بیٹی کی شادی ہوگئی۔بابو جی اب زیادہ وقت گاؤں میں گزارتے پھر کام کے لیے شہر چلے جاتے۔سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا کہ ایک پریشانی ایسی آئی جس نے بی بی سمیت پورے گھر کو متزلزل کر کے رکھ دیا، ہوا یوں کہ سب سے چھوٹے بیٹے اختر کے پیر میں چوٹ لگی۔گم چوٹ تھی۔درد کے افاقے کے لیے گولی کھالی اور کام پر لگ گئے۔کچھ دن بعد زخم نے خطرناک صورت اختیار کر لی۔ایک ڈاکٹر کو دکھایا تو اس نے آپریشن کر دیا اور کچھ دن بعد علم ہوا کہ زخم نے کینسر کی شکل اختیار کر لی ہے۔کینسر اسپتال میں علاج شروع ہوا۔تقریباً ڈیڑھ سال کے علاج کے دوران گھر کی جمع پونجی، زیور وغیرہ فروخت ہو چکے تھے۔یہی نہیں قریبی رشتہ داروں سے خاصا قرض بھی لینا پڑا اور آخر کار ایک نوجوان، زندگی کی جنگ ہار گیا۔یہ صرف ایک مریض کی موت نہیں تھی، بلکہ جذبات کی، معاش کی اور خوشیوں کی موت تھی۔بی بی، بابو جی تو زندہ رہتے ہوئے بھی لاش میں تبدیل ہو چکے تھے۔اختر کی موت کا بی بی پر گہرا اثر ہوا، صدمہ ایسا تھا کہ اب تک زندگی کی تیز تند ہواؤں کا تن تنہا مقابلہ کرنے والی بی بی نے ہتھیار ڈال دیے۔غم اندر اندر بیٹھنے لگا۔اختر جنازے کی شکل میں گھر سے چلا تو گیا لیکن بی بی کے دل قبرستان میں ایسا آباد ہوا کہ بی بی کے اندر سے ہر لمحہ اختر اختر کی آواز آتی رہتی گویا اختر دور آسمان پر چلا گیا ہو اور مانند ستارہ چمک رہا ہو اور کبھی نظر آتا اور کبھی چھپ کر آنکھ مچولی کرتا۔بی بی کی صحت خراب رہنے لگی۔مختلف بیماریوں نے بی بی کے جسم نما مکان کی کچی دیواروں میں کنکھجوروں اور خودرو پودوں کی طرح ٹھکانے بنالئے تھے۔اختر کی جدائی کا غم بوند بوند دیواروں میں سرایت کر رہا تھا اور بیماریوں کی آبپاشی کر رہا تھا۔

جوان بیٹے کی موت نے بی بی اور بابو جی دونوں کو ہلا کر رکھ دیا تھا۔بی بی کی طبیعت اب زیادہ خراب رہنے لگی تھی۔لیکن قدرت کے کھیل بھی بڑے نرالے ہوتے ہیں۔وہ ہر غم اور زخم کو مندمل کر دیتی ہے۔اگر ایسا نہ ہوتا تو نجانے کتنے لوگ مرنے والوں کے ساتھ اور کتنے ان کے غم میں مر جاتے۔قدرت غم سے ابھرنے کا حوصلہ عطا کرتی ہے اور یہی زندگی کا فلسفہ بھی ہے کہ سب سے بڑی حقیقت زندگی ہے۔بڑے سے بڑا غم اور دکھ بھی ایک دن ختم ہوتا ہے اور انسان کو اپنے معمول پر لوٹنا ہوتا ہے۔بی بی اور بابو جی بھی آہستہ آہستہ اختر کے غم کے عمیق سمندر

سے ابھر رہے تھے، اب بابو جی کا مزاج خاصا تبدیل ہو چکا تھا۔ اب وہ بی بی کا زیادہ خیال رکھنے لگے تھے۔ یہی نہیں دونوں ایک دوسرے کا خیال رکھتے اور زیادہ تر ایک ساتھ رہتے۔ سبھی بچوں کی شادیاں ہو چکی تھیں۔ دونوں بیٹیاں اپنے اپنے گھر کی ہو گئی تھیں بلکہ بال بچے والی ہو گئی تھیں۔ دونوں بیٹے بھی اپنے پیروں پر کھڑے تھے اور شہر میں آباد تھے۔ چھوٹا بیٹا احسن ایک بڑی ملازمت پر پہنچ گیا تھا۔ اس کو سرکاری رہائش اور دیگر سہولتیں حاصل تھیں۔ بڑا زندگی کی مشقتوں سے نبرد آزما تھا۔ دونوں بیٹے بھی صاحب اولاد ہو چکے تھے۔ بی بی اور بابو جی پوتے، پوتیاں، نواسے، نواسیوں کے درمیان خود کو ہلکا کر لیتے۔ بی بی کو گاؤں کا گھر زیادہ پسند تھا۔ کچی مٹی کا مکان۔ اینٹیں بھی مٹی کی۔ گارا بھی مٹی کا۔ زمین مٹی، چھت مٹی۔ فرش پر مٹی کا لیپ۔ ہر طرف مٹی ہی مٹی۔ کھلا ہوا بڑا سا آنگن، بڑے بڑے کمرے، باہر بیٹھک۔ جب کبھی بی بی گوبر اور پیلی مٹی سے آنگن اور گھر کو لیپتیں، پورے گھر میں سوندھی سوندھی خوشبو رقص کرتی۔ پھر گائے بھینس کا دودھ دہی اور گھی۔ کھیتوں سے تازہ سبزیاں اور بعض پھل بھی آ جاتے۔ روزانہ رات کو بی بی گھر کے بڑوں اور بچوں کو بیلا اور کٹورا (پیتل کے برتن) میں پینے کو دودھ دیتیں۔ بغیر دودھ پیئے کوئی سو جاتا تو اسے اٹھا کر دودھ پلایا جاتا۔ مہمان کو بھی دودھ پینا ہی پڑتا تھا۔ بعد میں بی بی بچے ہوئے دودھ کو جمنے کے لئے مٹی کی چپٹیا (ایک برتن) میں، تھوڑا سا جامن ڈال کر رکھ دیتیں۔ اور دودھ کی خالی ہنڈیا (برتن) سے دودھ کا کھرچن نکال کر ہمیں کھلاتیں اور خود بھی کھاتیں۔

بی بی گاؤں کے بوسیدہ سے مکان کو بھی محل سمجھتی کہ انہوں نے اس گھر کو بنانے میں ایک ایک لمحہ صرف کیا تھا۔ بابا سے لے کر اماں اور پھر نابینا جیٹھ اور پھر اپنے بچے...سب کو اپنی محنت، محبت اور حکمت سے سنبھالا تھا۔ جب کبھی لیٰسین اور احسن، بی بی اور بابو جی کو شہر لے جاتے۔ دونوں کچھ دنوں بعد ہی واپس گاؤں جانے کی ضد کرتے۔ برسوں سے دونوں میاں بیوی ایک جان دو قالب بنے ہوئے تھے اور جہاں رہتے ساتھ ہی رہتے۔ بابو جی کی صحت بی بی سے زیادہ اچھی تھی۔ یوں بھی بابو جی کو کسی نے کبھی بیمار نہیں دیکھا یعنی کوئی بڑی بیماری ان کے پاس نہیں آئی۔ نزلہ، زکام، کھانسی کبھی آ بھی جاتیں تو بہت جلد راہ فرار اختیار کر لیتیں۔ یہی سبب ہے کہ بابو جی، بی بی کا بہت خیال رکھتے۔ ایک بار دونوں بھائیوں لیٰسین اور احسن نے منصوبہ بنایا کہ دونوں میں ایک والد کو اور دوسرا والدہ کو اپنے گھر رکھیں گے۔ بابو جی اور بی بی نے اس کی سخت مخالفت کی۔

"کچھ بھی ہو...ہم الگ نہیں رہیں گے۔ جہاں رہیں گے ساتھ رہیں گے۔"

بابو جی نے اعلان کر دیا تھا۔ بی بی بھی ان کی ہاں میں ہاں ملاتیں۔ انہیں یہ بھی ڈر تھا کہ ہماری کہانی فلم

باغباں جیسی نہ ہو جائے۔ جہاں رہیں گے ساتھ رہیں گے اور جو روکھی سوکھی ملے گی شکر ادا کریں گے۔

بچوں کے لاکھ سمجھانے اور منانے کے باوجود بی بی اور بابو جی گاؤں چھوڑنے کو تیار نہیں تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ اکثر رمضان اور عید، وہ کبھی احسن کبھی یٰسین کے گھر آ جاتے۔ مہینہ دو مہینہ رہتے اور کبھی خوشی خوشی اور کبھی گھر کے حالات کے رخ کو بھانپتے ہوئے گاؤں جانے کی ضد کرتے۔ کئی بار گھر کے حالات عجیب صورت اختیار کر لیتے اور ان کی گاؤں واپسی آنکھوں کے سمندر میں بلا کا طوفان بپا کر کے ہوتی۔

جب بی بی نے چارپائی نہیں پکڑی تھی، تب بھی ان کی حالت کئی بار بہت بگڑی۔ یوں بھی جب وہ گاؤں سے آتیں، اکثر احسن انہیں گاڑی میں لے آتے۔ یہاں آکر پتہ چلتا کہ شوگر چار سو اور پانچ سو کے پار ہے تو انہیں فوراً اسپتال میں داخل کرایا جاتا۔ اسپتال میں بی بی کا رہنا بھی گھر والوں کے لیے بہت آسان نہیں تھا۔ بابو جی زیادہ تر ان کے پاس ہوتے۔ احسن اسپتال اور گھر کے درمیان پل بن جاتے۔ احسن کے بیوی بچے آتے جاتے رہتے۔ کھانا وغیرہ بھی گھر سے آ جاتا۔ یٰسین پاس کے دوسرے شہر میں مقیم تھے، وہ اور ان کے بچے بھی حاضری لگا جاتے۔ ان سب کے باوجود بی بی میں ایک عجیب بات تھی کہ وہ اپنی ضد کی پکی تھیں۔ کبھی کبھی بے جا ضد بھی کر لیتیں۔ شوگر کی مریض ہوتے ہوئے پرہیز نہیں کرتی تھیں جس کے سبب کئی بار حالات ناگفتہ بہ ہو جاتے تھے اور شہر سے گاؤں جانے کے پیچھے جہاں ان کی گاؤں، اپنے گھر، کھیت کھلیان سے محبت تھی، وہیں انہیں کچھ بھی کرنے کی آزادی بھی تھی کہ وہاں ان کے ساتھ صرف بابو جی ہوتے جو دن بہ دن نرم ہوتے جا رہے تھے اور بی بی کی مرضی کے خلاف کچھ نہیں کرتے۔ گاؤں میں بی بی میٹھی اشیا کا بے دریغ استعمال کرتیں۔ سوغات میں آنے والی مٹھائیاں بی بی کے معدے میں جا کر ہی دم لیتیں۔

ایک بار جب ان کی حالت زیادہ بگڑ گئی تو احسن انہیں شہر لے آئے اور فوراً اسپتال میں داخل کرایا۔ بی بی کی حالت ٹھیک نہیں تھی۔ شوگر کے علاوہ بی بی کو بواسیر کی پرانی بیماری تھی۔ اس سے بہت پریشان رہتیں۔ انتہائی نگہداشت کے کمرے میں بی بی زیرِ علاج تھیں۔ بابو جی کی ہمت جواب دے رہی تھی۔ بی بی کچھ بول نہیں پا رہی تھیں۔ صرف آنکھوں کی پتلیاں حرکت میں تھیں، جو آنسوؤں سے تر تھیں۔ یہ آنسو اپنے اندر نجانے کتنی کہانیاں لیے ہوئے تھے۔

بی بی اور بابو جی کا تقریباً پچپن سالہ ساتھ تھا۔ شادی اور اس کے بعد کے دس بارہ سال تو بی بی نے سسرال، ساس، سسر اور شوہر کو سمجھنے میں ہی لگا دیے۔ بعد کے تقریباً پینتیس سال بی بی نے گھر کے حالات کو

سدھارنے میں وقف کر دیے تھے۔اس طویل عرصے میں وہ بمشکل تمام چند سال بابو جی کے ساتھ رہی ہوں گی۔ باقی پوری زندگی شوہر کے بغیر ساس، سسر اور جیٹھ عبدالحکیم کی خدمت میں لگادی تھی۔ دادا کو، خود بابو جی کو بھی بیلوں کا بڑا شوق تھا۔ یوں بھی یہ وہ زمانہ تھا جب بیلوں کی جوڑی سے گھر اور خاندان کی شان بڑھا کرتی تھی۔ بی بی نے ساتھ ہی دو تین بھینسیں، بھی پال رکھیں تھیں، گھر اچھا خاصا طویلہ بنا ہوا تھا۔ بی بی جانوروں کا سارا کام کرتیں۔ ایسے میں جب ان کاموں کی تعریف تو دور، خامیاں نکالی جاتیں تو بی بی کو بڑی تکلیف ہوتی۔ ویسے بھی دادا کا رخ اپنے چھوٹے بیٹے کی طرف زیادہ تھا۔ بی بی کی حق تلفی ہوتی اور وہ خون کا گھونٹ پی کر، پھر سے کام میں جٹ جاتیں۔

بی بی بڑی نڈر اور بے خوف تھیں۔ رات کو بھی آنگن میں چار پائی ڈالے پوری رات سوتے جاگتے گذارتیں۔ ایک بار کا ذکر ہے۔ احسن کی نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ بی بی باہر برآمدے میں چار پائی پر لیٹی تھیں۔ احسن اور اس کی بیوی کمرے میں۔ رات کے کسی پہر احسن کے کمرے میں کھڑ پڑسی ہوئی۔ اصل میں کمرہ کیا تھا۔ کباڑ خانہ زیادہ تھا۔ گھر کا فاضل سامان، ٹرنک، مٹی کے برتن، لکڑی کا سامان، اور نجانے کیا کیا۔ بس ایک طرف پلنگ کے لیے مجبوری میں جگہ بنائی گئی تھی۔ کمرے کا فرش کچا تھا۔ جس میں کہیں کہیں چوہوں کے بل بھی موجود تھے۔ رات جب کھڑ پڑسی ہوئی تو احسن کی آنکھ کھل گئی۔

''بی بی۔۔۔بی بی۔۔۔''

''ہاں بھیا۔۔۔احسن۔۔۔کیا ہوا۔۔۔''

بی بی نے جلدی سے ٹارچ جلائی اور اندر کمرے میں جا پہنچی۔

''بی بی۔۔۔ایسا لگ رہا ہے کمرے میں کچھ ہے۔۔۔؟''

احسن کی بیوی ڈر کے مارے پہلے ہی پلنگ پر کھڑی ہو گئی تھی۔ احسن بظاہر بے خوف دکھ رہے تھے۔ جبکہ دل میں وسوسے زندہ تھے۔ بی بی نے ٹارچ سے اِدھر اُدھر دیکھا۔ ٹارچ کی روشنی میں ایک سانپ کنڈلی مارے دکھائی دیا۔

''بی بی۔۔۔سانپ ہے۔۔۔آپ ہٹو۔۔۔میں مارتا ہوں۔۔۔'' احسن نے ہاتھ میں لاٹھی اُٹھالی تھی۔

''اوئی۔۔۔'' سمیرہ زور سے چیخی۔ احسن نے اس کے منہ پر ہاتھ رکھ کر خاموش کیا۔

''بھیا نہیں۔۔۔یہ خطرناک سانپ نہیں ہے۔ یہ دمئی (دومہا سانپ) ہے۔ اسے مارتے نہیں۔ یہ نقصان نہیں پہنچاتی۔''

’’میں ابھی نکال دیتی ہوں۔‘‘

بی بی نے ایک ڈنڈی سے اُسے باہر نکالا۔ بیچوں بیچ سے پکڑ کر باہر لے آئیں اور آنگن میں ایک طرف کو چھوڑ دیا۔ سمیرہ بہت دیر تک سانس لینا بھول گئی تھی۔ احسن کے اندرون میں خوف کی لہریں رینگ رہی تھیں۔

جب تک باؤ جی باہر شہر میں کام کرتے رہے، گاؤں آنا سال دو سال میں ہوتا اور اس عرصے بی بی اپنے بچوں کی دیکھ بھال اور پڑھائی کا انتظام کرتیں۔ شہر میں رہتے ہوئے باؤ جی کے مزاج میں ایک عجیب قسم کا شاہانہ پن آ گیا تھا۔ یوں بھی وہ بہت شاہ خرچ تھے۔ خوب کمایا اور خوب خرچ کیا۔ جب کبھی گاؤں آتے، بی بی خوش تو بہت ہوتیں لیکن باؤ جی کی انواع واقسام کے کھانوں کی فرمائش سے تنگ بھی ہو جاتیں مگر کبھی حرف شکایت زبان تک نہ آتا۔ ایسی شوہر پرست عورتیں کم کم ہوتی ہیں۔ لیکن ادھر جب سے باؤ جی نے کام کاج چھوڑ کر گاؤں کو مستقل اپنا مسکن بنالیا تھا، بی بی کے مزاج میں زبردست تبدیلی آئی تھی۔ جس کی وجہ ان کی بیماری اور بابو جی کی تیمارداری بھی تھی۔ اب بی بی اور باؤ جی کے رول بدل گئے تھے۔ بی بی میں حاکمانہ انداز آ گیا تھا اور بابو جی بے چارے محکوم سے ان کی ہر خوشی کا خیال رکھتے۔ گھر کے کئی گھر ہو گئے تھے۔ بیٹیاں تو اپنے اپنے گھروں کی ہو گئی تھیں، دونوں بیٹے دو الگ الگ شہروں میں قیام پذیر تھے اور گاؤں کا گھر بی بی کے دم سے آباد تھا۔ اس گھر کے بنانے میں بھی بی بی کی بڑی قربانیاں تھیں۔ سب سے پہلے دیور جان محمد نے اپنے حصے کی زمین پر شاندار پختہ مکان بنوایا۔ اس کے بعد باؤ جی نے زمین کے پچھلے حصے میں دو کمرے اور ایک برآمدہ بنوایا۔ بی بی نے ایک ایک اینٹ جوڑی۔ اپنے زیور فروخت کیے۔ قرض لیا۔ روکھی سوکھی کھا کر سر چھپانے کو ایک چھت ڈلوائی تھی۔

ایک بار کا قصہ ہے کہ باؤ جی نے گھر کے سامنے واقع قبرستان کی چہار دیواری کا بیڑہ اٹھایا۔ شروع سے دیوار ہونے تک خاندان کے لوگوں کے دلوں میں بھی دیواریں بلند ہو گئی تھیں۔ وسیع وعریض آنگن والا کچا مکان اب مختلف حصوں میں منقسم ہو گیا تھا۔ باؤ جی نے مکان بنوایا لیکن آنگن پھر بھی برقرار رہنے دیا کہ آپسی محبت اور لین دین جاری وساری رہے۔ جس کام میں بی بی ماہر تھیں۔ دوسروں کے کام آنا، غریبوں کی دستگیری اور غمگساری کرنا ان کا شیوہ تھا۔ رمضان کے دنوں روزانہ دور گاؤں کے فقیر آتے۔ بی بی ان کے لیے افطار اور کھانا تیار کرتیں اور دعائیں لیا کرتیں۔ گاؤں کی بھنگن صفائی ستھرائی کے بعد روٹیاں لے کر جاتی۔

قبرستان کی چہار دیواری سے دلوں میں دن بہ دن اونچی ہوتی دیوار نے مجبور کر دیا کہ وہ صحن میں بھی ظاہر ہو اور باؤ جی نے بیچ صحن میں ایک دیوار تعمیر کرا دی۔ اِدھر دو بھائیوں کے مکان اور اُدھر تایا زاد چار بھائیوں

کے مکانات ۔صدیوں سے چلی آرہی محبت دیوار کے سائے تلے آ گئی تھی۔ بی بی نے اس کے بعد بھی اپنی محبت اور رحم دلی کو دیوار کا محتاج نہیں بننے دیا۔ اکثر تایا زاد بھائیوں کے بچے اور پوتے پوتیاں، کسی نہ کسی بات پر لڑائی جھگڑے کا بیج بوتے اور گرم مزاج باؤجی ترکی بہ ترکی جواب دیتے تو ایسے میں بی بی تھیں جو اپنی نرم مزاجی سے معاملات کو رفع دفع کرتیں۔

بی بی بالکل پڑھی لکھی نہیں تھیں۔ ویسے بھی وہ جس زمانے میں پلی بڑھیں ۔اس وقت لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج عام نہیں تھا۔ وہ مذہبی تعلیم سے بھی آراستہ نہیں تھیں ۔لیکن بہت تجربہ کار اور جہاں دیدہ تھیں ۔ایسی کون سی بات تھی جو انہیں پتہ نہیں تھی۔ کھانے پکانے ، سینے کاڑھنے میں ماہر، اپنے کپڑے، بچوں کے کپڑے خود تیار کرلیتیں ۔نماز بھی اور تسبیح بھی پڑھا کرتیں ۔ روزے پابندی سے رکھتیں۔ غریبوں کی مدد کرنا، رشتہ داروں کی دل جوئی کرنا اور بچوں کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھنا۔ ان کا معمول تھا۔

بی بی اتنی سلیقہ شعار تھیں کہ گھر کو ہمیشہ صاف ستھرا رکھتیں۔ ہر چیز کا وافر خزانہ رکھتیں۔ ایک ساتھ آٹھ دس مہمان بھی آ جاتے تو نہ چارپائیاں کم پڑتیں اور نہ ہی بستر اور یوں بھی کبھی زیادہ مہمان آ جاتے تو خاندان کے گھروں سے ہی سارا سامان پورا ہو جاتا۔ کھانے پینے کی چیزیں بھی اسی حساب سے جمع ہوتیں۔ یہی نہیں گھر میں گھی کا بھی خزانہ ہوتا، بچے سال بھر گھر کا گھی اور مکھن کھاتے اور مہمانوں کے لیے بھی کمی نہیں پڑتی۔ بہنیں اور بیٹیاں رخصت ہوتیں تو ان کے لیے نجانے کہاں سے جوڑے نکال لاتیں۔ انہیں جوڑوں کے ساتھ پیسے بھی دیے جاتے اور پھر گھر سے دور فتح کے کنویں تک سبھی چھوڑنے جاتے۔ وہاں پیڑوں کا جھنڈ تھا۔ تھوڑی دیر مہمان اور میزبان دونوں ستا لیتے اور پھر مہمان دور پکی سڑک تک پیدل جاتے۔ بی بی اور دوسری عورتیں واپس گھر آ جاتے۔ زمانے تک گاؤں کا کوئی پختہ راستہ نہیں تھا اور نہ ہی گاؤں کے لوگوں کے پاس سائیکل ،بیل گاڑی، بگی اور گھوڑا گاڑی کے علاوہ کوئی سواری۔ سائیکل بھی کم لوگوں کے پاس تھی، کسی کے پاس ہوتی بھی تو جہیز کی ہوتی۔ اس دن بی بی کی خوشی کا ٹھکانہ نہیں تھا جب اس کا لاڈلہ احسن اپنی کار لے کر انہیں لینے گاؤں آیا۔ وہ آس پڑوس میں خوشی بانٹتی پھری۔ احسن لڈو لے کر آیا تھا۔ بی بی نے پڑوس میں لڈو بانٹے۔

''بی بی کیا لائی ہو......؟'' رشیدن اماں نے پوچھا۔

''باجی احسن نے کار خریدی ہے......''

بی بی کی خوشی، ان کے لفظوں بلکہ حرف حرف سے پھوٹ رہی تھی۔ اور وہ احسن کی کار میں کچھ اس انداز

میں بیٹھیں گویا ہوائی جہاز میں بیٹھی ہوں۔ بابو جی بھی کار میں بیٹھے، ادھر ادھر کھڑے اور کھیتوں میں کام کرتے گاؤں والوں کو ہاتھ ہلا ہلا کر خوش ہو رہے تھے۔

ایک وقت ایسا بھی آیا۔ جب بی بی گھر پر اکیلی رہ گئیں ۔احسن اور یٰسین دوسرے شہروں میں اپنے بچوں کے ساتھ مقیم تھے۔ بابو جی اکثر کبھی احسن کے پاس کبھی یٰسین کے پاس اور کبھی اپنے کام کے سلسلے میں کئی کئی مہینے باہر رہتے ۔ لمبے چوڑے مکان میں بی بی اکیلی رہتیں ۔ ڈر خوف تو انہیں چھو کر بھی نہیں گذرا تھا کہ وہ کچے مکان کی پختہ دل مکین تھیں ۔ گھر کے سامنے دگڑا (کچا راستہ) تھا اور اس سے ملا ہوا کئی بیگھوں میں پھیلا ہوا قبرستان، جو برسوں سے بے در و دیوار، تھا۔ بابو جی نے اس کی چہار دیواری کرادی تھی ۔ بی بی ایسے ماحول میں بھی تنِ تنہا رہتیں ۔ رات میں ہونے والی ہر آہٹ کو وہ جانتی تھیں ۔ آنگن میں کب کتا آیا، اور کون سی آہٹ بلی کی ہے۔ دودھ، سبزی وغیرہ کی رکھوالی کرتیں ۔ ایک بار ہلکی ہلکی گرمی کے دن تھے ۔ شاید ستمبر کا مہینہ تھا۔ بی بی آنگن میں چار پائی بچھایا کرتیں ۔ مکا کی فصل کی کٹائی ہوئی تھی اور لکڑیوں کا ڈھیر آنگن میں پڑا تھا۔ بی بی نے لکڑیوں کے پاس ہی چار پائی بچھائی تھی ۔ چار پائی کے آگے پیچھے اور نیچے بھی لکڑیاں پڑی تھیں ۔ رات میں کسی وقت بی بی کو کسی آہٹ کا احساس ہوا۔ شاید کوئی کتا آنگن میں آ گیا تھا۔ کچھ جاگی کچھ سوئی بی بی نے چار پائی کے نیچے ہاتھ ڈالا۔ لکڑی اُٹھا کر کتے کی طرف اچھالنے کا ارادہ ہی کیا تھا کہ انہیں ہاتھ میں لکڑی کے بجائے کوئی اور لج لجی چیز کا احساس ہوا۔ فوراً ہاتھ جھٹکا تو کوئی شئے دور جا گری ۔ روشنی کر کے دیکھا تو سانپوں کا جوڑا تھا۔ بابو جی بھی جاگ گئے تھے انہوں نے بڑی مہارت سے دونوں کو اوپر پہنچا دیا۔ بابو جی کے بارے میں مشہور تھا کہ وہ سانپ مارنے کے خوب ماہر تھے۔ خود بابو جی بتاتے تھے کہ انہوں نے اپنی زندگی میں سینکڑوں سانپ مارے تھے۔

بی بی کے آخری پندرہ دن بڑی کسمپرسی کے تھے۔ گویائی چلی گئی تھی۔ کھانے پینے میں بہت حد تک کمی آ گئی تھی کہ اب جوس، پانی اور پتلی چیزیں چمچ سے منہ میں ڈالی جاتیں۔ احسن کسی لمبے سفر پر باہر گئے ہوئے تھے۔ انہیں وہیں باؤ جی کا پیغام ملا:

''اگر اپنی بی بی کی شکل دیکھنے کی خواہش ہو تو آ جاؤ.......''

بس اتنا کہہ کر بابو جی نے فون بند کر دیا تھا۔ بابو جی کے لہجے کی ترشی، احسن نے محسوس کی تھی۔ اس کا ریزرویشن ایک دن بعد کا تھا۔ بغیر ریزرویشن سفر کتنا تکلیف دہ ہوتا ہے یہ سب کو پتہ ہے اور دو دن بعد احسن سیدھے بڑے بھائی یٰسین کے گھر ہی پہنچے۔ بی بی گذشتہ کئی ماہ سے یٰسین کے گھر ہی تھیں۔ اس کی بھی ایک کہانی

ہے۔بابو جی کسی بات سے ناراض ہو کر احسن کے گھر سے گاؤں چلے گئے تھے۔بی بی کی طبیعت بہت خراب تھی۔ بابو جی کی ضد تھی کہ بی بی کو گاؤں پہنچاؤ۔احسن اور یٰسین دونوں بھائیوں میں آپسی مشورے میں طے پایا تھا کہ بی بی کچھ وقت ایک کے پاس کچھ دوسرے کے پاس رہیں گی۔احسن زیادہ تر باہر سفر پر رہتے۔ایسے میں بی بی کی خاطر تواضع اور مہمانوں کا خیال رکھنے کی ذمہ داری احسن کی بیوی سمیرہ پر آجاتی۔مہمانوں کا سلسلہ کافی طویل ہوتا۔سمیرہ کا خیال تھا، بی بی کچھ دن کے لیے یٰسین بھائی کے گھر چلی جائیں۔ہم پھر بلا لیں گے اور اس طرح رضامندی اور ناراضگی کے جھولے میں سوار بی بی یٰسین بھائی کے گھر آگئی تھیں۔ہمارے سماج کی ایک اور عجیب سی رسم ہے کہ ماں باپ کی چاہے حالت کتنی ہی خراب کیوں نہ ہو جائے، انہیں بیٹوں کے پاس ہی رہنا ہے، بیٹیاں اگر اپنے ماں باپ کو اپنے گھر لے جائیں تو سماج میں ان کی اور ان کے بھائیوں کی ناک کٹ جاتی ہے۔

اس کے دل میں آئی کہ بی بی کو اپنے ساتھ لے جائے اور کسی بڑے ڈاکٹر کو دکھائے۔لیکن اس سے قبل کہ یہ خیال عمل کے دروازے تک پہنچتا، ایک آواز گونجی۔

''کسی نے اماں کو لے جانے کی بات بھی نکالی تو زبان کھینچ لوں گی۔۔''

آواز گھر کی ذمہ دار خاتون کی تھی۔وہاں موجود سبھی، خاموش ہو گئے تھے۔احسن بی بی کے اخیر وقت میں کوئی تماشا نہیں چاہتے تھے، اس وجہ سے یا پھر واقعی ڈر گئے تھے، چپ چاپ بیٹھے بی بی کے سرہانے دعائیں پڑھتے رہے۔

ایک دن احسن جیسے ہی یٰسین کے گھر پہنچے، دیکھا بی بی کے پاس بابو جی، بڑی بیٹی، چھوٹی بیٹی اور دوسرے رشتہ دار بھی جمع تھے۔اس نے دیکھا بی بی کی حالت خاصی خراب ہے اور دوا کی بجائے ان کے آخری وقت کا انتظار ہو رہا ہے۔احسن نے بی بی کی آنکھوں کے بھیگے کونے دیکھ کر سب کچھ محسوس کر لیا تھا۔احسن نے بی بی کے پاس پہنچ کر آواز دی۔

''بی بی۔۔۔۔بی بی۔۔۔۔''

آنکھیں کھلیں، پلکیں اوپر اٹھیں۔منھ کھلا۔کوئی آواز نہیں آئی۔مگر لگا کہہ رہی ہوں۔

''احسن کہاں تھے بیٹے۔میں کب سے تمہارا انتظار کر رہی تھی۔''

آنکھوں میں پانی بھر آیا تھا۔احسن نے رومال سے آنکھیں صاف کیں تو اس کی آنکھوں سے ایک قطرہ بی بی کے چہرے پر گرا۔بی بی کی آنکھیں بول پڑیں۔

''رومت میرے لال۔۔۔''

فوراً ڈاکٹر کو بلوایا، گلوکوز اور دوسری دوائیاں شروع کرادیں اوراپنے شہر آ گیا۔ احسن نے روزانہ کا معمول بنالیا تھا کہ شام اپنی ضروریات سے فارغ ہوکر رات کو بی بی کے پاس پہنچ جاتا اور رات ان کے پاس گذار کر صبح پھر اپنے شہر آ جاتا۔

بی بی کی بیماری لمبی ہوگئی تھی۔ سال بھر سے بھی زیادہ سے بی بی گاؤں نہیں گئی تھیں۔ بابو جی کی صحت ٹھیک تھی، وہ کبھی کبھار گاؤں جاتے اور گھر کھول کر دیکھ آتے۔ آنگن میں خودرو پودوں کی فصل تیار ہو جاتی۔ بڑی مشکل سے اُسے صاف کیا جاتا۔ کئی مہینوں سے سب بی بی کی بیماری میں مصروف تھے۔ بی بی یٰسین بھائی کے یہاں تھیں۔ یٰسین بھائی، ان کی بیوی، بڑی بہن، چھوٹی بہن، سب نے مشورہ کیا کہ اب گاؤں کے گھر میں کون رہے گا۔ لہٰذا وہاں کا سامان نکال لایا جائے۔ بابو جی نصف راضی سے مشورے میں شریک تھے۔

بی بی کی محنت سے ایک ایک چیز جوڑنے سے جو گھر بنا تھا، اس کا سارا سامان نکالا جارہا تھا۔ احسن بھی آ گئے تھے۔ ان کی مرضی نہیں تھی۔ وہ نہیں چاہتے تھے کہ بی بی اور بابو جی کی زندگی میں اس گھر کے سامان کو ہاتھ لگایا جائے۔ مگر وقت کب روکے رکا ہے۔ جو ہونا ہوتا ہے وہ ہوکر رہتا ہے۔ یہ زندگی کا اصول ہے۔ ہر تعمیر کو انجام کار ڈھہنا ہوتا ہے۔ خواہ وقت کتنا ہی لگ جائے۔ مٹی سی بنی ہر شئے کو مٹی ہی ہونا ہوتا ہے۔ گھر کا سارا سامان، چار پائیاں، لکڑی کے بکس، آہنی ٹرنک، کھیتی کے اوزار، بستر، خانہ داری کا سامان۔ سب کچھ ٹرک میں بھرا جا چکا تھا۔ کچھ سامان۔۔ ایک چار پائی، بستر، کھانا پانی پینے کے کچھ برتن، وغیرہ چھوڑ دیے گئے کہ کہیں بابو جی آ جائیں تو رات گذار سکیں۔ چڑیا کا تنکا تنکا جوڑ کر بنایا گھونسلہ، تار تار ہو چکا تھا۔

جب شام کو بی بی کو پتہ چلا کہ ان کا خون پسینے سے بنایا آشیانہ اجڑ گیا ہے تو ان کی آنکھوں میں سیلاب آ گیا۔ تقریباً نصف صدی کا بسابسایا گھر صرف دیوار اور چھت بن کر رہ گیا تھا۔ بی بی کی آنکھوں کا دریا کنارے توڑنے پر اتارو تھا۔ مگر اس حالت میں بھی بی بی کی غیرت کے باندھ نے پانی باہر آنے نہیں دیا۔

اور وہ دن بھی آن پہنچا جب بی بی کی آنکھوں کا پانی خشک ہوگیا۔ پانی ہی کیا سب کچھ ختم ہوگیا تھا۔ بی بی نے آخری سانس لے کر اس بوسیدہ سے بھر بھرائے کچے مکان سے رخصت لی۔ گھر میں کہرام مچ گیا تھا۔ بیٹیاں، بہوئیں، رشتہ دار سب آہ و بکا میں مصروف تھے۔ بی بی نے آخری سانس رات دس بجے کے آس پاس لی تھی۔ مشورہ ہوا کہ اگلے دن صبح گیارہ بجے انہیں ہمیشہ کے لیے رخصت کیا جائے گا۔ یعنی بے نور آنکھوں اور مٹی ہو چکے جسم کو ایک سیاہ رات کا سفر اور کرنا تھا۔ وہ رات قیامت کی رات تھی۔ زندگی بڑی بے رحم ہوتی ہے۔ پل بھر میں انسان، مٹی اور

جنازہ کہلانے لگتا ہے۔اس رات کی بھی صبح ہوئی اور پھر ہزاروں کاندھوں پہ قدم قدم چلتے بی بی اپنے ہمیشہ کے کچی مٹی کے گھر چلی گئی تھیں کہ اس گھر سے خدا کے علاوہ انہیں کوئی نہیں نکال سکتا تھا۔روشنی کا ایک نکتہ تھا جو جاتے جاتے دوسروں میں سما گیا تھا۔انہیں یٰسین بھائی کے گھر کے پاس کے قبرستان میں سپردخاک کردیا گیا۔

کچے ٹوٹے پھوٹے، برسوں سے بند پڑے، جھاڑ جھنکاڑ سے پُر مکان کو آج اس نے فروخت کر دیا تھا۔بی بی اور بابو جی کی یہ آخری نشانی تھی۔یہ وہی کچا مکان تھا۔جس کی اینٹ بابو جی تھے تو بی بی مسالہ تھیں۔دونوں کے خون پسینے سے تیار مکان آج پانچ لاکھ کے عوض بک گیا تھا۔گاؤں سے مکان کو آخری بار دیکھ کر جب اس کی گاڑی نکل رہی تھی تو سڑک کنارے اپنے کھیت میں کام کرتی شیلا تائی کی آواز پر اس نے ڈرائیور سے گاڑی روکنے کو کہا۔گاڑی سے اتر کر وہ تائی کے پاس پہنچا۔ارشد بھی پیچھے پیچھے ہولیا۔

''نمستے تائی۔۔۔''

''جیتے رہو بیٹے۔۔۔بھگوان توئے سدا خوس رکھے۔۔۔''

انہوں نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔

''بھیا۔۔۔سنو ہے تینے نے گھر بیک دیو۔۔۔''

وہ سر جھکائے کھڑا رہا۔اس کے اندر ہوں ہاں کرنے کی بھی ہمت نہ تھی۔مانو قتل کرتے پکڑا گیا ہو۔

''بیٹا۔۔۔تیری ماں تو کئی سال پہلے مٹی ہوگئی تھی۔پر آج وا کی آتما بھی گئی۔۔۔''

''ایک بات کوہں۔۔۔بیٹا۔۔۔تم گام آتے رہیو۔۔۔بی بی نہ سئی۔۔۔ہم تو ایں۔۔۔''

اسے ایسا لگا گویا کھیت کی مٹی میں کھڑی تائی بی بی بن گئی ہے اور کہہ رہی ہے بھیا۔۔ کچے مٹی کے مکان اندر سے بہت پختہ ہوتے ہیں اور گاؤں کے سبھی گھر ایک سے ہوتے ہیں۔

'' بی بی۔۔۔''

کہیں سے آواز آئی۔مگر یہ اس کا واہمہ تھا۔حقیقت میں اس کے بیٹے نے آواز لگائی تھی۔

''بابا۔۔۔''

'' چلیں دیر ہورہی ہے۔یہاں تو ہر طرف دھول ہی دھول اڑ رہی ہے۔ ''

ارشد ناگواری سے اپنے برانڈیڈ کپڑوں سے مٹی جھاڑ رہا تھا ۔ادھر منیرہ گاڑی سے ہاتھ نکالے آنے کا اشارہ کر رہی تھی۔تیز پچھوا ہوا، کھیتوں میں مٹی سے کھیل رہی تھی۔گردوغبار میں بی بی کا چہرہ کہیں گم ہوگیا تھا۔

رشتۂ جاں

ڈاکٹر عشرت بیتاب

دفتر کے کاموں میں آج کچھ زیادہ ہی مصروف رہا۔ فراغت پاتے ہی موبائیل اٹھایا تو دیکھا کہ ایک مس کال ہے۔ میری عادت ہے کہ مس کال کا کال بیک کرتا۔ اس طرف سے ایک کھنکتی ہوئی نسوائی آواز ابھری۔

''ہیلو' آپ ثروت صاحب ہیں''

''جی، بول رہا ہوں......لیکن محترمہ Hello نہ کہیے۔ ہیلو کا مطلب Go to hell۔''

''او، سوری (Sorry)'' اس نے فوراً معذرت چاہی۔ تو میں نے گفتگو کو طول دیتے ہوئے کہا۔

''ھاں تو کہیے، آپ کون ؟''

''میں آپ کی فائن ثریا ''

''کون ثریا، میں آپ کو پہچانا نہیں''

''آپ پہچانیں گے کیسے، میں کبھی آپ سے ملی جو نہیں''

''پھر، تو مجھ سے کیا کام ہے ؟'' میں مطلب پر اتر آیا

''آپ سے ملنا چاہتی ہوں۔ آپ کی کہانی 'دستک'، 'رومانی ادب' کے تازہ شمارے میں پڑھنے کا اتفاق ہوا۔ کہانی بڑی دلچسپ ہے۔ کہانی پڑھ کر آپ سے ملنے کی خواہش جاگ اٹھی۔ کہانی بڑی اچھی ہے۔ رومان ہی رومان......لیکن آپ کی ہیروئن آپ کی دسترس سے دور کیوں رہی۔ اس طرح کے ڈھیر سارے سوالات ذہن میں کچوکے مار رہے ہیں۔''

''ٹھیک ہے میرا پتہ نوٹ کرلیں، میسج (Message) کیئے دیتا ہوں۔ ملاقات پر سارے وسوسوں کا جواب مل جائے گا۔''

''آپ گھر پر آنے کا کیوں اصرار کر رہے ہیں۔ گھر پر نہیں کسی ہوٹل یا ریسٹورانٹ میں ملتے ہیں۔ تنہائی میں خوب خوب اور جم کر باتیں کروں گی۔''

''نہیں محترمہ، یہ ممکن نہیں، بہتر ہوتا آپ میرے گھر آجاتیں۔ یہاں گھر کے سبھی لوگوں سے ملاقات بات بھی ہوجاتی۔''

''وہاں میری ملاقات پر آپ کی رفیق سفر کو اعتراض نا ہوگا''

''نہیں، بالکل نہیں !وہ بہت کھلے دل ودماغ کی ملکہ ہے''

''لیکن ! کیا ہی اچھا ہوتا، آپ 'ہوٹل ارسلان' آجاتے۔ دوپہر کا کھانا ساتھ میں لیتے''

''کیوں ؟ دوپہر کا کھانا، آپ میرے گھر بھی کھا سکتی ہیں''

''جناب ! بیوی سے کچھ زیادہ ہی ڈرتے ہیں۔ کہیں محترمہ، بہت خوبصورت تو نہیں''

''بیشک، وہ حسین وجمیل ہے میرے خیال سے کسی حور پری سے کم نہیں''

''مگر میں تو تنہائی میں آپ سے ڈھیر ساری باتیں کرنا چاہتی ہوں ۔ وہ ساری باتیں جو تیسرے کی موجودگی میں ممکن نہیں''

''آپ خواہ مخواہ میرا وقت برباد کر رہی ہیں۔ اجازت دیجئے، خدا حافظ''

میں موبائیل آف کر کے دفتری کاموں میں ایکبار پھر مصروف ہو گیا۔ ٹفن سے قبل سارا کام مکمل کر لینا چاہتا تھا لیکن تھوڑے ہی وقفے کے بعد ٹفن کا آلارم بج گیا۔ تو میں نے کام کو ادھورا ہی چھوڑ کر گھر کا رخ کیا۔ میں ہمیشہ دوپہر کا لنچ گھر پر ہی لیتا۔ بچے بھی اسوقت تک اسکول سے آجاتے۔ سبھی اکھٹے کھاتے۔

گھر پہنچا تو کھانے کی میز پر رفیق حیات میری منتظر تھی۔ خادمہ میز پر ڈش سجا رہی تھی۔ میں سوچ میں پڑ گیا۔ اچانک اتنا شاندار اہتمام۔ مجھ سے رہا نہ گیا اور پوچھ بیٹھا۔

''آج اتنا پر لطف ڈش کا اہتمام، خیر تو ہے، کہیں کوئی خاص مہمان کی آمد تو نہیں''

''جی ہاں ! آپ کی مہمان خاص ثریا آئی ہے نا۔''

''کون ثریا......؟ میں بیگم سے نظریں چرا کر ادھر اُدھر دیکھنے لگا۔''

''وہی ثریا...... جو آپ کو لذیز کھانے کے لئے 'ارسلان' بلا رہی تھی'' بیگم ویل چیئر پر بیٹھی مسکرا کر اپنی خوش دلی کا مظاہرہ کر رہی تھی۔

''کہاں ہے وہ؟'' میری متلاشی نگاہیں اسے تلاش کر رہی تھیں۔

''آپ کے سامنے بیٹھی ہوں'' ایک آواز ابھری اور پھر موبائیل کا رینگ ٹون بج اٹھا۔

موبائیل کی آواز جب میری سماعت سے ٹکرائی تو میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔

''کیوں دوپہر کا کھانا، آپ میرے گھر بھی کھا سکتی ہیں''

''جناب ! بیوی سے کچھ زیادہ ہی ڈرتے ہیں۔ کہیں محترمہ بہت خوبصورت تو نہیں''

پھر محفل میں قہقہوں کی بارش تھی۔ ویل چیئر پر بیٹھی بیگم مسکرا رہی تھی اور خادمہ اپنا موبائیل فون آف کر کے اپنی کمر میں اڑوس رہی تھی۔

سفید جنگ

ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری

''یہ کس کی لاش پیڑ پر لٹک رہی ہے....؟''

وہ حیران ہوکر سوچنے لگا۔اس ویرانے میں یہ لاش...!یہ کس کی ہوسکتی ہے....!اب میں کیا کروں؟خیر ابھی میں لاش کے اتنے قریب نہیں پہنچا ہوں کہ اسے پہچان سکوں۔کیا لاش کو نظر انداز کر کے چپ چاپ یہاں سے چلا جاؤں یا پولیس کو اطلاع دوں۔اوہ...میں بھی کیا الٹا سیدھا سوچنے لگا' بھلا اس ویرانے میں پولیس کا کیا کام۔ویسے بھی اب تو پولیس کا کام زندوں کو لاشیں بنانا ہی رہ گیا ہے اور اگر میں نے پولیس والوں کے سامنے ایک لاش کا ذکر چھیڑا تو وہ الٹا میرا مذاق اڑائیں گے اور میری دماغی حالت پر شک کریں گے کہ اس دور میں لاش کے متعلق پوچھ تاچھ...!لیکن یہ تو ایک انسانی جان کے زیاں کا مسئلہ ہے۔ہر چیز کا بدل ہوسکتا ہے لیکن انسان....؟خیر اب اگر پولیس نے کاروائی شروع بھی کی تو بھی مجھے ہی تفتیش سے گزرنا پڑے گا کہ لاش کس کی ہے' آپ کا لاش سے تعلق' یہ ہمدردی کس لئے' کس نے پھانسی دے دی وغیرہ وغیرہ۔ایک سوال تو قابل غور ہے کہ کیا اس انسان کو کسی نے پھانسی پر لٹکایا ہے یا یہ خود اپنے آپ کو پھانسی دینے پر مجبور ہوا...؟مگر میں یہ سب کیوں سوچ رہا ہوں۔میں تو خود اتنا پریشاں ہوں کہ اپنے مسائل سے بھی نپٹ نہیں سکتا۔لیکن یہ لاش پیڑ سے نیچے کیوں آرہی ہے۔ارے یہ تو اب میری ہی جانب بڑھ رہی ہے۔لاش کو اپنی طرف بڑھتے ہوئے وہ خوفزدہ ہوکر بھاگنے لگا۔اس کی رفتار جتنی تیز ہورہی تھی' لاش کی رفتار بھی اتنی ہی بڑھ رہی تھی۔سانس پھولنے کے ساتھ ساتھ اس کا گلہ بھی خشک ہونے لگا اور ذہن میں انتشار کا آتش فشاں پکنے لگا۔پیاس کی شدت اسے نیلی جھیل کے کنارے تک لے آئی۔

اس کا وجود کرب کی چکی کے دو پاٹوں میں پھنس چکا تھا۔وہ اکثر خواب میں سفید ہاتھیوں اور ابابیلوں کی ہنگامہ آرائی دیکھ کر لرز اٹھتا۔اس کا دل اطمینان سے خالی اور ذہن انتشار کا جنگل بن چکا تھا۔وہ اکثر سوچتا رہتا کہ دل سے تسکین کی مٹھاس کون نچوڑ کرلے گیا اور دماغ میں انتشار کا جنگل کہاں سے امنڈ کر آیا۔تناؤ کا دورہ اس پر اکثر نیند کے دوران پڑتا' اس کی صرف آنکھیں بند ہوتیں لیکن دماغ بیدار رہتا اور جس رات وہ ارادہ کرتا کہ آج وہ کسی بھی مسئلے پر بغیر سوچے سونے کی کوشش کرے گا تاکہ دماغ کو راحت دے کر سکون کی نیند سوئے تو اس رات وہ اور زیادہ تناؤ کی زد پر رہتا۔وہ دنیا کی بدلتی صورتحال سے باخبر تھا۔کبھی کبھی اس کا دل گھبراہٹ کا شکار ہوجاتا لیکن وہ یہ

سوچ کر منفی کو مثبت بنا دیتا کہ وہ انسان ہے اور انسان بن کر ہی جینا چاہتا ہے اور دوسرے لوگوں کو بھی اطمینان کی زندگی گزارتے دیکھنا چاہتا ہے۔وہ انٹرنیشنل ادارے کا ایک سینئر آفیسر تھا۔ یہ ادارہ دنیا میں امن وامان بحال رکھنے کے لئے بنایا گیا تھا۔دنیا میں جہاں کہیں پر بھی بدامنی کا ماحول پھیل جاتا تو اس ادارے کی ذمہ داری تھی کہ وہ بغیر کسی جانب داری کے امن کو بحال کرنے میں اپنا رول ادا کرے۔وہ جب دفتر میں پہنچا تو حسب معمول دوسرے لوگوں کے ساتھ ہائی ہیلو کرتے ہوئے اپنے چیمبر کی طرف بڑھتا رہا۔علیک سلیک کرتے ہوئے اسے دفتر کا ماحول کچھ بدلا بدلا سا محسوس ہوا۔اس دفتر میں دنیا کے کئی ممالک کے لوگ تعینات تھے۔یہ لوگ ایک ایسے ادارے سے تعلق رکھتے تھے جہاں پر کسی قسم کی اونچ نیچ یا بھید بھاؤ کی گنجائش تک نہ تھی۔ادارے کا ایک ہی مشن تھا اور وہ تھا مشن انسانیت۔اس نے جلد ہی منفی خیال کو ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے چیمبر میں پہنچ کر ستانے لگا۔چند لمحوں کے بعد اس نے سسٹم آن کیا اور ٹیبل پر رکھے گلاس کو ہاتھ میں اٹھایا لیکن گلاس خالی دیکھ کر بیل بجائی۔بیل کی آوز سنتے ہی چپراسی یس سر کہتے ہوئے حاضر ہوا۔اس نے جب گلاس کی طرف اشارہ کیا تو وہ سوری کہہ کر پانی بھرا گلاس لے آیا۔پانی کے چند گھونٹ حلق میں اتراتے ہوئے وہ سوچنے لگا کہ آج پہلی بار چپراسی نے غفلت برتی ہے۔سسٹم ریفرش کرنے کے بعد جب کانفیڈینشل سیکشن پر کلک کیا تو اس نے پاس ورڈ طلب کیا۔پاس ورڈ لگا کر لاگ اِن پر کلک کرنے کے ساتھ ہی رانگ پاس ورڈ کا سگنل دکھائی دیا۔دو تین دفعہ پاس ورڈ دے کر جب اسکرین پر ''ثابت کرو کہ تم روبوٹ نہیں ہو'' کی وارننگ دکھائی دی اور ساتھ ہی کنٹرول روم سے رابطہ کرنے کی ہدایت ملی تو اس نے فون پر متعلقہ اتھارٹی سے رابطہ کیا۔وہاں سے کچھ ناگزیر وجوہات کی بنا پر پاس ورڈ تبدیل کرنے کی ہتک آمیز بات سن کر اس کے ہوش اڑ گئے۔وہ سوچنے لگا کہ اتنے برسوں تک اس ادارے میں فرض شناسی کا یہ صلہ کہ مجھ کو بھی شک کے دائرے میں لایا گیا۔اس نے جب دوبارہ رابطہ کرنے کی کوشش کی تو کوئی مثبت ریسپانس نہ پا کر وہ چیمبر سے باہر نکل گیا۔اس تشویش ناک حالت میں اسے یہی بہتر لگا کہ وہ گھر کی جانب چلا جائے۔اس نے دفتر کے سارے لوگوں پر ایک نظر دوڑائی۔اسے محسوس ہوا کہ جیسے یہ سب اجنبی چہرے ہیں' جو اسے جانتے تک نہیں۔تناؤ کے نشیب وفراز سے گزرتے ہوئے گھر پہنچ کر اس نے بیوی سے کافی بنانے کے لئے کہا۔اس نے کافی بنا کر کپ ٹیبل پر رکھتے ہوئے پوچھا کہ آج آپ جلدی کیوں لوٹ آئے۔اس نے کافی پینے کے بعد صوفے سے اٹھتے ہوئے کہا کہ طبیعت کچھ ٹھیک نہیں ہے' میں بیڈروم میں آرام کرنے کے لئے جارہا ہوں۔رات کا کھانا کھانے کے دوران وہ اور زیادہ پریشاں ہوگیا جب اس کی بارہ سالہ بیٹی نے کہا کہ اسے آج اسکول میں کئی دفعہ کلاس میٹس نے طنز کرکے کر

رلا دیا۔وہ کچھ جواب دیتا کہ بیچ میں بیوی نے بھی یہ کہہ کر تشویش کا اظہار کیا کہ اسے بھی مارکیٹ میں شاپنگ کے دوران کئی مرتبہ بے رخی کا سامنا کرنا پڑا اور اوپر سے میڈیا بھی خوف وہراس کا ماحول پھیلا رہا ہے۔آفس میں ہتک آمیز سلوک، بیوی کی تشویش اور بیٹی کی نفسیاتی حالت دیکھ کر وہ گہری سوچ میں ڈوب گیا کہ زہریلے ماحول کے اثرات ہر کسی کی نفسیات پر اثر انداز ہورہے ہیں۔لیکن وہ یہ سمجھ نہیں پارہا تھا کہ اچانک یہ سب کیسے ہوا اور ایک غیر جانبدار انسان ہونے کے باوجود انہیں کیوں ایسے حالات سے گزرنا پڑ رہا ہے..؟

اس نے جونہی جھیل کے پانی سے پیاس بجانے کی کوشش کی تو تب ہی وہ پانی میں لاش کا عکس دیکھ کر حیران ہوا۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر رہا کہ پانی میں لاش کا عکس کیسے آگیا۔خوف کے مارے اس کا دل بیٹھنے لگا۔جب وہ ہمت جٹا کر اٹھنے کی کوشش کرنے لگا تو لاش نے اسے اپنے قابو میں لیکر کس کے دبوچ لیا۔اس نے لاش سے خود کو چھڑوانے کی بہت کوشش کی لیکن تھک ہار کر وہ بے بس ہوکر زمین پر ڈھیر ہوگیا۔لاش نے اب اپنا پھندا اس کی گردن میں ڈال دیا اور اسے گھسیٹتے ہوئے اسی پیڑ تک لے گئی جس پر وہ خود لٹکی ہوئی تھی۔وہ لاش سے کچھ پوچھنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز حلق سے باہر نہیں آرہی تھی۔اسے اب یقین ہوگیا کہ لاش اسے پیڑ پر لٹکائے گی اور وہ چند ہی لمحوں کے اندر مرجائے گا۔

سفید ہاتھیوں کے ٹھکانوں کو زمین بوس کر دیا گیا تھا۔ماحول میں خوف ودہشت کی ہوائیں رقص کر رہی تھیں۔ہر طرف افراتفری کا عالم تھا۔شاطر لومڑیوں نے سفید ہاتھیوں کے ٹھکانوں کو مٹانے کی سازش ابابیلوں کے سر تھوپ دی اور سفید سلطنت کے ابرہہ کے اندر ابابیلوں سے بدلہ لینے کی سونامی جوش مارنے لگی۔کالے ناگ، بندر اور گرگٹ بھی سفید ہاتھیوں کے ہمنوا بن گئے اور ابابیلوں کے گھونسلے سفید سونامی کی زد پر آگئے۔

اچانک لاش نے اس کو پیڑ کے نیچے چھوڑ کر پھندا اپنی گردن میں ڈال دیا اور پیڑ پر دوبارہ لٹک گئی۔وہ یہ ماجرا دیکھ کر حیران ہوا۔حیرانی کے عالم میں ہی اسے لگا کہ سفید ہاتھیوں کی سونڈ سے نکلنے والے شعلے ماحول کو آتش زدہ بنا رہے ہیں اور فضاء میں پرواز کرتی ابابیلیں کنکروں کی بارش سے تباہی مچا رہی ہیں۔رفتہ رفتہ پیڑ کی ٹہنیاں بھی شعلوں کی زد میں آرہی ہیں اور لومڑیاں، بندر، ناگ اور گرگٹ بھی کنکروں کا نشانہ بن رہے ہیں۔وہ یہ آتش انگیز صورتحال دیکھ کر سوچنے لگا کہ اس سفید وسبز جنگ کے شعلوں کو کسی نہ کسی طرح ٹھنڈا کرنا ہی پڑے گا اور وہ پانی پانی چلاتے ہوئے نیلی جھیل کی طرف دوبارہ چل پڑا۔جھیل کے کنارے پہنچ کر یہ خوش نما نظارہ دیکھ کر اس کی آنکھیں خیرہ ہوئیں کہ نیلی جھیل کا شفاف پانی طلوع آفتاب کی سنہری کرنوں سے چمک اٹھا ہے۔

چوٹ،نوٹ کی

حنیف سیّد

Mob...No..09319529720

عروسِ فطرت ; بھر پور جوانی کا جام پیے ،سولہ سنگار کیے ،سیکڑوں ارمان لیے ۔چاندی کی ڈولی میں سوار، لیےانکھیوں میں پیار،اپنے سجنا کے دوار۔ ہولے ہولے جارہی تھی۔اُس کے خوابوں کاشہزادہ چاند؛ابلقِ ایام کی لگامیں کسے،ستاروں کے درمیاں بسے، کہکشاں نمارastے پراپنی منزل کی جانب گامزن تھا،اچانک اسپ ایام لڑکھڑایا، باگیں چھوٹیں،شہزادہ منہ کے بل،اور روح پرواز۔ پھرتو عروس فطرت کی جوانی کے ہاتھوں سے جام چھوٹے،سارے خواب ٹوٹے،ارمان روٹھے۔اور پھر جیسے ساری دنیا کوروشنی سپلائی کرنے والاٹرانسفارمر ہی اُڑگیا ہو۔پھرتو ساری دنیا میں گھنگوراندھیرا۔رات ہی رات،کالی کالی،ایک دم سیاہ، چاروں طرف۔ایسے میں مَن دانا کے مطابق: اُن کے چہرے پر جیسے ہی گرماگرم پانی جیسی بدبودار دھار گری، وہ سوتے سے چونک کرلحاف اچھالتے ہوے اُٹھ بیٹھے۔دیکھا،تو دو کتے لپک کر کہرے کی دبیض چادر میں سما چکے تھے،ایک وہ، جواُن کے لحاف میں سویا ہوا تھا۔اوردوسرا وہ،جس کے پیشاب کی دھار سے اُن کی آنکھ کھلی تھی۔مَن دانا نے جلدی سے سر کے نیچے سے پیوندلگی چادر کھینچی،اپنے بھیگے اور بدبودار چہرے کوصاف کیا اور چادر، پیروں کی جانب پھینک کر پانی کی جستجو میں کھڑے ہوگئے۔پھراُن کواحساس ہوا کہ کچھ اور بھی کتے ادھرادھر سے کھسک رہے ہیں۔ جب اُن کو کہرے کی دھند میں کچھ دکھائی نہ دیا تو انھوں نے پاکٹ سے موبائل نکال کر ٹائم دیکھا، رات کے چار بج چکے تھے۔ پھرپیروں سےاپنے جوتے ٹٹولے،نہ ملےتو موبائل کی ٹارچ آن کر کے ادھراُدھر دیکھانہ ملنے پرافسوس کے ساتھ لمبی سرد سانس کھینچی اورآسمان کی جانب دیکھ کر، کچھ بدبدائے، پھرآنکھیں چار کر کے پانی کی ٹنکی کا دوبارہ جائزہ لیا؛ جواُن کے شمار سے پرے تھی، پھرسوئے ہوئے لوگوں کی لمبی لائن کا جائزہ لے کراپنی جگہ کے حذب ہوجانے کے اندیشے سے چپ چاپ اسی لحاف میں دبک کر ماضی میں غرق ہوگئے۔

مَن دانا سے میری ملاقات دوسال پیشتر عجیب طور سے ہوئی تھی۔مَیں اپنا موبائل ٹھیک کرانے خاور الکٹرانک پر گیا تھا؛وہاں اُن کے بیٹے نے میرا موبائل سرسرے طور پر دیکھنے کے بعد کاؤنٹر پر پڑے اخبار کا کونا پھاڑ

کر موبائل نمبر لکھ کر مجھے دیتے ہوئے کہا تھا: ''اس نمبر پر پہلے پتا کر لینا؛ تب آنا۔'' حالاں کہ ایک صاحب اور بھی جو میرے بعد آئے تھے، اپنا موبائل فوراً ٹھیک کروانے کی اَڑ لیے ڈٹے تھے۔ درخواست تو میری بھی فوراً ٹھیک کروانے کی لگی تھی، بوڑھا ہونے اور پانچ کلومیٹر دور سے آنے کے انکلوزر کے ساتھ۔ پر اس کو میرے ہی بڑھاپے کے پیپر ویٹ تلے داب دیا گیا تھا۔

بہ ہر حال تقریباً پندرہ روز بعد فون لگایا، تو مَن دانا نے اُٹھایا۔ میرا موبائل تو کیا ہی ٹھیک ہوا، مگر وہ ایک اچھے شخص سے ملاقات کے بہانے آدھمکے، جون کی چلچلاتی دھوپ میں۔ بات چیت کے درمیاں میں نے موبائل کے بارے میں کئی بار دریافت بھی کیا، لیکن وہ کسی نہ کسی بات کو لے کر ٹال گئے، اور جب میں زیادہ پیچھے پڑا تو انھوں نے یہ کہہ کر بات ختم کر دی کہ میں بیٹے کی دکانداری میں دخل نہیں دیتا۔ بہ ہر حال میں جب موبائل لینے دکان پہنچا، تو اُن کے بیٹے نے دو سو روپے لے کر موبائل مجھے سونپ دیا، اور جب میں نے چیک کیا تو ویسا ہی تھا، یعنی کہ جوں کا توں۔ شکایت کی تو جواب ملا: چارج ہوگا تب ہی تو چلے گا، نا....؟ بہ ہر حال شک اور خفّت کی ملی جلی سلوٹیں ماتھے پر جمائے گھر آ گیا اور جب چارج کرنے پر بھی نہ چلا، تو پھر پہنچا۔ صاحب زادے بولے: ''چھوڑ جاؤ....! دیکھ لوں گا۔'' پھر تو ایسا دیکھا انھوں نے کہ مجھے سات پشتیں دکھائی دے گئیں اُن کی۔ آخر ایک دن انھوں نے یہ کہتے ہوئے موبائل پھر میرے سپرد کر دیا کہ اِسے لیے جاؤ....! کسی روز دہلی سے پارٹ لا کر ڈال دوں گا۔ ریپئیرنگ کے دو سو روپے، وہ جو مجھ سے لے چکے تھے وہ، نہ انھوں نے دیے، اور نہ ہی میں نے خیالتاً واپس مانگنے کی ہمت کی۔ بات چوں کہ خاص اہم نہ تھی، لہٰذا میں نے مَن دانا سے ذکر کرنا بھی مناسب نہ سمجھا۔ ویسے بھی وہ بیٹے کی دکانداری میں دخل نہ دینے کا اعلان کر کے اپنا دامن چھڑا چکے تھے۔ ہاں یہ یقین ہے کہ وہ ہر بار کی رپورٹ سے پوری طرح واقف تھے۔ حالاں کہ میں نے کبھی اس گندگی میں کوئی اینٹ اس لیے بھی نہ اچھالی کہ میں اپنے کچھ زخموں کے مرہم بن جانے کی توقع سے اپنی پریشانیاں کا رونا ان کے روبہ رو اس امید سے روتا رہا کہ شاید کبھی کوئی ایسا راستہ نکل آئے، جس سے میری بے کاری دور ہو سکے۔ ایک دن میں نے ہمت کر کے اپنے بے روزگار ہونے کی بات کہہ ہی ڈالی، اُن سے۔ جس کے لیے وہ فوراً اپنی ایک دکان، اِس شرط پر دینے کو تیار ہو گئے کہ میں اُن کی دکان بنوا کر اس میں کوئی کام ڈال لوں۔ چوں کہ میں اپنے موبائل کی ریپئیرنگ کے معاملے میں ان کی خصلت سے دو چار ہو چکا تھا، لہٰذا میں نے اپنی صحت ٹھیک نہ ہونے کا بہانہ لے کر دکان بنوا کر کوئی کام کرنے والا راستہ کاٹ لیا۔ لیکن وہ پیچھے پڑ گئے۔ بہ ہر حال میں اِس شرط پر تیار ہو گیا کہ دکان وہ خود بنوائیں؛ خود موبائل لائیں؛ میں ان

کے بیٹے کے ساتھ بیٹھ جاؤں گا۔وہ میری اِس شرط پر راضی ہو گئے ۔اور جب تین ماہ کے قریب بیٹھنے پر بھی مجھے کچھ نہ ملا ،تو میں بنا برتن کھڑکائے ،اپنی بیماری کا بہانہ لے کر بیٹھ رہا۔

من دانا کی خصلت میں تھا کہ وہ دوسروں کے پٹاروں میں سانپ بچھو دکھا کر ،اپنا الّو سیدھا کرنے کے ارادے سے دوسروں کی کٹی پتنگ کے گرد اپنی پتنگ منڈراتے لے جاتے اور دوسرے کی کٹی پتنگ کو اپنی پتنگ میں پھانس کر آہستہ آہستہ کھینچ لاتے ۔

میری بیٹیوں کے داخلے ؛ انھوں نے ہی کروائے تھے ،ہم درد بن کر۔لیکن بھاری ڈونیشن کے ساتھ۔یہ پتا مجھے بعد میں لگا کہ میں اُن کے ذریعے داخلے نہ کرواکرتا،خود کوشش کر،تو بہت کم میں نمٹ جاتا۔

ایک باراُن کی بہو کا پرس،تھری وہیلر میں رہ گیا،مَن دانا کی ایک کال پر، پرس گھر آ گیا۔لیکن جب چوبیس ہزار روپے کے ساتھ میری اٹیچی تھری وہیلر میں رہنے کی اطلاع ان کو ملی تو انھوں نے فون پر مجھ سے خود رابطہ کر کے اٹیچی کے متعلق تفصیلی معلومات تو کر لی ،لیکن میرے بار بار گڑ گڑانے پر بھی ٹس سے مس نہ ہوئے ،اور جب مَیں نے خود چھان بین کی ،تو اٹیچی تو مل گئی ،لیکن سامان کے متعلق پتا چلا کہ میرا کوئی دوست پہلے ہی رقم بٹا لایا۔اس زخم کی ٹیس اتنی تیز اُٹھی کہ مَیں نے تلخ کلامی کر ڈالی مَن دانا سے ،لیکن اُن کی شخصیت پانی پڑے بگین جیسی ہی رہی ۔ہاں دو چار روز کے لیے غائب ضرور ہو گئے ،مگر پھر آ دھمکے ۔اُن کا کہنا تھا کہ تعلقات ہموار رکھنے میں ہی عافیت ہے۔

مَن دانا محلے کے سب سے رئیس انسان تھے ،اُن کا کہنا تھا:''محلے میں سب سے زیادہ رقم میرے ہی پاس ہے۔لکھ پتی تو ہوں ہی ۔اور اب بخار چڑھا ہے؛ کروڑ پتی بننے کا۔''

''مگر کرو گے کیا:اتنی رقم...؟''ایک روز سردی میں کپکپاتے آئے تو مَیں نے پوچھ لیا۔

''میرے سامنے والے نے اپنی بیٹی کی شادی میں دیوروں اور جیٹھوں کو ٹو وہیلرز دی ہیں، جناب۔''

''اور آپ نندوئیوں کو بھی دیں گے...؟''

''جی ہاں...!وہ تو دوں گا؛مگر ٹو وہیلرز نہیں :فور وہیلرز۔''مَن دانا نے ؛سامنے چائے لیے کھڑی میری چھوٹی بیٹی کے؛ بجھے بجھے چہرے سے دیکھنے کے انداز کو بڑے غور سے دیکھ کر کہا،اور مَیں نے دیکھا؛ اُن کے دیکھنے کا انداز؛ بڑے ہی غور سے۔

''انکل آپ تو کانپ رہے ہیں،اتنی سردی میں، اِنر اور موزے وغیرہ تو پہن لیے ہوتے۔''میری بیٹی

نے کہتے ہوئے، شرما کر؛ میرے چہرے پر نظر ڈالتے ہوئے، مَن دانا پر چوٹ کی، اور میں خوشی سے اچھل پڑا۔

''ہے ہی کہاں سردی؛ اتنی...؟''مَن دانا نے اپنی کپکپی پر کنٹرول کرنے کی ناکام کوشش کی، جس کو دیکھ کر میری بیٹی مسکرادی اور میرا سینہ پھول گیا۔

مَن دانا؛ میرے یہاں تو آتے رہے، لیکن اپنے یہاں کبھی نہ بلایا مجھ کو، کبھی اتفاقاً اُن کی طرف گیا بھی۔ پہلی بات تو یہ کہ وہ گھر پر ہی نہ ہوتے، اور ہوتے بھی، تو کسی سے نہ ہونے کا کہلوادیتے، یا فون پر کہیں اور ہونے کی اطلاع دیتے، اور اگر کبھی دھوکے سے مل بھی جاتے تو وہ کبھی نماز کے بہانے، کبھی دودھ لینے کے بہانے، کبھی کسی کی دوا لینے کے بہانے، تو کبھی کچہری کی تاریخ کے بہانے، نکل جاتے۔ کسی بچّے کی سال گرہ میں ایک بار بلایا بھی، تو ایسا روکھا رویّہ اپنایا کہ بس یعنی کہ تقریباً ایک گھنٹہ تو باہر کھڑا رہا، پھر شرمائے سَئے اُن کے بیٹے نے بیٹھک کھول دی، مگر وہ خود منہ چھلائے رہے۔ آخر کو مَیں دوبارہ واپس آنے کا بہانہ بنا کر اس تنبیہ کے ساتھ اُٹھ آیا کہ اگر فون آ بھی گیا، پھر بھی نہ جاؤں گا۔ مجھے جیسا کہ یقین تھا کہ فون نہ آئے گا اور نہ ہی فون آیا۔ مجھے لگا کہ وہ خرچ بچانے کے باعث مہمان نوازی سے کتراتے تھے۔ حالاں کہ اُن کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی۔ پھر بھی رقم پیدا کرنے اور بچانے میں مہارت حاصل تھی اُن کو۔ یہاں تک کہ وہ کسی کو زیادہ تر اپنے موبائل سے کال نہ کرتے، اگر کرتے بھی، تو مس کال۔ پھر اُس کے فون آنے کا بے صبری سے انتظار کرتے۔ مہمان کو زیادہ دیر کبھی نہ بٹھاتے، اور جب بھی کسی کو چلتا کرنا ہوتا، وہ اپنا کوڈ بولتے، اندر سے کسی نہ کسی کے اشارے پر بجلی رانی کھسک لیتیں یا اندر سے آواز آتی: بازار نہیں جانا ہے کیا...؟''

اسکوٹر پر بھلے بیوی ہی کیوں نہ بیٹھی ہوتی اور کہیں بھی معمولی چڑھائی آجاتی، تو پٹرول زیادہ خرچ ہونے کے سبب فوراً اسکوٹر روک کر بیوی کو اتار دیتے۔ اور خود پیدل اسکوٹر چڑھاتے۔ راستہ گلی کسی شناسا کو دیکھ بھی لیتے، تو پٹرول کے خرچے کی وجہ سے راستہ کاٹ جاتے۔ کسی نے آوازیں دے کر روک بھی لیا، تو اسے بٹھا کر پہلے پٹرول پمپ پہنچتے، اس سے پٹرول بھرواتے، پھر اسکوٹر اسٹارٹ ہوتا، ورنہ نہیں۔ ایک بار میں نے کلر پرنٹر خریدنے کی خواہش ظاہر کی۔ بولے: میرا لے لو، نیا ہے، بالکل سے۔

''تمھارے پاس نیا...؟''

''ہاں ہاں بالکل ہی نیا، جہیز میں ملا تھا، ایک کو۔''

''ہے کتنے کا...؟''

’’ آپ بیس ہزار،صرف آپ کے لیے۔‘‘

’’دس کا تو نیا آتا ہے۔‘‘

’’ہے بھی تو اوریجنل،یعنی کہ اصلی پرزوں کا۔اب کہاں آتے ہیں ایسے...؟اب تو ایسے آتے ہیں کہ آج لاؤ،کل خراب۔‘‘

ایک بار میں ان کے ہی کسی کام سے ان کے ہم راہ کورٹ گیا۔وہ مجھے ایک وکیل کے پاس بٹھا کر کسی کام کے بہانے نکل لیے۔ان کے بعد میں بھی چہل قدمی کے لیے نکل پڑا،دیکھا تو دیوار کی آڑ میں آم چوس رہے تھے۔

بیٹے کی شادی کے ولیمے میں خصوصی مہمانوں کی ٹیبل پر اُن کے اپنے لوگ جمے رہے۔جب کوئی اہم مہمان آیا،تو اُن کے اشارے پر اُن کے اپنے لوگ جگہ دے کر خصوصی ڈشیں پیش کر دیتے۔اور عام لوگوں کے لیے آرڈنری کھانا ٹیبلوں پر سجا ہی تھا۔

بیٹی کو بھی معمولی طور سے بیاہ دیا،بنا جہیز کے۔

من دانا کی باتوں کو لے کر میرا اکثر من موٹاؤ ہو جاتا اور وہ ناراض ہو کر کھسک بھی لیتے،لیکن ان کا یہ مون برت زیادہ دنوں اس لیے نہ چلتا،کہ وہ سیاست اور قوم پرستی پر بحث کرنے کے عادی تھے جب تک اس ٹاپک پر جم کر بات نہ کر لیتے،اُن کی روح پیاسی رہتی،ان کا خیال تھا:’’ہمارے سیاسی،مذہبی رہبر،ہمیشہ لالچی رہے،جہاں بھی انھیں روٹی کا ٹکڑا دکھائی دیا،دم ہلنے لگی اُن کی۔جب بھی اِس ٹاپک پر بحث چھڑتی،اُن کا چہرہ لال ہو جاتا،ہونٹ،کپکپانے لگتے،آنکھیں چڑھ جاتیں۔جسم پسینہ پسینہ ہو جاتا۔مجھے ہی ڈر کر ٹاپک کلوز کرنا پڑتا۔

نوٹ بندی کے بعد بینک سے نوٹ بدلنے کی لائن میں لگے ہونے کی آج یہ اُن کی دوسری رات تھی، پہلے دن تو اتنی لمبی لائن تھی کہ دھکا مکی میں کئی بار لائن سے باہر جا گرے تھے وہ، باسٹھ سال کی عمر میں۔اور جب جیسے تیسے لائن کچھ آگے بڑھی تو رات کے آٹھ بج گئے ؛اور بینک بند ہو گئی۔حالات کے تحت دوسروں کی طرح رات وہیں گزارنے کی ٹھان کر گھر پر فون کر کے لحاف،گدّا اور کھانا منگوا کر کھایا پیا اور وہیں پڑ رہے،بے چارے۔حالاں کہ اُن کے پاس پیسے کی کمی نہ تھی،لیکن پانچ سو اور ہزار کے نوٹ تو بند ہو چکے تھے،بیوی بچوں میں کھنگالنے پر بھی سوسو کے نوٹوں کی گنتی چوبیس سے آگے نہ بڑھ سکی۔مگر ان میں ہونا کیا تھا،سب سے ضروری الٹرا ساؤنڈ تھا،پوتے کا۔اس کے علاوہ روزمرّا کے اخراجات۔جس کے شمار نے اُن کی نیند اُڑا رکھی تھی۔آج کا کھانا بنا نمک کا آیا تھا،گھر سے۔کیوں کہ کل شام کی افواہ نے بازار میں نمک کو گلہری کا پھول بنا دیا تھا۔یہی سب شمار کرتے ہوئے انھوں نے

رات، لائن میں ہی گزارنا مناسب سمجھ کر جیسے تیسے رات کاٹ لی تھی۔ کل کے دن، تو اُن کی قسمت پر پتھر ہی پڑ گئے تھے، لائن میں دن بھر کی دھکا مکی کے بعد جب ونڈو کے قریب پہنچے، تو ان کو لگا کہ شام ہوتے ہوتے ان کا نمبر آ جائے گا۔لیکن؛قسمت کا لکھا کہاں جاتا...؟ جب بیس بائس افراد اُن سے آگے تھے، تو بینک کنگال ہو گئی، یعنی نوٹ ختم ہو گئے۔ من دانا کے ہاتھ پانو پھول گئے۔ پھر بھی اُنھوں نے اپنے لڑکے کو فٹا فٹ فون کیے کہ کہیں نہ کہیں سے کچھ رقم کا انتظام کرے۔لیکن جہاں جائے بھوکا؛ وہیں پڑے سوکھا۔یعنی سب کو اپنی اپنی پڑی تھی۔نوٹوں کی کمی کے باعث سارے دھندے، ساری دکانیں بند تھیں؛ لہٰذا یہ دوسری رات بھی انھوں نے لائن میں ہی گزارنے کی ٹھان لی۔ حالاں کہ اِس عمر میں ایسے بدمزاج موسم سے ہاتھ ملانا اُن کے بس کا نہ تھا۔ پھر پچھلی رات کے موسم نے تو بڑے اطمینان سے ان کا مزاج پوچھ لیا تھا۔ حالاں کہ اُن کا دل چاہ رہا تھا کہ بستر وستر یہیں چھوڑ کر گھر بھاگ جائیں ۔لیکن آگے آنے والے وقت سے آنکھ ملانا؛ اُن جیسے سمجھ دار کے بس کا نہ تھا۔اِس لیے انھوں نے اپنا بدبودار چہرہ لیے وہیں رات گزار لینے میں ہی آفیت سمجھی۔اللہ کا کرنا یہ ہوا کہ اُن کی قسمت اچھی نکلی اور وہ تیسرے دن بینک سے نوٹ لے کر اپنا بوریا بستر ابغل میں دبا کر ننگے پانو میرے یہاں یہ سوچ کر آ دھمکے کہ اگلے روز رقم جمع کرنے کے لیے انھیں پھر لائن لگانا تھی، اسی لیے بستر اتنی دور اپنے گھر لے جانا مَن دانا کی دانائی سے پرے تھا۔اُن کی حالت دیکھ کر پہلے تو مَیں سمجھا: ڈاڑھی بڑھائے، بال الجھائے، بستر دبائے، کوئی پاگل گھُس آیا، غور سے دیکھنے پر مسکراہٹ نے میرے ہونٹوں پر دستک دینے کی جرات کی ہی تھی کہ اُن کی پیشانی کے بل نما ڈنڈے اور ابرو کے خنجر میرے پیچھے دوڑ پڑے، اور مَیں نے لپک کر اُن کے پیوند لگے لحاف کی جانب یہ کہتے ہوئے ہاتھ بڑھا دیا: ''لایئے مَن دانا بھائی..!لحاف مجھے دیجیے..!'' میرے کہنے پر اُنھوں نے لحاف کھڑے سے میرے ہاتھوں میں چھوڑ دیا۔ ان کے ننگے پیر دیکھ کر چاہتا تھا کہ اُن کے جوتوں کے متعلق سوال کروں، لیکن اُنھوں نے چپ رہنے کے اشارے کے ساتھ باتھ روم کا رُخ کیا۔لیکن جب مَیں نے انھیں بتایا: ''دو روز سے چھُٹّی رقم نہ ہونے کے باعث پانی والا، پانی نہ لایا۔ سامنے میدان کے نل سے پانی منگوا رہا ہوں، ذرا رُک جایئے۔'' یہ سنتے ہی ڈھڑام سے میرے صوفے پر گرے اور چائے کا مطالبہ کر ڈالا۔ جواب میں مَیں نے معذرت کر لی: ''چھُٹّی رقم نہ ہونے کے باعث دو روز سے چائے بنا دودھ کے چل رہی ہے۔'' تو اُن کا چہرہ اُتر گیا۔اُن کی حالت کو دیکھتے ہوئے مَیں نے ناریل کے چند ٹکڑوں کے سہارے اُن کو اِس لائق کر لیا کہ وہ کچھ احوال بیان کر سکیں۔ کچھ بتانے سے پیشتر انھوں نے دو ہزار کا ایک نوٹ نکال کر چینج کرنے کو کہا۔ اور مَیں نے جب اُن کا نوٹ تھام لیا تو اُن کے چہرے پر بشاشت

ناچنے لگی۔ اور جب مَیں نے اپنی جیب سے دو ہزار کا نوٹ نکال کر مسکراتے ہوئے چیلنج کر کے ان کی جانب بڑھایا تو ان کا مُنہ کھلے کا کھلا رہ گیا اور اُن کے چہرے کی بشاشت حیرت کے سمندر میں فنا ہوگئی، اور وہ میرے اس مذاق پر لڑنے مرنے کو تیار ہو گئے۔ پھر اُنھوں نے کچھ سوچ کر نارمل ہوتے ہوئے پوچھا: ''گھر تک پہنچوا سکتے ہو مجھ کو...؟''

''لڑکے کو فون کرو...! لے جائے۔''

لڑکے کو تو لائن میں لگا آیا ہوں۔

تو کسی اور کو فون کرو نا...!

''پیسے ہوں، موبائل میں تب نا۔''

''ڈلوا لو۔''

''چھٹے مانگے گا وہ، دوں گا کہاں سے..؟۔''

''رکشے تو چل رہے ہیں نا....؟''

''یہی پرابلم ہوگی نا...! وہاں بھی۔ میرے پاس تو دو ہزار کا نوٹ ہے۔''

اتنی مدد تو کر ہی دوں گا آپ کی۔''مَیں نے سو کا ایک نوٹ نکال کر اُن کی جانب بڑھاتے ہوئے کہا۔

''کیا اس سے زیادہ نہیں کر سکتے، مدد....؟'' اُنھوں نے نوٹ سنبھالتے ہوئے پوچھا۔

''گنجایش نہیں۔''مَیں نے کہا۔ اور منہ بنا کر اگلے روز آنے کا کہہ کر سرک لیے۔

اگلی شام نو بجے اُن کا لڑکا بستر لینے آ گیا، میرے دریافت کرنے پر اُس نے بتایا: ''پاپا تو صبح نو بجے ہی آ کر لائن میں لگ گئے تھے۔ لیکن اب بینک بند ہو چکا ہے سولہواں نمبر ہے، اس لیے آج مجھے پھر رکنا پڑے گا۔''

نوٹ بندی سے لوگوں کی زندگی اتھل پتھل ہوگئی تھی۔ رات کا ایک بجا تھا من دانا کی زندگی کی کہانی میرے ذہن میں فلمی پردے کی طرح چل رہی تھی۔

رات ایک بجے من دانا نے بھرائی آواز میں بسکتے ہوئے فون پر بتایا کہ بینک کی لائن میں رات ان کے بیٹے کی موت ہوگئی۔ اور میں نے فوراً بینک پہنچ کر لاش کو ان کے ہمراہ ان کے مکان تک پہنچوایا۔

لیکن مجھے حیرت ہے تو یہ کہ تدفین کے بعد من دانا نے جو میڈیا کو جو نیوز دی اس میں صاف طور سے لکھا ''بیٹے کی موت رات بینک کی لائن میں نہیں بلکہ مکان پر ہوئی۔

☆☆☆☆☆

قصّہ تمام

غیاث اکمل

ایوب اور روحی کی جوڑی عجیب نا مناسب سی لگتی تھی۔ایوب کی عمر زیادہ تو نہ تھی پر اس کے سر کے بال سفید ہو گئے تھے۔جس سے وہ اپنی عمر سے زیادہ بڑا نظر آتا تھا۔اس کے برعکس روحی نوخیز،کم عمر لگتی تھی۔وہ تیز طرّار اور بے باک بھی تھی۔۔۔کہتے ہیں کہ زمانے کی نگاہ اس پر ٹھہر جاتی تھی۔یہی زمانے کی ستم ظریفی کہئے کہ آناً فاناً میں اس کی شادی کر دی گئی۔

ہوا یہ تھا کہ شادی کی بات چیت کے دوران ایوب کی طرف سے کوئی فرمائش نہیں کی گئی تھی۔ ایوب کولیری کا امپلائی تھا۔آمدنی اچھی تھی۔۔۔لڑکی والوں کو اور کیا چاہئے وہ تیار ہو گئے اور شادی انجام پا گئی۔

ایوب کی زندگی میں جیسے بہار سی آ گئی۔وہ روحی کا خاص خیال رکھنے لگا۔پر بات بن نہیں پا رہی تھی۔ایک دن ڈیوٹی سے ایوب شام کو گھر واپس آیا اپنی سائکل آنگن میں دیوار کے سہارے لگا کر کمرے میں داخل ہوا تو روحی کو بستر پر لیٹے ہوئے دیکھ کر کہا۔۔۔اُٹھو جا کر چائے بناؤ۔دن بھر سوئی رہتی ہو۔یہ نہیں ہوا کہ شوہر کے آتے ہی جلدی سے چائے بنا کر لے آؤ۔۔۔دن بھر کا تھکا ماندہ آتا ہوں۔

دراصل ایوب کبھی کبھار مصنوعی غصّہ دکھا کر اپنی انا کی تسکین کرتا تھا۔اپنی مردانگی دکھاتا تھا۔کیونکہ اس کے ذہن و دماغ میں یہ بات گھر کر گئی تھی کہ اگر بیوی کو دبایا نہیں جائے،چھوٹ ہی چھوٹ دیدی جائے تو شوہر پر لعنت ملامت ہوتی ہے۔لوگ جورو کا غلام کہتے ہیں۔کوئی اسے بھی ایسا کہے؟منظور نہ تھا۔

دوسری طرف بلا وجہ ڈانٹ پھٹکار سن کر روحی تمک کر بولی۔۔۔میں بیوی نہیں نوکرانی ہوں۔۔۔۔میری تو قسمت ہی خراب ہے۔شادی کر کے میری زندگی جہنم بن کر رہ گئی۔کب سے سوئی ہوں؟ کیوں سوئی ہوں؟ یہ جاننا آپ نے ضروری نہیں سمجھا۔۔۔اس نے لہجہ بدلتے ہوئے کہا۔۔۔گھر کو گھر بنا دیا ہے میں نے ورنہ آپ کی کیا حالت تھی۔۔۔۔کوئی مجھ سے پوچھے۔

روحی سے طعنے سن کر ایوب تلملا کر رہ گیا۔لیکن کیوں سوئی ہوں؟ کا سوال سن کر اس نے کہا۔۔۔

اچھی خاصی دکھ رہی ہو۔ کھانے پینے کے علاوہ جو فرمائش کرتی ہو دیتا ہی ہوں ۔ پھر کیا ہوا؟

کھانے پینے کی کمی تو میرے گھر میں بھی نہیں تھی ۔ یہ دیکھا آپ نے کہ شادی سے پہلے آپ کی کیا حالت تھی ۔ نہ صحیح کھانا پینا تھا اور نہ پہننا اوڑھنا۔ کولیری میں کام نہیں کرتے تو ایک کوڑی کا آدمی نہیں رہتے ۔ ۔۔۔روحی بولتی ہوئی چائے بنانے چلی گئی۔

تھوڑی دیر کے لئے ایوب کو لگا کہ روحی بہت آگے بڑھ کر بول رہی ہے۔۔۔ کیوں نہ دو تھپڑ جڑ دیں لیکن وہ بس مسوس کر رہ گیا۔۔۔شاید اسے احساس ہو گیا تھا کہ سطحی انا کی خاطر بیجا رعب دکھانا بھی تو اچھا نہیں ہوتا ہے۔

ایسا یہ کوئی پہلی دفعہ نہیں ہوا تھا۔۔۔۔ بحث وتکرار تو اکثر ہوا کرتی تھی ۔

ایسا ہی وہ منحوس دن تھا۔۔۔ایوب بیوی سے لڑ جھگڑ کر بے دلی سے رات پالی ڈیوٹی پر گیا تھا۔صبح معلوم ہوا کہ کان میں پانی گھس گیا ہے۔رات پالی کے سبھی مزدور پھنس گئے ہیں۔

ایوب کے والد نے جو یہ خبر سنی تو فوراً جائے وقوع پر پہنچ گئے۔۔۔۔سائٹ پر ہنگامہ مچا ہوا تھا۔ چیخ و پکار، آہ و بکا کی دل ہلا دینے والی آوازیں آرہی تھیں۔۔۔کان کے چاروں طرف بھیڑ لگی ہوئی تھی۔ بھیڑ کو قابو میں کرنے کے لئے پولس بل بھی آگئی تھی۔ آفس کے سامنے میدان میں افسر لوگوں کی گاڑیاں کھڑی تھیں۔ دن پلاًّ کے مزدور بھی جمع ہو رہے تھے۔وہ آپس میں باتیں کر رہے تھے۔۔۔رات پلاًّ والے مزدور فیز میں پھنس گئے ہیں۔ کان میں پانی گھس گیا ہے۔ایک بھی آدمی نکل نہیں پایا ہے۔ابھی تو پانی بھرتا ہی جا رہا ہے۔مزدوروں کو جلدی نہیں نکالا گیا تو شاید ہی کوئی زندہ بچ سکے گا۔

ایوب کے والد حواس باختہ نظر گھما کر اِدھر اُدھر دیکھنے لگے۔۔۔کولیری کے کوارٹروں سے لوگ نکل کر ڈپو کے اردگرد جمع ہو گئے تھے۔کوئی پانچ چھ ہزار لوگ جمع تھے۔۔۔۔ پولس سب کو پیچھے ڈھکیل رہی تھی ۔ ریسکیو والے دوڑ رہے تھے۔افراتفری مچی تھی۔

آفس کے برامدے میں ایجنٹ صاحب ، انسپکٹر، سب انسپکٹر اور کولیری یونین کے نیتا آپس میں دھیرے دھیرے باتیں کر رہے تھے۔ درمیان میں آفس کا فون بج اُٹھتا اور ایجنٹ صاحب اندر جا کر باتیں کرتے اور پھر باہر آجاتے۔

چار پانچ گھنٹے مسلسل کھڑے رہنے کے بعد اگل بغل کے لوگ اپنے اپنے گھروں کو لوٹنے لگے۔ایوب

کے والد بھی بے حد مایوس گھر لوٹ گئے ۔گھر کے لوگوں کو انہوں نے یہ بری خبر سنائی ۔اور دعا کرنے کو کہا۔اللہ کرے کہ ایوب کسی اونچی جگہ پر چڑھ کر جان بچالے ۔ سنتے ہی گھر کے افراد سکتہ کے عالم میں آگئے ۔ایوب کی ماں اور روجی زار و قطار رونے لگیں ۔ایسی بے چینی میں ایوب کے والد گھر میں کیسے بیٹھ سکتے تھے؟ شام کو وہ پھر سائٹ پر گئے ۔۔۔شاید کان سے کسی کے نکلنے کی خبر ملے ۔

سائٹ پر ویسے ہی بھیڑ لگی تھی ۔مزدور آپس میں باتیں کر رہے تھے۔بھیّا پھنسے ہوئے مزدور زندہ کیا بچیں گے؟ پانی میں ہاتھ پاؤں کتنا ماریں گے۔۔۔سرنگ کی چھت تو ہم لوگوں نے دیکھا ہے۔۔۔زیادہ ہاتھ پاؤں ماریں گے تو چھت سے ٹکرا ٹکرا کر ان کا دم نکل جائے گا۔ارے وہ کوئی چھت تھوڑے ہی ہوتی ہے نوکیلی چٹانیں ہوتی ہیں۔تبھی کسی دوسرے نے کہا۔۔۔پانی نکالنے کا کام ابھی تک شروع نہیں ہوا ہے۔آفس جا کر بہت مشکل سے پتا چلایا ہے۔۔۔کوئی کچھ بتا ہی نہیں رہا ہے ۔ یہ تو میں ہوں کہ پتا چلا لیا۔

مزدور آپس میں انتہائی رازداری سے باتیں کر رہے تھے اور کان کے اندر پانی گھسنے کا بھید کھول رہے تھے ۔۔۔ارے یہ کوئی دو تین مہینہ پہلے پانی کی بوندیں جو گردن پر پڑیں تو رحیم چاچا نے اوورمین سے کہا تھا۔۔۔اوپر بند سیم ہے۔۔۔لگتا ہے کہ کسی گوف سے اس بند سیم میں پانی گھس گیا ہے۔اس کی جانچ کرائی جائے۔اگر پانی اس سیم میں آگیا ہے تو اُس سیم سے اِس سیم میں گھسنے پر بھیانک گھٹنا گھٹ سکتی ہے۔تبھی ایجنٹ صاحب نے سروے آفیسر کو بلا کر نقشہ پھیلا کر گھنٹوں بات کی تھی ۔سروے آفیسر کا صاف کہنا تھا اوپر سیم میں پانی نہیں بالو ہے۔۔۔پھر پانی کہاں سے گھسا؟ آج رحیم چاچا کی بات کتنی سچ نکلی۔اب کون اس بات کو یاد دلائے؟ کون سننے والا ہے؟ رحیم چاچا کو تیس برسوں کا تجربہ تھا۔لیکن اس روز رحیم چاچا کو ڈانٹ دیا گیا۔کیونکہ ایک جاہل مزدور سروے آفیسر کو کیسے چیلنج کر سکتا ہے۔یہی ایجنٹ جو اس سمئے منیجر تھا۔انہوں نے کہا تھا ہم نے گھاس کاٹ کر منیجری پاس نہیں کیا ہے۔۔۔یہیں پر کام ہوگا۔یہ ہمارا آرڈر ہے۔خوب بحث بحثی ہوئی تھی لیکن مزدور تو مزدور ہی ٹھہرے۔۔۔کیا کرتے۔۔۔کتنا چلّا چلّی کرتے۔آخر کام وہیں شروع ہوا اور آج نتیجہ سامنے ہے۔۔۔ارے ان لوگوں کو تو پھانسی پر لٹکا دینا چاہئے۔

کافی تگ و دو کے بعد ریسکیو آپریشن شروع ہو چکا تھا۔پانی نکالا جا رہا تھا۔چار پانچ دنوں کی انتھک کوششوں کے بعد پانی کم ہوا۔پانی کم ہوتے ہی فیز سے بدبو آنے لگی۔۔۔چند لاشیں پانی میں تیرتی نظر آنے لگیں۔سوپیروں کو لاش نکالنے کے لئے تیار کیا گیا۔۔۔گندھ سے سانس لینا دوبھر ہو رہا تھا۔سوپیر لاش پر پاؤڈر ڈالتے اور سانس روک کر جہاں ہاتھ لگاتے انگلی دھنس جاتی ۔تب کمر میں لگا بیلٹ کو پکڑ کر لاش کو کھینچنے لگے۔تب

کہیں بات بنی۔

لاش کا جسم سے گوشت گل گل کر گر رہا تھا۔ بس ٹھٹھری نما لاش کو اسٹیچر پر رکھا جا رہا تھا۔ اگر کچھ تھا تو کمر میں بندھا بیلٹ جس سے بیٹری بندھی تھی۔ اسی بیٹری کے نمبر سے لاشوں کی شناخت کی جا رہی تھی۔ بیٹری کے نمبر سے ایوب کی لاش کی بھی شناخت کی گئی۔

کمپنی نے لاشوں کو ان کے گھروں تک پہنچانے کے لئے امبولینس کو تیار کر رکھا تھا۔

لاش کو جونہی وارثین کو سونپنے کی بات ہوئی۔۔۔ مجمع میں کھسر پھسر ہونے لگیں۔۔۔ قبل کے کوئی ہنگامہ کھڑا ہو جائے۔۔۔ یونین کے نیتا سامنے آئے اور چلاّ چلاّ کر کہنے لگے۔۔۔ بھائیو!۔۔۔ آپ شانتی بنائے رکھیں۔۔۔ شہید مزدوروں کا ٹھیک ٹھیک معاوضہ دلایا جائے گا۔ ہم منجمنٹ کو چھوڑنے والے نہیں ہیں۔ ہم مزدور بھائیوں کے ساتھ ہیں۔ ابھی دُکھ کا سمئے ہے۔ پہلے ہمیں شہیدوں کے ڈپنڈنٹ، ان کے وارثین کو سروس، معاوضہ سمیت پی. ایف. اور دوسری رقم منجمنٹ تورنت دینے کا وعدہ کرے۔ تبھی لاش اٹھانے دیں گے۔

نیتا کی ہر بات پر انقلاب زندہ باد کے نعرے لگ رہے تھے۔

موقع کی نزاکت دیکھتے ہوئے فی الفور منجمنٹ کے افسروں نے سبھی مرنے والوں کو پانچ پانچ لاکھ روپے، باقی عمر کی تنخواہ کی رقم اور ڈپنڈنٹ کو نوکری دینے کا اعلان کر دیا۔ مہینہ بھر کے اندر معاملہ نپٹانے کا بھی وعدہ کیا گیا۔

بھیڑ شانت ہو گئی۔۔۔ لاشوں کو گھروں تک پہنچانے کا کام تیزی سے ہونے لگا۔ لاش کو سفید چادر میں لپیٹ کر امبولینس میں لاد کر لواحقین کو سونپی اور گھر پہنچائی جا رہی تھی۔

ایوب کی لاش بھی گھر پہنچ چکی تھی۔۔۔ دلدوز چیخ و پکار سن کر آس پاس اور محلے میں رہنے والے ہر فرقے کے لوگ دوڑے چلے آ رہے تھے۔ ایوب کے والد کو لوگ سنبھال رہے تھے۔ انہیں ڈھارس دے رہے تھے اور کہہ رہے تھے۔۔۔ شریعت میں بے انتہا آنسو بہانے پر ممانیت ہے اس سے مرحوم کی روح کو اذیت پہنچتی ہے۔۔۔ بالآخر میت کی تجہیز و تکفین ہوئی۔ جنازہ قبرستان کی جانب رواں ہوا۔ بیٹا کا جنازہ کاندھے پر اُٹھائے بوڑھے باپ کا درد آنکھوں سے ٹپک رہا تھا۔ قبرستان پہنچ کر نماز جنازہ ادا کی گئی اور میت قبر میں لٹا دی گئی۔

میت دفنانے کے بعد لوگ گھر لوٹ گئے۔ اس کے بعد ہفتوں تک گھر ماتم کدہ بنا رہا۔ ماحول رنج و غم میں ڈوبا رہا۔ ایوب مرحوم کے والد گھر میں گم صم پڑے رہے۔ تبھی کسی نے ان کے کان میں پھس پھسایا۔۔۔ منجمنٹ نے مرنے والوں کے لواحقین کو طلب کیا ہے۔ انہیں بلایا ہے۔ یہ بھی کہا جا رہا ہے کہ مزدور کی بیوہ کو چیک دیا جائے

گا اور جس کی شادی نہیں ہوئی ہے۔اس کے پتا کو چیک دیا جائے گا۔ایسے میں ایوب مرحوم کی بیوہ کو چیک ملے گا تو وہ مائکے جا کر دوسری شادی رچا لے گی۔اس لئے وقت رہتے منجمنٹ سے مل کر کچھ کرنا ہوگا۔جی۔ایم۔صاحب اچھے آدمی ہیں۔وہ معاملہ کو سمجھ سکتے ہیں۔۔۔کوئی راستہ نکال سکتے ہیں۔۔۔آپ نے محسوس کیا ہوگا۔۔۔منجمنٹ کی جانب سے معاوضے کی رقم کا اعلان ہوتے ہی مرحوم کے سسرال والوں کا آنا جانا کتنا تیز ہوگیا تھا۔پتہ نہیں وہ کیا منصوبہ بنا رہے ہوں۔۔۔اس لئے چہارم کرا کر بڑا کام یعنی چہلم کو بیسواں میں ہی کرا دیں۔۔۔اس کام کو منجمنٹ سے کروانے کیلئے لگنا بھڑنا ہوگا۔غم والم میں پڑے رہنے سے نہیں چلے گا۔

دوسرے ہی دن مرحوم کے والد نے خود کو سنبھالتے ہوئے جی.ایم صاحب سے مل کر اپنا دکھڑا بیان کیا۔ دُکھ درد سنایا کہ ایوب ہی میرا بڑا بیٹا تھا۔ذمہ داری اب بوڑھے باپ پر آ گئی ہے۔ابھی کوئی سال بھر پہلے تو شادی ہوئی تھی۔اس کا تو کوئی آل واولاد بھی نہیں ہے۔۔۔والد کی آواز میں درد کی آمیزش تھی۔

ساری باتیں سن کر جی.ایم.صاحب کو ان پر ترس آ گیا اور کہا۔۔۔آپ کے ساتھ انصاف ہوگا۔آپ ایوب کی بیوی کو ساتھ لائیں۔این.او.سی.پر دستخط لیں گے ورنہ اصولی طور پر حق اس کا ہی بنتا ہے۔سائن کے بعد ہی آدھی رقم کا چیک آپ کے نام اور آدھی رقم کا چیک اس کے نام بنا دوں گا۔

مرحوم کے والد نے بڑے صبر و تحمل سے چہارم و چہلم کی رسومات انجام دیئے۔

معاوضے کی رقم کی بات۔۔۔کیا ہوئی؟ سارے رنج و غم جیسے یکسر غائب ہوگئے۔۔۔بس چیک کیسے ہاتھ آ جائے اس کی فکر مرحوم کے والد اور روحی دونوں کو رہی۔اس درمیان مرحوم کے والد روحی کو سمجھاتے رہے۔۔۔بیٹی جو ہونا تھا وہ ہوگیا۔۔۔اللہ کی یہی مرضی تھی۔۔۔ساتھ چلو گی جی.ایم.صاحب چیک دینے کے پہلے کاغذات پر دستخط لیں گے۔۔۔سرکاری کام ہے۔۔۔میں ساتھ ساتھ رہوں گا۔

مرحوم کے سالے اور سسر کی دوڑ دھوپ تیز ہوگئی تھی۔ایک دن نہ جانے روحی کو اس کے والد اور بھائی نے کیا سمجھایا کہ وہ اپنے سسر سے کہنے لگی۔۔۔ابا۔۔۔میں اپنے شوہر کی رقم کسی کو لینے نہیں دوں گی۔اب میرا کون رہ گیا ہے۔شوہر کی کمی تو اب مجھے زندگی بھر رہے گی۔۔۔گھر کے کونے کونے سے مجھے ان کے وجود کی مہک آتی ہے۔

تبھی مرحوم کے والد نے کہا۔۔۔ہوش وحواس سے کام لو۔۔۔کسی کے کہنے سننے پر نہ جاؤ۔۔۔آج تم جو کہہ رہی ہو۔۔۔کل کیا ہوگا؟ یہ میں جانتا ہوں۔میں نے دنیا دیکھی ہے۔زندگی اتنی چھوٹی نہیں ہے کہ کوئی یونہی اکیلا گزار لے۔۔۔سال ڈیڑھ سال میں شادی کر لوگی۔۔۔اور یہ ضروری بھی ہے۔خسارے میں تو میں

رہوں گا۔ بڑا لڑکا تھا آرام کرنے کا وقت آیا تو اللہ نے اسے بلا لیا۔

سسر کی بات سنتے ہی روحی بپھر کر بولی۔۔۔ یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ۔۔۔ ابھی تو میرے شوہر کی قبر کی مٹی بھی خشک نہیں ہوئی ہے۔ اور آپ دوسری شادی کی بات کر رہے ہیں۔ میرا تو یہ سوچ کر دل بیٹھا جا رہا ہے۔۔۔ میں اس گھر سے کہاں جاؤں گی۔۔۔ میرے ابو آئے بھیّا آئے سب چلے گئے۔۔۔ میں کہاں گئی؟

روحی کی زبان قینچی طرح چلتے دیکھ کر مرحوم کے والد کے ذہن و دماغ میں وہ دن یاد آ گئے جب میاں بیوی میں چھوٹی چھوٹی باتوں پر تو تو میں میں ہوا کرتی تھی۔ آج اس کا یہ کہنا کہ گھر کے کونے کونے سے اس کی مہک آ رہی ہے۔۔۔ کتنا بڑا جھوٹ ہے۔ اب تو مصلحت سے کام لینا ہوگا۔ پیار و محبت دکھا کر کام لینا ہوگا۔ اور واقعی موقع پا کر مرحوم کے والد روحی کو لے کر جی۔ ایم۔ صاحب سے ملے۔ بڑے ہی راز داری سے روحی کا دستخط این۔ او۔ سی۔ پر لیا گیا۔ روحی جب بھی کوئی سوال کرتی۔ سسر کا جواب تھا۔۔۔ میں ساتھ ہوں کوئی بے انصافی نہیں ہونے دوں گا۔

چھ مہینے کے اندر سارا معاملہ طے ہو گیا۔ دو چیک بنے۔۔۔ آدھی رقم کا چیک مرحوم کے والد کے نام اور آدھی رقم کا چیک روحی کے نام کا بنا۔ کبھی کبھی روحی کو لگتا کہ اس کے ساتھ بے انصافی ہو رہی ہے۔۔۔ لیکن اکیلی جان وہ کر بھی کیا سکتی ہے۔۔۔ مینجمنٹ کے لوگ مرحوم کے والد کے طرفدار تھے۔۔۔ انہیں ان کے بڑھاپے کا خیال تھا۔

چیک ملتے ہی روحی کو اس کے والد اپنے گھر لے گئے۔ مہینہ۔۔۔ دو مہینے۔۔۔ تین مہینے۔ فون پر دونوں گھروں کا رابطہ قائم رہا۔ رفتہ رفتہ باتوں کا سلسلہ کم ہوتے ہوتے بالکل بند ہو گیا۔ وقت گذرتا رہا۔۔۔ اس درمیان مرحوم کے والد نے کچے مکان کو پختہ مکان میں بدل دیا۔ ایوب کی قبر کو پختہ کر دیا گیا۔ ایصال ثواب، نذر و نیاز کا سلسلہ چلا۔۔۔ پہلی برسی گذر گئی۔۔۔ دوسری برسی پر پروگرام بنا کہ مرحوم کی قبر پر چادر پوشی کی جائے۔ نیز قرآن خوانی، غریب و نادار، فقیر و مسکین کو کھانا کھلایا جائے گا۔

ایوب مرحوم کے سسرال والوں کو بھی پروگرام کی خبر دی گئی۔ لیکن پروگرام میں مرحوم کی سسرال سے کوئی نہیں آیا۔ مہینوں بعد ایوب مرحوم کے سسرال والوں نے مرحوم کے والد کو اطلاع کی کہ روحی کی شادی کر دی گئی ہے۔ اب وہ ایک بچے کی ماں بھی ہے۔ اور اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش ہے۔ روحی بھول چکی ہے کہ ایوب نام کا کوئی شخص بھی اس کی زندگی میں تھا۔

روحی کے والد دراصل یہ باور کرا رہے تھے کہ دنیائے بے ثبات میں وقت کی بے رحم تلوار نے پرانے رشتوں کو کاٹ ڈالا ہے۔ قصہ تمام ہو گیا ہے۔

غیر متوازن ارادے

امتیاز غدر

کاؤنٹر سے پتہ چلا کہ میری ٹرین ابھی ایک گھنٹہ پندرہ منٹ تاخیر سے چل رہی ہے۔آفس میں جب موبائل میں لوڈ ریلوے ایپ میں دیکھا تھا تو رائٹ ٹائم بتایا جارہا تھا۔وقت پر اسٹیشن پہنچ کر جب میں نے پھر موبائل کے ایپ چیک کیا تو پتہ چلا کہ ٹرین ابھی بھی آسنسول جنکشن میں ہی کھڑی ہے۔ میں مطمئن ہونے کے غرض سے اسٹیشن سے باہر مقیم ٹکٹ کے انکوائری کاؤنٹر پر چلا گیا۔ٹرین کو وہاں سے آنے میں 20-25 منٹ سے زیادہ وقت نہیں لگتا تھا۔ بیچ میں دو چھوٹے چھوٹے اسٹیشن سیتارام پور اور کلٹی میں ایک ایک منٹ کا اسٹاپج تھا۔اس کے بعد میرا اسٹیشن یعنی کمارڈوبی پڑتا تھا۔ یہ اسٹیشن کوئی خاص بڑا نہیں تھا۔ یہاں کچھ چنندہ ایکسپریسوں کے ٹھہراؤ کے علاوہ زیادہ تر لوکل پسنجر ٹرین ہی رکتی تھی۔اسٹیشن کے شمال۔جنوب میں دو چھوٹی چھوٹی ندیوں پر دو ہائیڈل بجلی بنانے کے لگے ہوئے تھے۔اس وجہ سے یہاں لوگوں کی آمدورفت لگی رہتی تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ ایک گھنٹہ کا وقت کہاں گذاروں۔ پلیٹ فارم پر ہی سیمنٹ کی لمبی لمبی کرسیوں پر بیٹھنا مجھے گوارہ نہیں تھا۔وہاں اکثر لوگ شانہ بہ شانہ ہو کر بیٹھتے اور کبھی کبھی کھلے منہ ہو کر کھانستے چھینکتے جو مجھے قطعی پسند نہیں تھا۔اس کے ساتھ ہی اسٹیشن کے چار چھ مستقل بھیکاریوں کو بھی جھیلنا آسان کام نہیں تھا۔وہ اسٹیشن کے مختلف حصوں میں بٹ کر باری باری سے ممکنہ مسافروں کے قریب آتے۔ممکنہ یعنی جس مسافر سے انھیں کچھ نہ کچھ ملنے کی امید ہوتی اسی کے قریب کھڑا ہوتے۔ ہرایرے غیرے افراد کے پاس نہیں۔غضب کا سائیکولوجی کا سہارا لیتے تھے۔وہ لوگ "پھر دے نا بابو" کارٹ لگاتے یا پھر کسی بت کی مانند اس قدر کھڑا رہتے کہ مجبور ہو کر نہ چاہتے ہوئے بھی سامنے والا مسافر کچھ نہ کچھ دے دیتا۔ مجھے اب ان بھیکاریوں سے ہمدردی نہیں بلکہ ایک کوفت سی ہونے لگی تھی۔

ابھی میں کہاں بیٹھوں کیا کروں کی حالت میں مبتلا تھا ہی کہ میرے کانوں میں ڈھولک کی تھاپ سنائی دی۔نظریں اس جانب اٹھ گئیں تو دیکھا کہ رکشا شیڈ کے قریب پیپل درخت کے سایہ میں ایک تماشہ دکھانے والی عورت اپنی گردن میں لٹکتے ہوئے ایک چھوٹے سے ڈھولک پر تھاپ لگا رہی ہے۔سامنے ہی دو ڈنڈوں پر تنی رسّی پر ایک سات آٹھ سال کی لڑکی اپنے ہاتھوں میں ایک پتلا لیکن اپنی قد سے تقریباً دوگنا لمبا بانس لیے توازن بنائے آہستہ آہستہ چل رہی ہے۔ یہ تماشہ میں اپنی زندگی میں کئی مرتبہ دیکھ چکا تھا لیکن کبھی ٹھہر کر مکمل طور پر نہیں آج موقعہ

تھا میں بھی اس کے چاروں طرف لگ رہے دائرے میں دیگر اشخاص کے ہمراہ کھڑا ہوگیا۔ بھیڑ بڑھتی دیکھ اس ڈھولک والی عورت نے تھاپ دینے کی رفتار اور تیز کر دی۔ دیکھتے ہی دیکھتے اور بھی بھیڑ بڑھ گئی۔ ان میں سے کچھ شاید میری ہی طرح دیر سے آنیوالی ٹرین کا انتظار کرنے والے مسافر تھے۔

رسی پر چلر ہی لڑکی اب آہستہ آہستہ پیچھے کی جانب قدم بڑھا رہی تھی۔ خطرہ زیادہ تھا ذرا سی چوک ہوئی کہ ہڈی پسلی کا کچومر بن جاتا۔ لیکن اس کے چہرے پر خوف کی کوئی شکن ظاہر نہیں ہو رہی تھی۔ وہ اطمینان سے پیچھے کی جانب سدھے ہوئے ایک ایک قدم بڑھا رہی تھی۔ ڈھولک بجاتی عورت بھی پر سکون واطمینان سے پان چباتے ہوئے دائرے کے چاروں طرف گھوم رہی تھی۔ اسے اس کی ذرا بھی پرواہ نہیں تھی کہ رسّی پر چلر ہی لڑکی اگر توازن کھو جائے تو پھر کیا ہوگا۔ شاید اسے یقین تھا کہ ایسا نہیں ہوگا۔

رسی پر پیچھے کی جانب چلتی لڑکی اب اپنی منزل تک پہنچ چکی تھی۔ ٹھیک اسی جگہ ڈنڈے کے قریب کھڑی رسی پر چلتی لڑکی سے ایک یا دو سال کی چھوٹی ایک دوسری لڑکی نے اسے ایک سائیکل کا ریم تھما دیا تھا۔ غضب کا توازن! اب وہ اس ریم پر پاؤں رکھکر آہستہ آہستہ رسی پر آگے بڑھنے لگی تھی میں محو حیرت تھا میں ہی کیا وہاں کھڑے زیادہ تر لوگ اس کے اس حیرت انگیز کارنامے کو سانس روکے دیکھ رہے تھے کتنا سخت مشق کیا ہوگا اس ننھی سی جان نے۔ شاید مشق کے دوران کئی بار گری بھی ہوگی۔ زخمی بھی ہوئی ہوگی یا پھر ٹرینگ کے وقت تنی ہوئی رسّی کے نیچے بالو کا ڈھیر رہا ہوگا یا جال وال بھی ہوسکتا ہے۔ جس پر گر بھی جائے تو چوٹ لگنے کا خدشہ کم رہتا ہے۔ لیکن ابھی تو اس کے نیچے سخت سپاٹ زمین تھی۔

ایک بار بچپن میں جب میری عمر پانچ چھ سال کی رہی ہوگی۔ اپنے نٹ کھٹ طبیعت کے حامل اپنے چچیرے بھائی کے ہمراہ ایک چار فٹ اونچی دیوار پر چڑھ کر کسی طرح کھڑا ہوکر دو چار قدم چلنے کی کوشش کیا تھا۔ لیکن اُسی وقت میری نگاہ نیچے زمین کی جانب پڑ جانے کی وجہ سے ہمت نے جواب دے دیا تھا۔ اور میں گھبرا کر وہیں دیوار کے اوپر چپک کر بیٹھ گیا تھا۔ میرا چچیرا بھائی دیوار کے اوپر بے فکر ہوکر چل رہا تھا۔ بڑی مشکل سے پھر ماں نے مجھے ڈانٹتے ہوئے نیچے اُتارا تھا۔ وہ تقریباً ایک فٹ چوڑی دیوار تھی۔ اور یہ مشکل سے ایک، ڈیڑھ انچ موٹی گول سی رسّی۔ کتنا محل تھا اس پر اس طرح توازن بنانا۔ لیکن مجبوری سب کچھ کرا دیتی ہے۔ آگ میں کودنا، پیڑ پر چڑھنا، پہاڑ پر چڑھنا، پانی میں تیرنا، خونخوار جانوروں سے مقابلہ کرنا، سردی، گرمی، برسات سب کو جھیلنا، یعنی سب کچھ۔

اب وہ لڑکی رینگ کو اپنی ایڑیوں سے دھکیلتے ہوئے پیچھے کی جانب لوٹنے لگی تھی مجھے محسوس ہوا کہ اگر میں اس نظارے کو اور غور سے دیکھوں گا تو شاید میرے دل کی دھڑکن تیز ہو جائے گی۔ ایسا خطرناک منظر میں ابھی

تک واقعی میں نہیں دیکھا تھا۔ مجھے لگا کہ میں یہاں سے ہٹ جاؤں ۔ جیب سے موبائل نکال کر وقت دیکھا۔ ابھی ٹرین کے آنے میں دیری تھی۔ اسٹیشن سے باہر لگے چونگے سے میری ٹرین سے متعلق کسی بھی طرح کا اناؤنسمنٹ نہیں ہوا تھا۔ یہاں سے ہٹنے کا مطلب تھا کہ اسٹیشن پر غیر ارادی طور پر چہل قدمی کرنا، اور کچھ نہیں۔ میں نے پھر سے اس کے کرتب کی جانب اپنا دھیان مرکوز کر دیا۔

اب تک نیچے والی چھوٹی لڑکی اپنے گندے ہاتھوں میں اسٹیل کا پرانا پچکا سا کٹورہ تھامے ناظرین کے نزدیک جانے لگی تھی۔ کچھ لوگوں نے دو پانچ کا سکہ دینا بھی شروع کر دیا تھا۔ لیکن زیادہ تر لوگوں نے اُس مانگنے والی چھوٹی سی بچی کو نظر انداز کر کے اپنا سارا دھیان رسی پر چل رہی لڑکی پر مرکوز کر رکھا تھا۔ کچھ تماشائیوں نے نہ دینے کے غرض سے 'جیسے ہم نے کچھ دیکھا ہی نہیں' کی ایکٹنگ کر رکھی تھی۔ چھوٹی بچی تماشائیوں کے قریب جا جا کر اپنے کٹورے میں پڑے سکوں کو اُچھال اُچھال کر اپنی جانب ان کا دھیان راغب کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ وہ میرے قریب بھی آئی تھی۔ اس نے کٹورے میں پڑے سکوں کو اس فنکارانہ انداز سے اُچھالا تھا کہ مجبوراً مجھے اپنا دھیان اس کی جانب کرنا پڑا۔ بڑی پر اُمید نگاہوں سے وہ مجھے نہار رہی تھی۔ شاید اُسے میرے کپڑوں سے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہاں اُمید سے زیادہ ملے گا۔

ایک دفعہ خیال آیا کہ پرس میں پڑے کچھ سکّے نکال کر اس کے کٹورے میں ڈال دوں اور مہذب شہری ہونے کا اپنا فرض پورا کر دوں کہ میں نے تمہارا تماشہ مفت میں نہیں دیکھا، لیکن میرا ہاتھ ابھی پینٹ کی جیب میں پڑے پرس کی جانب بڑھا ہی تھا کہ میرے بغل میں کھڑے ایک موٹے سے شخص نے چھناک سے کچھ سکّے اس کے کٹورے میں ڈال دیئے اور وہ لڑکی اگلے ناظرین کی طرف بڑھ گئی۔ مجھے احساس ہوا کہ میں نے سکے نکالنے میں تاخیر کر دی تھی۔ دل میں پچھتاوا ہوا، پھر سوچا، دوبارہ آئے گی تو ضرور دیدوں گا ایک دو سکے نہیں بلکہ دس بیس روپے دوں گا۔ اتنا خطرناک اور دلچسپ کھیل کا براہ راست لطف اٹھانے کا اجر ایک دو روپے کے سکے نہیں ہو سکتے۔ ابھی پچھلے ویکنڈ کو خاندان کے ہمراہ ملٹی پلیکس میں دیکھی نئی نئی ریلیز ایک ہندی فلم کے وقت کا منظر یاد آنے لگا۔ ایکدم بورنگ فلم تھی پھر بھی ہزار روپئے سے زیادہ پھونک آیا تھا میں۔ ایک 'کوپی مکئی کا لاوا' پچاس روپئے میں خرید کر بھی ہمیں افسوس نہیں ہوا تھا، بیس بیس روپئے میں ایک ایک سموسے کھا کر بھی بچے خوش تھے۔ سبزیاں خریدتے وقت سبزی فروش دیہاتی عورتوں سے دو چار روپئے کیلئے مول بھاؤ کرنیوالی میری اہلیہ نے بھی دو گنے قیمت میں کولڈ ڈرنکس لیتے وقت اف تک نہیں کیا تھا۔ شاید اسوقت ہم سارے اسے ملٹی پلیکس کی تہذیب کا حصہ سمجھ کر آسانی

سے قبول کر لیے تھے۔

ڈھولک بجاتی عورت نے ڈھولک بجانا بند کر دیا تھا۔اس نے ایک بوتل رسی پر چلنے والی لڑکی کو تھما دیا تھا اور خود دامن پھیلائے دائرے میں کھڑے ناظرین کے درمیان آہستہ آہستہ گھومنے لگی تھی۔ایکدم خاموش ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ وہ کہہ رہی ہو مانو کہ دو تو بھلا نہ دو تو بھی بھلا اور دوسری جانب رسیّ پر چلنے والی لڑکی نے تو کمال ہی کر رکھا تھا۔سر پر بوتل کا توازن برقرار رکھتے ہوئے ریم کو بدستور رسی پر آگے لے جا رہی تھی۔شاید اس تماشے کا یہ آخری حیرت انگیز کارنامہ تھا۔

وہ کٹوری والی چھوٹی لڑکی اور ڈھولک والی وہ عورت دائرے میں کھڑے ناظرین کے درمیان دو چکر لگا چکی تھی۔اس آئٹم کو دیکھنا لوگ چھوڑنا نہیں چاہتے تھے۔اس لیے جنھیں کچھ بھی نہ دینا تھا وہ بھی کچھ نہ کچھ ان دونوں کو دے رہے تھے۔میں اپنا پرس چیک کر چکا تھا۔اس میں دو چار ہی سکے پڑے ہوئے تھے۔ساتھ ہی ایک پانچ سو روپئے کا کڑک نوٹ بھی۔باقی اول جلول کاغذ کے پرزے جسے میں دس بیس روپئے کا نوٹ ہونے کا بھرم پال رکھا تھا۔آج بھی اسی غلط فہمی میں مبتلا تھا۔قمیض کے اوپر کی اندر والی جیب کھنگالا۔وہاں دو دو ہزار کے دو نوٹ پڑے تھے۔اب میں تذبذب کی حالت میں تھا۔کیا کروں کیا نہیں۔کیا وہی دو چار سکے دے دوں۔نہیں نہیں۔یہ میری حیثیت کے مطابق مناسب نہیں ہوگا۔میری روح سے آواز آئی۔حالانکہ وہاں میرے ارد گرد کھڑے لوگ میری حیثیت سے واقف نہیں تھے۔میں بھی اپنے پاس کے سکے اس عورت کو دے سکتا تھا اور اپنے دل و دماغ میں رفتہ رفتہ چڑھ رہے بوجھ کو ہلکا کر سکتا تھا لیکن ایسا نہ کر سکا۔

رسّی پر چلتی لڑکی نیچے کود چکی تھی۔بھیڑ منتشر ہونے لگی تھی۔کچھ پلیٹ فارم کی جانب جا رہے تھے ۔اسٹیشن کے باہر لگے چونگے سے میری ٹرین کے آنے کی اطلاع دی جا چکی تھی۔میرے بھی قدم پلیٹ فارم کی جانب بڑھنے لگے۔ایک بار خیال آیا کہ کیوں نہ پانچ سو کا نوٹ ہی دیتا چلوں۔میرے بینک بیلنس میں اس سے کوئی فرق نہیں پڑتا لیکن کیا یہ ایک چلتاؤ اسٹریٹ شو کیلئے زیادہ نہیں تھا۔پھر اس عورت نے کہیں کچھ غلط سوچ لیا تو نہیں۔تو ڑا موڑا کر دوں گا۔اصل فنکار یعنی اس رسیّ پر چلنے والی لڑکی کو دوں گا۔ہاں، مجھے پانچ سو کا نوٹ دے دینا چاہیے۔اس بہانے ان مفلس فنکاروں کو کچھ تو مدد ہو جائے گا۔میرے دل و دماغ کا آپسی جنگ۔میرے قدم رک گئے۔میں نے پرس سے پانچ سو کا کڑکڑاتا ہوا نوٹ نکالا۔اسے توڑ مڑا کر گول کر دیا۔لیکن یہ کیا ٹرین دھڑ دھڑاتی ہوئی آکر پلیٹ فارم پر کھڑی ہوگئی اور میں تیز تیز قدموں سے اس جانب لپک پڑا۔

بھرم

ڈاکٹر صابرہ خاتون حنا

"یہ کاٹھ کباڑ سا صندوق نہ جانے کب تک یہاں پڑا رہے گا .... جب ہٹانے کو کہو تو ٹسوے بہانے لگتی ہیں .... کہتی ہیں ماں کی نشانی ہے ...... ماں ...... ہونہہ ...... اس بڑھاپے میں بھی ماں کی مالا جپنا کیا سو بھا دیتا ہے .... ہمارے سندر سے گھر کا ستیاناس کر کے رکھا ہے .... ایک تو خود ہی دھرتی کا بوجھ ہیں اور اوپر سے یہ صندوق .... نہ جانے کون سا خزانہ بھر رکھا ہے .... "

"شیاما تم پھر سے شروع ہو گئیں ۔۔۔ ارے کیا وقت ہے تم کو۔۔۔ پڑے رہنے دو نا ایک کونے میں ۔۔۔"

" کونا ۔۔ تم اسے کونا کہتے ہو۔۔۔ پورا ایک کمرہ جام کر کے رکھا ہوا ہے۔۔۔ اب بچے بڑے ہو گئے ہیں ۔۔ آئے دن ان کے ملنے جلنے والے آتے ہیں ۔۔۔۔ پارٹیاں چلتی ہیں ۔۔۔۔ کتنی تکلیف ہوتی ہے ۔۔ مگر ۔۔۔ کتنی بار کہا کہ اسے کباڑی کے ہاتھ بیچ دیں ۔۔۔ آخر ان کو تالا چابی والی تجوری کی ضرورت ہی کیا ہے ۔۔۔۔ دو عدد ساڑیاں ہی تو ہیں کسی تھیلے میں بھر کر رکھ دیں ۔۔۔۔"

"ارے چپ بھی کرو آہستہ بولو ۔۔ ماں پوجا ختم کر کے آتی ہی ہوگی ۔۔ سنے گی تو دکھ ہوگا ۔۔۔"

"ماں کے دکھ کی چنتا ہے اور میری نہیں ۔۔۔ مجھے بیاہ کے اسی لیے لائے تھے ۔۔۔ اسٹیٹس کا خیال تو مجھے ہے نا تمہیں کیا ۔۔۔ تم کیا جانو کہ سوسائٹی میں کیسی کیسی باتیں ہوتی ہیں ۔۔۔ کتنے اسٹینڈرڈ لوگ ہیں یہاں پہ۔۔۔ سوہنی تو اپنی ساس کو اولڈ ایج ہوم میں رکھ آئی ہے۔۔۔ دلیپ جی نے بھی تو اپنی ماں کو تیرتھ یاترا پر بھیج دیا ہے ۔۔ ساتھ ہی وہاں متھرا کے کسی آشرم میں ان کے رہنے سہنے کی بات بھی کر لی ہے ۔۔۔ مگر تم ۔۔۔ تم ابھی بھی پلو پکڑ کے جھولو ماں کے آگے پیچھے ۔۔۔ نہ صندوق ہٹتا ہے نہ ہی وہ بڑھیا ۔۔۔ ہونہہ ۔۔۔"

"ارے سنو تو ۔۔۔"

" نہیں سننی مجھے تمہاری باتیں ۔۔۔" شیاما پیر پٹکتے ہوئے دوسرے کمرے میں چلی گئی ۔۔۔ کنال کی بیا ہتا زندگی دا ؤ پر لگ گئی تھی وہ ماں کی مانے یا شیاما کی ۔۔۔ ماں صندوق بیچنے پر راضی نہیں ۔۔۔ چابیاں بھی لیے لیے گھومتی ہے ۔۔۔ آخر تیرتھ یاترا یا آشرم میں تو کوئی ہرج نہیں وہاں تو ماں رہ ہی سکتی ہے ۔۔۔ شیاما ٹھیک ہی کہتی ہے

سوسائٹی میں بھی تو کوئی عزت ہے۔۔۔آج ماں سے بات کرتا ہوں۔۔۔مگر وہ مانے گی نہیں۔۔۔اسے تیرتھ یاترا کے بہانے۔۔۔ہاں یہی ٹھیک ہوگا۔۔۔

کنال کے چہرے پر اطمینان پھیل گیا۔۔۔وہ آرام کرسی پر جھولتے ماں کے آنے کا انتظار کرنے لگا۔۔۔بہت دیر ہوگئی۔۔۔اب تک تو آجانا چاہیے تھا۔۔۔وہ اٹھ کر ٹہلنے لگا۔۔۔شیاما کا موڈ آج بہت خراب ہے۔۔۔اس مسئلہ کا کوئی حل نکالنا ہی ہوگا۔۔۔یہ سوچتے ہوئے وہ دروازے کی جانب بڑھا۔۔۔ماں بڑے آرام سے دروازے کی چوکھٹ تھامے بیٹھی تھی۔۔۔ماں تم یہاں بیٹھی ہو اور میں۔۔۔یہ کہتے ہوئے کنال لپکا۔۔۔یہ کیا ماں کی آنکھیں تو پتھرا رہی تھیں۔۔۔کیا ہوا ماں۔۔۔اس نے ماں کو اپنے بازوؤں میں بھر لیا۔۔۔ماں نے بند ہوتی آنکھیں کھولیں۔۔۔اپنے لعل کو غور سے دیکھا۔۔۔کپکپاتے ہاتھوں سے چابیوں کی جانب اشارہ کیا اور کنال کی باہوں میں جھول گئی۔۔۔کنال کو دکھ تو ہوا۔۔۔وہ رویا بھی۔۔۔لیکن اسے اطمینان بھی تھا کہ بھگوان نے ماں کے آگے اس کا بھرم قائم رکھا۔۔۔کریا کرم کے بعد جب شیاما نے صندوق کی بات چھیڑی تو اسے ماں کی سونپی ہوء چابیاں یاد آئیں جنہیں اس نے یوں ہی میز کی دراز میں ڈال دیا تھا۔۔۔وہ چابیاں لے کر صندوق کی جانب بڑھا۔۔۔تالا کھلتے ہی ماں جیسی خوشبو اس کے نتھنوں سے ٹکرائی۔۔۔اس نے آگے بڑھ کر ٹٹولنا شروع کیا۔۔۔ڈھیروں پرانی چیزیں بھری ہوئی تھیں۔۔۔شیاما ٹھیک ہی کہتی تھی اس نے سوچا یہ کباڑ ہی تو ہے۔۔۔اتنے میں اس کے ہاتھوں سے کچھ ٹکرایا۔۔۔یہ ایک ٹوٹی ہوئی ریل گاڑی تھی۔۔۔اسے دیکھتے ہی سوچ کی رفتار تیز ہوگئی، ذہن ماضی کی طرف بھاگنے لگا یہ تو وہی ریل گاڑی ہے جسے پہلی بار اسکول جانے کی شرط پر بابا نے مجھے خرید کر دی تھی۔۔۔اور یہ ٹوٹا ہوا سلیٹ۔۔۔کنال کے ہونٹوں پر مسکراہٹ پھیل گئی۔۔۔یہ میں ABCD لکھتے لکھتے خوشی میں اچانک دوڑ پڑا، ٹھوکر لگی اور یہ سلیٹ ٹوٹ گیا۔۔۔میں بہت رویا۔۔۔ماں نے اسے بھی سہیج کر رکھا ہے۔۔۔یہ کیا ہے۔۔۔یہ چھوٹے چھوٹے کپڑے۔۔۔اچھا ان پر کچھ لکھا بھی ہے۔۔۔، یہ میرے راجا بیٹے کا پہلا کپڑا جسے میں نے اپنے ہاتھوں سے سلا ہے"۔۔۔اور یہ۔۔۔یہ۔۔۔پہلا موزہ جو میں نے اپنے پیارے بیٹے کے لیے بنا"۔۔۔یہ کاغذوں کے ڈھیر میں کیا ہے۔۔۔پھٹا ہوا پچاس کا نوٹ۔۔۔اچھاااا اسے میں نے ہی تو غصے میں پھاڑ دیا تھا۔۔۔ماں نے ان ٹکڑوں کو بھی جوڑ کر رکھا ہوا ہے۔۔۔اور یہ میرا KG1 کا مارکس شیٹ۔۔۔ارے کتنے اچھے مارکس ہیں بابا نے لکھا ہے "یہ میری محنت کا پھل ہے۔۔۔"ماں نے پاس میں لکھا ہے۔۔۔"بالکل جھوٹ یہ میری محبت کا پھل ہے۔۔۔"

واہ۔۔۔ماں۔۔۔ KG2 کلاس 4,3,2,1۔۔۔کے تمام مارکس شیٹ، پیارے پیارے کمنٹس۔۔۔یہ میڈل۔۔۔اچھا۔۔۔یہ مجھے اسپورٹس میں فرسٹ آنے پر ملا تھا۔۔۔اور یہ شیلڈ بھی۔۔۔ارے یہ تصویر بھی ہے۔۔۔ میں کتنا گول مٹول تھا۔۔۔ پیچھے کیا لکھا ہے دیکھوں "ماں اور بابا کی جان۔۔۔" ہاں میں جان ہی تو تھا۔۔۔ارے ماں نے تو میرا چھوٹا سا بستر اور تکیہ بھی رکھا ہوا ہے۔۔۔ماں بھی نا۔۔۔ارے بابا کی دلائی بندوق بھی ہے۔۔۔بابا نے لکھا ہے

"میرا بیٹا افسر بنے گا"۔۔۔کیا بابا آپ کہاں چلے گئے۔۔۔ یہ چھوٹے سے باکس میں کیا ہے اسے کھولتا ہوں۔۔۔ کورٹ کے کاغذات۔۔۔شاید Affidavit ہے ساتھ میں ماں کے ہاتھ کا لکھا ایک خط بھی ہے اور اس پر گنگا آشرم کی مہر بھی لگی ہے یہ کیا ہے۔۔۔ماں نے لکھا ہے سکریٹری مہودے۔۔۔نمسکار۔۔۔ میں اپنے پورے ہوش وحواس میں یہ گہنے اس شرط پہ آپ کو سونپ رہی ہوں کہ جب میرا بیٹا یہاں پہنچے تو اسے کسی طرح کی تکلیف نہ ہو اور اسے گھر جیسی سو بیدھائیں دی جائیں۔۔۔اور بنتی ہے کہ اسے ناشتے میں سوجی کا حلوا اور کھانے میں مٹر پنیر کی سبزی پروسی جائے تاکہ اسے ماں کی کمی کا احساس نہ ہو۔۔۔۔

آپ کی سوبھنا

وہ خط پڑھ رہا تھا اور اس کی آنکھیں بھیگ رہی تھیں، خط کے اختتام پر اس نے ماں ماں کہتے ہوئے ایک زوردار چیخ ماری

اور وہیں زمین پر گر پڑا

اس کا بھرم ٹوٹ چکا تھا

عالمی فلک آپ ہی کا رسالہ ہے۔

آپ کا قلمی تعاون ہماری ہمت افزائی کا موجب ہوگا۔

مشمولات پر آپ کی بے باک رائے معیار کی بلندی میں معاون ہوگی۔

(ادارہ)

گھٹن

صبیحہ تزئین

اب میرا سر چکرانے لگا ہے، آنکھوں کے آگے اندھیرا بڑھتا جارہا ہے، دھوئیں کے بادل سانس لینے میں مشکل پیدا کررہے ہیں، میرا بھروسہ ٹوٹتا جارہا ہے اور گھٹن بڑھتی جارہی ہے، اعتماد ڈگمگا رہا ہے اور اب میں صرف اپنی قوت ارادی کی بدولت چل رہی ہوں۔

میں بہت دنوں سے چل رہی ہوں، میرا سفر بہت طویل ہے، اس لمبے سفر میں میں نے کیا دیکھا اور بھوگا ہے یہ میں ہی جانتی ہوں، نہ تو مجھے کوئی تاریخ یاد ہے نہ ہی کوئی زمانہ۔ جب میں نے ہوش سنبھالا تو میں سفر میں تھی۔ چاروں طرف سکون، سناٹا اور خاموشی تھی۔ برف کی چادر اوڑھے ہوئے سر بلند پہاڑ، پہاڑوں کی دراریں، کھلکھلاتے ہوئے پانی کے چشمے جنہیں دیکھ کر دودھ کی ندیاں بھی شرما جائیں، وادیوں میں حد نظر تک پھیلے ہوئے سرسبز وشاداب میدان جن میں جابجا بہترین پھلوں اور میووں کے درخت، ہواؤں میں انگنت پھولوں کی خوشبو، سونے کی طرح دمکتے ہوئے صحرا، صبح وشام کے وہ حسین مناظر جن کے لیے وقت کے رک جانے کی دعا کرنے کی خواہش ہو، سمندروں، دریاؤں اور جھیلوں کا پانی اتنا شفاف کہ چاند ستارے بھی ان کو آئینہ سمجھ کر اپنا سنگھار کرتے تھے۔

میں سرشاری کے عالم میں آگے بڑھ رہی تھی کہ مجھے کچھ آہٹ اور ہلچل کا احساس ہوا۔ میں نے دیکھا کہ کچھ جاندار ہیں جو بڑے خوش باش ہیں۔ وہ جھیلوں اور چشموں کا پانی پی رہے ہیں، پھل پھول سے اپنا پیٹ بھر رہے ہیں۔ ان میں الگ الگ شکل وصورت والوں کا الگ الگ گروہ ہے وہ سب خود میں مست ومگن ہیں۔ میں نے فضاؤں میں مختلف طرح کے پرند دیکھے۔ بہت چھوٹے سے لے کر بہت بڑے، مختلف رنگوں اور منفرد آوازوں والے جو اپنے بال و پر کے نشے میں چور ہوا میں اڑے چلے جارہے ہیں۔ ان کی خوش کن چہکار سے معطر ہوا نغمہ ریز ہے۔ دریاؤں اور سمندروں میں آبی جاندار اپنی اٹکھیلیوں میں مگن اور ایک دوسرے کے تعاقب میں رواں دواں ہیں۔ ایسا لگا کہ رنگ ونور کا ایک سیل رواں ہے جو مستقل بہہ رہا ہے۔ اتنا پرکیف و پرسکون نظارہ دیکھ کر میں بھی تازہ دم ہوگئی اور خوشی خوشی چلنے لگی۔

میرا اب تک کا سفر کافی اطمینان بخش اور خوش کن تھا اور آگے بھی اسی طرح چلتے رہنے کی امید تھی لیکن میرے

اندازے کے برخلاف میں نے بہت سے روح فرسا مناظر اور خوفناک صورتحال بھی دیکھی۔ بھیانک طوفان اتنا شدید اور گہرا کہ ہر چیز دھند میں چھپ گئی۔اتنی تیز ہوائیں کہ بڑے بڑے پیڑ بھی جڑ سے اکھڑ گئے۔ایسی گھن گرج کہ کلیجہ دہل جائے،طوفان کی زد میں جو بھی آیا وہ پھر نظر نہ آیا۔طوفان تھما بھی نہیں تھا کہ بارش شروع ہوگئی۔ایسی موسلا دھار بارش جس کا بیان مشکل،بجلی کی ایسی کوندیں اور بادلوں کی ایسی گرج کہ اچھے اچھوں کا دم الٹ جائے ۔ایسے میں تنہا میں۔بارش کے رکنے کا جیسے کوئی امکان ہی نہیں ہو۔دن مہینے سال پتہ نہیں کتنا وقت لگا۔آہستہ آہستہ بارش تھمنے لگی لیکن اس کے زیر اثر آنے والا سیلاب......جن چیزوں کو بارش نے نہیں چھوا تھا وہ سیلاب کی نذر ہوگئیں۔اتنا پانی،اتنا پانی کہ دریا،سمندر اور زمین میں فرق کرنا مشکل ہوگیا۔پانی بہتا رہا،بہتا رہا یہاں تک کہ پھر سے پیڑ،پہاڑ نظر آنے لگے۔میدانوں اور دریاؤں کو پہچانا جانے لگا۔تمام چیزوں کو دوبارہ بحال ہونے میں بڑی مدت لگی۔طوفان اور سیلاب کے تھپیڑے کھاتی اور پانی سے تر بتر اپنے آپ میں سکڑی سمٹی میں آگے بڑھتی رہی۔

میرا سفر جاری تھا۔اب تک میں نے برف سے ڈھکے ہوئے پہاڑ دیکھے تھے،بارش دیکھی تھی،سیلاب دیکھا تھا،لیکن اب میرے سامنے منظر کچھ مختلف تھا۔بڑے بڑے پہاڑ آگ اگل رہے تھے،آگ اور دھویں کا ایسا نظارہ کہ رونگٹے کھڑے ہوگئے۔ابھی تو میں پانی کی غضب ناکی کو جھیل کر آگے بڑھی تھی اور اب سامنے پگھلی ہوئی آگ اور انگاروں کا ایک سیل تھا،جس نے اپنے راستے میں آنے والی کسی بھی چیز کو خواہ وہ جاندار ہو یا بے جان نہیں بخشا اور سب کو خاکستر کر دیا۔ایسی گرمی اور تپش کہ انگ انگ جھلس گیا۔یہ جھلسا دینے والا منظر مدتوں ایک بھیانک خواب کی طرح مجھے ڈراتا رہا۔لیکن میری قسمت میں سکون نہیں ہے مجھے ابھی اور بھی آگے جانا ہے۔

میں نے ایک نئی طاقت اور جوش کے ساتھ اپنا سفر شروع کیا،کچھ وقت کے بعد میں نے کچھ اور جاندار دیکھے جو نہ چرند تھے نہ پرند بلکہ خونخوار اور دہشت ناک درندے تھے،انہیں دیکھ کر ایسا لگتا تھا کہ مانو پہاڑوں میں جان پڑ گئی ہو،جو خود سے کمزور اور چھوٹے جانداروں کا شکار کر کے اپنا پیٹ بھر رہے تھے،ان کا قد و قامت کافی بڑا اور صورت و شکل کافی ڈراؤنی تھی،ان کے نزدیک صرف اپنا پیٹ بھرنا ہی ایک جائز عمل تھا،وہ اپنی من مانی اور دہشت گردی میں مصروف تھے اور میں دبے پاؤں وہاں سے نکل آئی۔

میرے سفر کا یہ حصہ بڑا ہی یادگار ہے۔یہاں میں نے بڑی ہی خوبصورت مخلوق دیکھی۔یہ نہ تو چرند تھے نہ پرند اور نہ ہی زیر آب رہنے والے جاندار۔یہ سب سے مختلف تھے۔یہ آپس میں گروہ بنا کر رہتے۔اشاروں سے ایک دوسرے کو مخاطب کرتے۔ایک دوسرے کا خیال رکھتے۔انہیں درندوں سے خطرہ رہتا۔اس لیے وہ پہاڑوں

کی کھوہ میں رہتے۔ رفتہ رفتہ انہوں نے اپنے رہنے کے لیے مکان بنانا شروع کردیا، وہ اپنی حفاظت کے لیے پتھروں سے چھوٹے چھوٹے ہتھیار بنانے لگے۔ میں نے دیکھا کہ یہ اپنے کھانے کی چیزوں کو دوسرے جانداروں سے الگ طریقے سے کھاتے ہیں۔ پھر انہوں نے اپنے کھانے تیار کرنے کے لیے آگ کا سہارا لیا اور با قاعدہ کھانا بنانے لگے۔ اس کے بعد انہیں اپنی ستر پوشی کا خیال آیا اور اس کے لیے انہوں نے کبھی پتے، کبھی درختوں کی چھال اور کبھی دوسرے جانوروں کی کھال استعمال کی۔ یہ سب میرے لیے بالکل نیا نیا سا تھا اور بہت دلفریب بھی۔ یہ لوگ بڑے پیار سے ساتھ رہتے، پھر انہوں نے ایک دوسرے سے باتیں کرنا شروع کیا۔ انہوں نے ہر چیز کو نام دیا اور ایک دوسرے کو بھی نام سے بلانے لگے۔ ان کے طور طریقے بڑے دلچسپ تھے۔ مجھے لگا یہ بہت اچھا وقت ہے اور اب مجھے اور اس وقت کو یہیں رک جانا چاہئے۔

سورج اور چاند ستاروں کی آنکھ مچولی جاری رہی، پودے، پیڑ بنتے رہے اور پیڑ پھر سے بیج بنتے رہے۔ پہاڑوں کی برف پگھلتی اور جمتی رہی۔ لہلاتے ہوئے کھیت ہرے سے پیلے اور پھر سے ہرے ہوتے رہے۔ تبدیلی... یہی تو ایک مستقل چیز ہے ورنہ ٹھہراؤ تو زندگی کو موت میں بدل دیتا ہے۔ اپنے سفر کے دوران میں نے بھی کافی تبدیلیاں دیکھی ہیں اس کے باوجود میں اپنے سفر میں مصروف ہوں کیونکہ میرا چلتے رہنا ہی میری زندگی کی ضمانت ہے۔

میں نے محسوس کیا کہ جن جانداروں کو دیکھ کر مجھے بڑی خوشی ہوئی وہ اب آہستہ آہستہ اپنے انداز و اطوار بدل رہے ہیں۔ وہ جو بارش اور دوسرے جانوروں سے بچنے کے لیے کچے گھر بناتے تھے اب بڑے بڑے پختہ مکان اور عمارتیں بنا رہے ہیں۔ اچھے بھلے کھیتوں کو تہس نہس کر کے وہاں کل کارخانے اور کھیل کے میدان بنا رہے ہیں۔ اپنے آرام و آسائش کے نام پر ایسی ایسی ایجادیں کر رہے ہیں کہ میں دنگ ہوں۔ وہ سب ایک غیر معمولی نظر نہ آنے والی دوڑ میں مبتلا ہیں اور دوسرے کو پیچھے چھوڑ کر خود آگے بڑھنے کے لیے کچھ بھی کر سکتے ہیں۔ انہوں نے اپنے اپنے گروہ بنا لیے ہیں اور ان کا سربراہ جیسا چاہتا ہے وہ ویسا ہی کرتے ہیں پھر چاہے انہیں اپنے جیسوں کا قتل عام ہی کیوں نہ کرنا پڑے وہ دریغ نہیں کرتے۔ جسمانی طور پر کمزور نظر آنے والی یہ مخلوق اصل میں ذہنی طور پر بہت ہی مضبوط ہے۔ چالاکی، عیاری، مکاری، سفاکی، بے رحمی اور خود غرضی اس کی نمایاں خصلتوں میں سے ہے۔ وہ اپنی شاطرانہ چالوں سے سب کے ساتھ ساتھ مجھے بھی بے وقوف بنا رہے ہیں اور من مانی کر رہے ہیں۔

اس طویل سفر میں جہاں تک مجھے یاد ہے میں نے ایک ہی قبیل کے درندوں کو بھی ایک دوسرے کو مارتے

نہیں دیکھا۔وہ اگر کسی دوسرے جانور کو مارتے بھی ہیں تو اپنا پیٹ بھرنے کے لیے جب کہ یہ جاندار جو خود کو انسان کہتا ہے صرف خود کو برتر ثابت کرنے کے لیے اپنے جیسوں کو مارتا ہے، ان کی جمع کی ہوئی چیزیں ہتھیا لیتا ہے۔ان کے بنائے ہوئے گھروں پر قبضہ کر لیتا ہے اور اس کو اپنی حرکتوں پر ذرا بھی پشیمانی نہیں ہوتی، بلکہ فتح اور کامیابی کے نغمہ گاتا ہے۔ پہلے تو انہوں نے شکار اور اپنی حفاظت کے لیے ہتھیار بنائے تھے جو بہت معمولی اور چھوٹے ہوتے تھے پھر انہوں نے بڑے، مہلک اور جان لیوا ہتھیار بنانے شروع کر دیے جو آن کی آن میں پوری کی پوری بستی، گاؤں اور شہروں کو خس و خاشاک کی طرح پھونک دے اور بنانے والی کی پیشانی پر بل بھی نہ آئے۔ یہ سب ایک دوسرے کے خون کے پیاسے اور جان کے دشمن بنے ہوئے ہیں۔ مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔ میں پچھلے دنوں کو یاد کر رہی تھی جب یہ سب بڑے پیار سے ایک دوسرے کے ساتھ رہتے تھے اور بڑی ہمدردی سے پیش آتے تھے۔

میں نے دوران سفر اتنی تبدیلیاں دیکھی ہیں کہ مجھے اطمینان ہے کہ یہ منظر بھی بدل جائے گا۔اور ہوا بھی یہی۔انسان نے ترقی کے مزید مراحل طے کر لیے ہیں اور اپنی عقل اور طاقت کا لوہا منوالیا۔انہوں نے ہر میدان میں خود کو ثابت کر دیا ہے، ان کی بنائی ہوئی عمارتیں آسمان سے باتیں کر رہی ہیں۔نقل و حمل کے لیے انہوں نے چوپایوں کا سہارا لینا چھوڑ دیا ہے بلکہ اپنی سہولت کے اعتبار سے بڑی چھوٹی ہر طرح کی سواریاں بنالی ہیں جو چشم زدن میں طویل فاصلے طے کر سکتی ہیں۔ان کے پاس زمین پر چلنے، پانی میں تیرنے، پانی کے اندر چلنے، ہوا میں اڑنے والی مشینیں ہیں۔ اور تو اور خلا میں بھی انہوں نے اپنی پکڑ ثابت کر دی ہے اور چاند ستاروں پر بھی کمندیں ڈالنا شروع کر دیا ہے اور وہ اس میں بہت حد تک کامیاب بھی ہیں۔ایک طرف تو وہ آسمان میں اڑ رہے ہیں اور دوسری طرف انہوں نے پاتال کی گہرائیوں کو بھی کھنگال ڈالا۔

مجھے یاد ہے کہ جب میں نے اپنا سفر شروع کیا تھا تو میرے پاس میری گود میں بہت ساری قیمتی اور انمول چیزیں تھیں، جن کو میں بڑی حفاظت اور احتیاط سے لے کر چل رہی تھی، ان کو میں سب سے چھپا کر رکھتی تھی۔ بے شک ناگہانی صورت حال میں کچھ چیزیں تو ادھر ادھر ہو گئی تھیں لیکن میں نے انہیں پھر اکٹھا کر لیا تھا اور واپس اپنے خزانے میں ڈال کر مسرور ہو گئی تھی۔اپنی چیزیں اپنی ہی ہوتی ہیں چاہے استعمال میں آئیں یا نہ آئیں لیکن دوسروں کا عمل دخل اچھا نہیں لگتا۔مگر افسوس میرے ساتھ ایسا نہیں ہوا۔صدیوں سے جو خزانہ میرے پاس محفوظ تھا اس پر اچانک انسان نامی حیوان کی نظر پڑ گئی، جنہوں نے تمام جانداروں کو ہراساں کیا ہوا تھا۔ پھر کیا تھا انہوں نے اپنی ملکیت سمجھ کر مجھے اندر باہر بالکل ادھیڑ کر رکھ دیا۔ ہر بار وہ میرے کلیجے کو چھلنی کر کے مجھے کمزور بنا کر جتنا جی چاہتا

ہے اپنی پسند اور ضرورت کا سامان لے جاتے ہیں اور میں درد سے سسکتی رہ جاتی ہوں۔ وہ ایک دوسرے پر حاوی ہونے کے لیے مجھے کھوکھلا کر رہے ہیں۔ میں نے دیکھا ہے کہ وہ مجھ سے چھینی ہوئی چیزوں کو مجھ پر ہی آزماتے ہیں اور میری تباہی اور اپنی کامیابی کا جشن مناتے ہیں اور مجھے مزید کرب میں مبتلا کرنے کی سازش شروع کر دیتے ہیں۔

مجھے نہیں معلوم کہ یہ سفا کانہ دوڑ جس کو انہوں نے ترقی کا نام دیا ہے کہاں جا کر رکے گی۔ رکے گی بھی یا نہیں ۔مگر مجھے یہ لگتا ہے کہ اب میں رکنا چاہتی ہوں، تھک گئی ہوں اور میں نے بہت تبدیلیاں دیکھی ہیں اور ہر بار مجھے لگا کہ بس اب یہ آخری پڑاؤ ہے مگر ہر بار میں غلط ثابت ہوئی ہوں۔ کیونکہ ہر پڑاؤ کے بعد میں نے پھر سے ہمت جوڑی اور چلنا شروع کیا۔ میں نے سمجھ لیا ہے کہ ٹھہرنے کا خیال بے کار ہے۔ مجھے بس چلتے رہنا ہے یہاں تک کہ ایک دن میں تھک کر گر جاؤں، ریزہ ریزہ ہو کر بکھر جاؤں ...... ممکن ہے کہ کسی روز ایک ایسا معجزہ ہو جائے۔ میرے جسم پر لگا ہر زخم بھر جائے۔ میری قوت اور توانائی مجھے واپس مل جائے، میرے سانس لینے کے لیے تازہ ہوا مہیا ہو۔ میرے دامن پر خون کے چھینٹے نہ ہوں، میرے ارد گرد وہی خوشگوار خوشبو دار ماحول، شفاف جھرنے، خالص ہوا، تازہ میوے اور ان سب سے فائدہ اٹھانے کے لیے وہی پیاری پیاری مخلوق ہو اور میں تازہ دم ہو کر اپنا سفر جاری رکھ سکوں۔

نظم ______________ راشد جمال فاروقی

امّی کی جائے نماز

امی کی یہ جائے نماز

مجھے دیدو

مجھے پتہ ہے

اس میں کتنی روشن صبحیں جذب ہوئی ہیں

کتنی سنائی دوپہریں

اس کی سیون میں زندہ ہیں

مغرب کے جھٹ پٹ انوار کی شاہد ہے یہ

آخرِ شب کا گریہ

اس کے تانے بانے کا حصہ ہے

امّی کے پاکیزہ سجدوں کی سرگوشی

اس کے کانوں میں زندہ ہے

ان کے سچے سچے سجدے

دیکھو کیسے چمک رہے ہیں

اس کی لمس کی خوشبو

کیسی پھوٹ رہی ہے

امی کی یہ جائے نماز بڑی دولت ہے

امی کی یہ جائے نماز مجھے دیدو

ستارۂ چشمِ تر

یہ سبز موسم کی شام اپنی
یہ چاند تنہا
دھواں دھواں آسمان جیسے
رفیق شب ہائے ہجر اپنے
ستارے چشمِ تر ہی ٹھہرے
کوئی صدا ہے نہ کوئی آہٹ
نہ کوئی دستک نہ کوئی جگنو
میں کب سے تم کو پکارتا ہوں
عجب ہے آہ و فغاں کا عالم
مگر مری یہ صدائے محزوں
فلک کی جانب تو جا رہی ہے
مگر وہاں کوئی سننے والا
نہیں ہے شاید
نہیں ہے شاید
رفیق شب ہائے ہجر اپنے
ستارۂ چشمِ تر ہی ٹھہرے

جستجو

میں دشتِ جاں میں
بہت زمانے سے چل رہا ہوں
صدائیں دیتا ہوں زندگی کو
پکارتا ہوں میں خود کو لیکن
مری صدائیں پلٹ کے خود
بازگشت بن کر
مرے ہی لہجے میں
میرے لفظ و بیاں میں جیسے
اتر کے مجھ سے ہی ہم کلام ہو رہی ہیں
میں دشتِ جاں میں
پکارتا ہوں
ہر آدمی کو
ہر اجنبی کو
زندگی کو
خود اپنے رنگ و آہنگ لفظ و معنی کو
ایک مدت سے جستجو میں لگا ہوا ہوں
مگر مری جستجو کا حاصل
ہے گویا اک سعی رائیگاں سی

حقیقت زادوا ہمے

ہزاروں وہم پلتے ہیں
ہمارے ذہن کے اندر
کبھی محسوس ہوتا ہے کوئی آواز دیتا ہے
کبھی خوابوں میں اک ویراں حویلی رقص کرتی ہے
کبھی لگتا ہے جیسے شہر پر ظلمت برستی ہے
کبھی مردہ اجالوں میں
سحر انگڑائی لیتی ہے
کبھی سورج کی کرنوں میں
لہو کی باس آتی ہے
کبھی دنیا
رہِ احساس میں خیمے لگا دیتی ہے ماضی کے
گذشتہ حادثے انگڑائیاں سی لینے لگتے ہیں
برہنہ لڑکیوں کے جسم اُگ آتے ہیں نیزوں پر
سمندر اور زمینوں کے لبادے خون کی رنگت
قیامت کے مناظر پیش کرتے ہیں۔
نہ جانے کیوں
ہمارے ذہن کے اندر
ہزاروں وہم پلتے ہیں

ہجرتوں کے خواب مت بُنتا

صدائے حق پہ اے لبیک
......کہنے والے انسانو!
کبھی تم شہر کے ان وحشیوں کے
......ظلم سے ڈر کر
بدن سے
......ہجرتوں کے خواب مت بُنتا
بدن سے ہجرتیں کرتے ہی یہ دنیا
تمہارے جسم آتش زار کر کے
......راکھ کو روپوش کر دے گی

ایڈز

ہوس کا کھیل بھی کتنا مسرت خیز ہوتا ہے
کہ اس کو کھیلنے والے
یہ اکثر بھول جاتے ہیں
بدن میں جب
بدن کی لذتیں غرقاب ہوتی ہیں
تو ان کے ساتھ
......اب ایسی تباہی جسم میں
......تحلیل ہو جاتی ہے
......جس کا عمر بھر کوئی
ازالہ ہو نہیں سکتا

ترکِ تعلق

وہ مرا شوقِ رفاقت
وہ مرا جذبۂ عشق
ہم نے چاہا کہ لکھیں گے نئی اک نظمِ حیات
اک نیا دشتِ ثبات
دیدۂ تر کی وہ بات
نوحۂ دستِ ستم
اپنی پلکوں میں چھپایا تھا اجالے کا بھرم
ہم نے چاہا تھا کہ مٹ جائے
ہر اک رسمِ جفا
پھر طلوع ہوئی اک راہِ وفا
کیا خبر تھی کہ یہ سب خواب کی باتیں ہو کر
یوں شکستہ دلِ افسوں ہوگا
ہم نے چاہا تھا جو وہ ہو، نہ مگر یوں ہوگا
ہم کو پیمانِ محبت کا رہا پاس مگر
تم نے احکام و اطاعت کو شریعت جانا
خود کو سمجھا، نہ مجھے پہچانا
اور نہ ہی یہ جانا
کب محبت بھلا احکام کے سائے میں پلی
وہ حسیں، جھیل وہ کہسار
وہ دیدار کی رُت
وہ لہکتے ہوئے باغات
وہ خوابوں کے چنار
سانس چلتی ہی رہی رشتۂ جاں روٹھ گیا
وہ مہ و سال گزارے تھے جو مل کر ہم نے
آج برسوں کی رفاقت کا بھرم ٹوٹ گیا
آج پھر صبح کی پلکوں سے ٹپکتا ہے لہو
آج پھر رات کی آنکھوں میں بجھا چاند کا عکس
آج پھر سینۂ بے تاب میں اترا خنجر
اب نہ وہ شاخِ شجر
جس پہ آتا تھا کبھی دل میں نشیمن کا خیال
اب کہاں دیدۂ تر میں کسی جلوے کا سوال
اب نہ وہ چشم
کہ مائل بہ قدم بوسی ہو
اب کوئی ہاتھ بڑھے گا نہ مصافحے کے لیے
اب کوئی خواب نہ پلکوں پہ تمہارا ہوگا
اجنبی راہ کے ہم دونوں مسافر ہیں اب
اب کوئی عہدِ تعلق نہ دوبارا ہوگا

صبح مگر آئے گی

تیرگی
اونگھتی شب کے کسی کوچے سے نکل کر جب بھی
میرے احساس پہ چپکے سے اتر آتی ہے
یا فضا میں کہیں
جلتے ہوئے زخموں کی مہک

جب گزرتی ہے دبے پاؤں کبھی
بے یقینی کی کسی ڈال پہ بیٹھا ہوا گدھ
طنز آمیز نگاہوں سے مجھے گھورتا ہے، یوں
جیسے
پوچھتا ہو کہ سحر کب ہوگی؟
شب کے بے خوف اندھیروں میں کہیں تب
ایک مجبور صداقت کی طرح
دل کے شیشے میں ابھرآتا ہے نازک سا خیال
درد کی شاخ میں الجھا ہوا بیمار سا چاند
آخرِ شب کی کسی ساعت میں جب
اپنے بے خواب بسیرے کی طرف لوٹے گا
بے خطا ہاتھوں میں چہروں کی مشعلیں تھامے
آسمانوں سے گزرتا ہوا بے جسم جلوس
بھاری قدموں کے تلے چیختا سناٹا
خوابگاہوں کے دریچوں میں اتر آئے گا
اور جب
نیند کے بوجھ سے السائے بدن کے نیچے
کسمساتی ہوئی بستر کی شکن
رات کی شفقت سے لوٹے ہوئے ذہنوں کی طرح
پھر نیا بوجھ اٹھانے کے لئے دم لے گی
جس دم،
صبح آئے گی دبے پاؤں شفا لے کر
اور جب
دستِ قضا تانے ہوئے
صبح آئے گی تو ظلمت کے ٹھکانوں سے گزر جائے گی
شبنمی لمس سے کانپ اٹھے گا پھولوں کا بدن
گرد آلود سی جو دھند مرے شہر پہ چھائی ہے ابھی
صبح کی پہلی ضیا سے وہ بکھر جائے گی
ہم رہیں یا نہ رہیں/صبح مگر آئے گی

برف باری کے بعد

رگِ آسماں سے/ برستی ہوئی
یخ کی اُجلی وہ بارش/ جو اَب
تھم چکی ہے
فضا میں بھی پھیلا تجسس
زمیں، کوہسار اور شاخِ شجر کو لپیٹے
سفیدی کی چادر کے نیچے جو
اب جھانکتا ہے
کہ شائد کوئی جاگ اُٹھا ہو، کوئی کچھ تو بولے
کہیں خوابیدہ آتش
ذرا آنکھ کھولے
تھکی سانس کے زیر و بم کے مسافر
قطب پر نگاہیں جمائے کھڑے ہیں

کہ اب اُس طرف سے
ہوا کا کوئی تیز جھونکا جو آئے
خموشی کے مغرور سر کو
جو قدموں میں اپنے
جھکائے

بہت دیر سے گرم بستر میں اپنے
میں کروٹ بدلتا
اسی شوق میں منتظر ہوں
کہ مہرباں حرارت سے معمور سورج
گھنے کہر کی نرم کمبل ہٹا کر
جو اپنے بدن کی چمکتی سی چاندی اُڑاتا
لبوں پر تبسّم بکھیرے اب آئے
تو میں کھڑکیوں سے،
دروں سے

جمی برف کے اُونچے تودے ہٹا کر
نکل جاؤں باہر
کھُلے آسمانوں کے نیچے
جہاں دھوپ کے گرم گولوں کو
یخ سے دھلے گرم کپڑوں میں ملبوس بچوں پہ
میں بھی اُچھالوں
چمکتے ہوئے گرم چاندی کے جھرنوں میں
ساتھ اُن کے میں بھی نہاؤں
کہ میں منتظر ہوں
خموشی کا اُجلا سمندر
جو حدّ نظر تک رواں ہے
کہ اُس کی تہوں میں
جو اک آگ اب بھی نہاں ہے
ذرا پو پھٹے اب،
کہ لودے اُٹھے وہ

چہرے

کچھ ایسے چہرے ہیں اطراف میں مرے جن پر
نظر کے پڑتے ہی ہوتا ہے انشراح پیدا
کشش وہ ایسی کہ دیکھو تو دیکھتے رہیئے
پھر اس کے بعد بہت دیر سوچتے رہیئے
خدانے بخشا عجب رنگ دل ربائی انہیں
اور اس کے ساتھ عطا کی ہے جگ نمائی انہیں!
نظر ٹکے نہ کسی پر جلال ایسا ہے
نظر ہٹے نہ کسی سے جمال ایسا ہے
فزودہ رعب ، کوئی ہے وقار کا حامل
کسی میں دکھتیں حمیدہ صفات بھی شامل
کسی کو دیکھ کے احساس اپنے پن کا ہو
کسی سے مل کے گماں تک نہ سوئے ظن کا ہو
کسی کی آنکھوں میں روشن ہے ابتسام کی لو
کسی کے چہرے پہ ریزاں دکھے عجب سی ضو
کسی کے چہرے سے معصومیت ہویدا ہے
کہ جس کو دیکھ کے دل اپنا نرم ہو جائے
کچھ ایسے بھی کہ بڑے ہی ہیں نیک طینت جو
کہ ان کو دیکھ کے جذبات خیر در آئیں
کچھ ایسے بھی کہ شناسا سے جو لگیں ہم کو
کہ جیسے ربط ہے پہلے ہی سے کوئی ان سے
کچھ ایسے بھی ہیں کہ دکھتے بہت ہی سادہ جو
زبان کھولیں تو دریائے علم بن جائیں
پھر اس کے بعد عقیدت کی اک گھٹا چھائے
ملے ہیں وہ بھی جو ظاہر میں دنیا دار لگیں
چھپائے رکھتے ہیں وہ اپنی دینداری کو
خیال رکھتے ہیں لیکن حدِ شریعت کا
کھُلے ملے، تو کھُلے ، محترم لگے مجھ کو
کچھ ایسے بھی کہ جنہیں دیکھ رب کی یاد آئے
اور ان کی دید سے تکریم دل میں گھر کر لے!
میں جانتا ہوں یہ اوصاف سب عطائی ہیں
کہ اکتساب تو اتنا نہیں ہے بڑھ سکتا
یہ وصف وہ کہ جو پر تو ہے حسن باطن کا
بغیر اس کے یہ ممکن نہیں ہے ہو سکتا
ملا یہ جس کو تو سمجھو ملی بڑی نعمت
کہ اس کے ہونے سے ملتی ہے خلق میں عزت!

(۲)

کچھ ایسے لوگ ہیں اطراف میں جن سے
دعا، سلام ہے لیکن بھلے نہیں لگتے
کچھ ایسے بھی جو معزز بہت ہے لوگوں میں
جو ان کو دیکھو تو محسوس ہو تکدر سا

کچھ ایسے چہرے ہیں جن پر نظر کے پڑتے ہی
لگے کہ خون میں غصہ حلول ہونے لگا
کسی کو دیکھ کے نفرت سی ہونے لگتی ہے
کسی کی دید سے تلخی نظر میں در آئے
کچھ ایسے بھی کہ جو مظہر ہیں دینداری کے
جلو میں اپنے لئے ہیں تمام بے دینی
نظر میں حرص و ہوا کا غبار ہے ان کے
کہ ان پہ اٹھ کے دوبارہ نظر نہیں اٹھتی !
سفید پوشی سے جھلکے کہیں سیاہ کاری
شریف دکھنے کی کوئی کرے اداکاری
کسی کی آنکھوں میں رقصاں ہے شوق سامانی
لگے ہے بخل کا پرچم کسی کی پیشانی
کسی کو دیکھوں تو لگتا ہے افترا پرداز
ہمیشہ لگتا ہے کوئی برائی کا غماز
کوئی رکھے ہے نظر میں ہی پہلے فتنہ جو
کسی میں خیر کی دکھتی نہیں ذرا سی خو
کسی کی آنکھوں میں رنگِ عناد ہے شامل
کسی کا چہرہ تعصب کی دھوپ کا حامل
کسی کا چہرہ گناہوں کی کالی رات لگے
کسی کی کوئی بھی دل کو نہ میرے بات لگے
کسی کے رخ سے خباثت کا ہو تقطر سا
رذالتیں ہیں کسی سے عیاں تو سفلہ پن
کسی کی دید میں پیدا کرے تردّد سا
شباہتوں سے درندے کہیں ہویدا ہیں
کہیں چرندے بھی موجودگی کریں ظاہر
کہ خصلتوں مین ہیں شاید انہیں کے جیسے وہ
کسی کے رُخ سے رعونت عجب ٹپکتی ہے
کسی کو دیکھ کے وحشت سی ہونے لگتی ہے
کسی کو دیکھوں، لگے ہے لئیم اور سِفلہ
کسی کو دیکھ کے پیدا ہو بُعد کا جذبہ......

یہ روزِ ایک سے منظر یہ خلفشار مرا
کہ بڑھنے لگتا ہے سب دیکھ کر فشار مرا
میں اپنے آپ سے جاوید یہ سوال کروں
یہ آگہی ہے کہ یہ کربِ آگہی ہے، بتا ؟

جو حال سے آگاہ نہیں ہوتے ہیں
فردا کے شہنشاہ نہیں ہوتے ہیں
منزل پہ نظر رکھ کے جو کرتے ہیں سفر
رستے میں وہ گمراہ نہیں ہوتے ہیں

☆

دنیا کے حوادث سے سبق ملتا ہے
سچائی کا رستہ ادق ملتا ہے
خاموش رہوگے تو رہوگے محروم
کہرام مچانے سے حق ملتا ہے

☆

حالات مرے دل کے جھلک جاتے ہیں
آنسو مری پلکوں سے ڈھلک جاتے ہیں
لرزاں مجھے کرتی ہے ہوائے غم یوں
لبریز جو پیالے ہیں چھلک جاتے ہیں

☆

محبوب کا غم سوزِ دروں ہو جائے
آنسو بہے شدت سے تو خوں ہو جائے
کہتے ہیں جسے عشق یہ وہ جذبہ ہے
بڑھ جائے اگر حد سے جنوں ہو جائے

☆

حجت کو شکیبائی سمجھ لیتے ہیں
رنجش کو مسیحائی سمجھ لیتے ہیں
ہوتی ہے جو تنقید ہمارے فن پر
ہم اپنی پذیرائی سمجھ لیتے ہیں

سو بات کی اک بات ہے ازبر رکھنا
میزان کے پڑلے کو برابر رکھنا
ہے دنیا نہیں دائمی رہنے کی جگہ
ایمان بہر حال معطر رکھنا

☆

لہروں نے ابھی رختِ سفر باندھا ہے
منہ زور بگولوں نے بھنور باندھا ہے
دشوار ہے چلناابھی کشتی لیکر
ساحل پہ ابھی ہم نے گھر باندھا ہے

☆

بدلا ہے حقیقت میں نظارہ دیکھو
اس شہر میں مت خواب دوبارہ دیکھو
کیوں ہم پہ مہاجر کا لگا ہے ٹھپّہ
مشکل ہوا دو وقت گذارہ دیکھو

☆

طوفان اٹھا کر نہیں ہونے والا
پتھر کبھی گوہر نہیں ہونے والا
آنسو کی تو اوقات یہی ہے لوگو
قطرہ ہے سمندر نہیں ہونے والا

☆

بدلا ہے کبھی تیرا ستمگر رستہ
کاٹے گا کسی دن کوئی اژدر رستہ
پھوٹے گا زمانے کا 'بم' بھی تجھ پر
زندان سے پائے گا نہ باہر رستہ

☆

طوفاں نہ لئے ہو تو سمندر کیا ہے
دشمن جو نہیں مسند و منبر کیا ہے
رہتے ہیں گلابوں سے لپٹے کانٹے
بے مول جو آئے وہ گوہر کیا ہے

☆

تم جان لو، تلوار نہیں دے سکتا
دشمن کو کوئی بار نہیں دے سکتا
کافی ہے نثؔار جو ہے حاصل مجھ کو
اسلاف کا معیار نہیں دے سکتا

☆

سن لو میاں اکسیر بدل جائے گی
تدبیر سے تقدیر بدل جائے گی
جی جان لگاؤ تو ملے گی منزل
سستی میں تو تسخیر بدل جائے

☆

ہے فکر کا اعجاز کہ ادراکِ نظر ہے
پر چھائیاں جلنے لگیں وہ رقصِ شرر ہے
صحرا کی کڑی دھوپ میں بھی زیبِ نظر ہے
وہ عکسِ تجسس کہ جو عنوانِ سفر ہے
یہ کرب کے جھونکے یہ غم ویاس کا طوفاں
شیرازۂ احساس بکھرجانے کا ڈر ہے
کیوں آگ لگاتی ہے مرے قریۂ جاں میں
وہ شمعِ تمنّا جو سرِ طاقِ نظر ہے
یہ سبزہ و گُل پر جو دمکتے ہیں ستارے
شبنم کا عمل ہے کہ یہ سورج کا ہنر ہے
آئینے پہ رہ رہ کے بکھرتی ہے دھنک سی
اشکوں کا تسلسل ہے کہ یہ سلکِ گہر ہے
آنکھوں میں کچھ آیاتِ محبت تو ہیں ساغؔر
تفہیم کی ترسی ہوئی ہر سطر مگر ہے

ہرنفس یوں ہے خیالوں کا سفر دل کی طرف
جیسے جاتی ہو ہر اک راہ گذر دل کی طرف
روکتی ہے کوئی دلگیرسی پرچھائیں بہت
جب بھی ہوتا ہے تمنّا کا گزر دل کی طرف
شدّتِ غم سے کوئی رگ تونہیں ٹوٹ گئی
دیکھ تو اے مری خونبار نظر دل کی طرف
جانے کیا بیتی ہے ماضی کی گذرگاہوں پر
یادیں آئی تھیں ابھی خاک بسر دل کی طرف
حال کیا ہے سفرِ شب کے گزرجانے پر
تونے دیکھا ہے کبھی بادِ سحر دل کی طرف
پے بہ پے آتی رہیں آہٹیں اس کی ساغؔر
رات بھر لائی صبا اس کی خبر دل کی طرف

غزل________________________شاہین

عدم سرشت جنھیں ہم خیال کرتے ہیں
وہ رفتگاں ہمیں پابندِ حال کرتے ہیں
لہو میں تر سرِ مقتل دھمال کرتے ہیں
خوشی میں ہم تو برا اپنا حال کرتے ہیں
یہ مسخ ہوتی ہوئی یاد، جوڑتوڑ، انکار
کبھی ہم اپنے کئے پر سوال کرتے ہیں
ہر ایک یاد بغاوت کی اک علامت ہے
جو بھولتے نہیں کسبِ کمال کرتے ہیں
حصار باندھ بھی لیں ہم نواحِ جاں کے گرد
پر اپنے لوگ ہی جینا محال کرتے ہیں
کسی کا دھیان، اداسی، سرورِ گم شدگی
یہ عیش ہم مگر اب خال خال کرتے ہیں
مرض فزا ہو دوا ہی تو پھر مداوا کیا
مریض کا تو معالج خیال کرتے ہیں

بس اک تسلسلِ غم سے مناسبت ہے بہت
اِس انجمن کی ترے بعد رُکنیت ہے بہت
یہاں کہ صبح کی صورت ہے شام بدتوفیق
گرفت میں کسی لمحے کی منزلت ہے بہت
گلہ گزار سہی اپنی چشمِ حیراں سے
نہ دیکھ کر ہی گزرنے میں عافیت ہے بہت
میں اپنی ذات کے دوزخ کی شعلگی میں گم
مری تمام سرابوں سے معذرت ہے بہت
نہ ابتلا سے ہوں فارغ نہ قہرِ دنیا سے
مگر یہ حبس زدہ گھر یہ سلطنت ہے بہت
اب اس سے اور زیادہ ہے خوابِ ہستی کیا
لگاؤ جو بھی سہی تیری معرفت ہے بہت
عدالتوں میں تو کرسی نشیں ہیں شہزادے
مری سرشت میں مٹی کی اُنسیت ہے بہت
ہمیں جو خبط سمایا تو پھر خدا حافظ
ترے چمن کی ہواؤں میں غیریت ہے بہت
ہماری برف شکن کشتیاں سلامت ہیں
سرورِ عشق کو شاہین شش جہت ہے بہت

غزل ـــــــــــــــــــــــــــــ شاہین

بے شغل و مدارات چلے جاؤ گے؟ نہ نہ
آ کر بھی کب آتے ہو کہ پھر آؤ گے؟ نہ نہ
خوشبو سے ہماری ہے خوش آثار یہ مٹی
مٹی کی یہ پہچان مٹا پاؤ گے؟ نہ نہ
مانا کہ ہو پردے پہ اور اخبار میں گلپوش
گلیوں میں تم آنکھیں بھی ملا پاؤ گے؟ نہ نہ
ہو ساری قطاروں میں تمہی شیش محل کی
باقی ہے کہاں کون کہ شرماؤ گے؟ نہ نہ
سچ ہوتی ہے دو بار ہی دیوار گھڑی اب
تم بھی مرے دل! وقت سے کتراؤ گے؟ نہ نہ
ہاں، کوہِ گراں روئی کے گالوں کی طرح ہیں
دل میں بھی کوئی حشر اٹھا پاؤ گے؟ نہ نہ
نکلی نہ سرِ شاخ ابھی ایک بھی کونپل
پھر بے خبری کی ہی خبر لاؤ گے؟ نہ نہ
ملتا ہے یہاں ایک ہی موقع سرِ آغاز
پھر کاہے پسِ فیصلہ پچھتاؤ گے؟ نہ نہ
ممکن ہے نکل جاؤ کسی اور ڈگر پر
پنگھٹ پہ کہیں رک کے پلٹ آؤ گے؟ نہ نہ
سانسیں ہیں تو سانسوں کا تحفظ بھی ہے لازم
گھر آتے ہوئے ڈھال کو پھینک آؤ گے؟ نہ نہ
آنکھوں میں اترتی ہی نہیں شامِ غزل کیوں
بے نور و نوا یونہی بکھر جاؤ گے؟ نہ نہ

گماں کے بیچ شکن در شکن بناتے ہیں
بڑے یقین سے نقشِ سخن بناتے ہیں
ہے یہ جو بات ہماری بھی ہے تمہاری بھی
کب انجمن سے الگ انجمن بناتے ہیں
زمانہ اپنے کسی کام کا نہیں ٹھہرا
پھر اک ٹھکانہ بہ طرزِ کہن بناتے ہیں
ہر ایک موڑ پہ نیزہ بدست ہے دنیا
سو اب دلوں میں ہم اپنا وطن بناتے ہیں
یہ کم نہیں کوئی اندیشہ پالتے ہی نہیں
یہی بہت ہے پسینے سے تن بناتے ہیں
طویل تر ہوئی فہرست زخمِ ہستی کی
مگر وہ زخم کہ جن سے چمن بناتے ہیں
ہے آج بھی اسی آواز کی تلاش ہمیں
سماعتوں میں شمال و دکن بناتے ہیں

غزل ________________ شاہین

جاگے بھی تو غافل ہی رہے اپنے تئیں ہم
مصروف اب اتنے ہیں کہ زندہ ہی نہیں ہم

لذّت نہیں کم خاک اُڑانے کی ابھی تک
پچھتائے نہ کچھ چھوڑ کے فردوسِ بریں ہم

بارانیِ وحشت کا کرشمہ نہیں کچھ کم
پلکوں سے کبھی کاشت بھی کرتے ہیں زمیں ہم

آسیب بھلے وقتوں میں ہمسایہ تھا اپنا
ہوتے تھے کبھی کوئے ملامت کے مکیں ہم

تھا شیخ کی نظروں میں ادب کفر کی منزل
کافر کے لئے بھی نہیں اب صاحبِ دیں ہم

شاہین نہ بدلے کبھی دن رات ہمارے
دریوزہ گرِ درد، خرابات نشیں ہم

زخموں میں سمٹ گئی ہیں یادیں
اب جسم پر بٹ گئی ہیں یادیں

رتھ بان یہاں سے کون گزرا
پہیے سے چمٹ گئی ہیں یادیں

یہ رات؟ اور اتنی مختصر سی؟
ناوقت بھی گھٹ گئی ہیں یادیں

میں رہ کے بھی شہر میں، نہیں ہوں
آ آ کے لپٹ گئی ہیں یادیں

بس ایک خبر ہیں جانے والے
دفنا کے پلٹ گئی ہیں یادیں

روغن کی چمک تو آ گئی ہے
دیوار سے ہٹ گئی ہیں یادیں

ہر عکس ہوا ہر ایک معمول
ڈس ڈس کے اُلٹ گئی ہیں یادیں

بیٹھا بھی نہ تھا غبارِ جادہ
ناگاہ پلٹ گئی ہیں یادیں

اِس رُت میں اب اُن پہ بوجھ ہیں ہم
رِشتے کُھلے چُھٹ گئی ہیں یادیں

دُھلتی تو کبھی کثافتِ غم
کس گرد سے اَٹ گئی ہیں یادیں

وہ تارِ نظر تو واہمہ تھا
شاہین کیوں کٹ گئی ہیں یادیں

خوشبو ہے کہ مجھ خاکِ بسر تک نہیں آتی
اب بادِ صبا بھی مرے گھر تک نہیں آتی
ہم تھک کر نہیں بیٹھے ہیں صحرا کے سفر میں
''لوگوں کو تو تہذیب سفر تک نہیں آتی''
پک جاتے تھے پھل جس کی تمازت کے اثر سے
وہ دھوپ کسی شاخِ شجر تک نہیں آتی
کس دشت کا آخر یہ سفر مجھ کو ملا ہے
صورت کسی انساں کی نظر تک نہیں آتی
تاریکی ہے جس روز سے ذہنوں میں سمائی
دستارِ فضیلت کسی سر تک نہیں آتی
ہر روز گزرتی ہے صبا میری گلی سے
اس کے مگر آنے کی خبر تک نہیں آتی
تہذیب کے رشتے کا بھرم جس سے تھا قائم
ہم سائے کی وہ شاخِ ثمر تک نہیں آتی
سورج تو نکلتا ہے مری بستی میں ہر روز
لیکن کرن اس کی مرے در تک نہیں آتی
جو گھر سے نکل آئے تھے ہجرت کے سفر پر
ان صحرا نشینوں کی خبر تک نہیں آتی
اک عمر ہوئی جادۂ ادراک پہ چلتے
خوشبو ہے کہ منزل کی ظفرؔ تک نہیں آتی

کہاں خنجر پہ خنجر رکھ کے خنجر کاٹنے والے
ملیں گے اب پرندوں کے یہاں سر کاٹنے والے
مثالیں صبر کی ان کی کہاں ملتی ہیں دنیا میں
شکم پر باندھ کر پتھر وہ پتھر کاٹنے والے
مسلسل شور بڑھتا جا رہا ہے ذہن کے اندر
نہیں ملتے مصائب کا سمندر کاٹنے والے
یہ کس شہر پنہ میں آئے ہیں خود کو بچانے ہم
ہر اک جانب نظر آئے ہمیں سر کاٹنے والے
سنہرے خواب بھی جن سے ظفرؔ دیکھے نہیں جاتے
ہیں ایسے لوگ بھی خوابوں کا منظر کاٹنے والے

غزلیں

حیدر علی شاہ رندؔ اکبر آبادی

جس قدر کیں دل نے بزم آرائیاں
اتنی ہی بڑھتی گئیں تنہائیاں
در حقیقت آفتاب و ماہتاب
ہیں جمالِ یار کی پرچھائیاں
کہتے کہتے رک گئے وہ کوئی بات
بجتے بجتے رہ گئیں شہنائیاں
شاید آئے اب کے زنداں میں بہار
لی تو ہیں زنجیر نے انگڑائیاں
مدتوں کی قربتوں کے باوجود
دل کو نامحرم لگیں تنہائیاں
دشمنوں کی یاد تازہ کر گئیں
دوستوں کی کچھ کرم فرمائیاں
اوڑھ لیگا چادرِ ماضی بعید
تب کھلیں گی رندؔ کی اچھائیاں

فاروق راہب

سپنوں میں بھی آتے اب ہیں لہراتے بل کھاتے ناگ
جیون کے ہر موڑ پہ یارو! ملتے ہیں پھن کاڑھے ناگ
خونی جیکٹ پہن کے کیا کیا آنے لگے ہیں پیاسے ناگ
چپہ چپہ گلیوں گلیوں پھیل گئے ہیں سارے ناگ
تیکھی آنکھیں تیکھے چتون تیکھے سارے نقش و نگار
زلفوں کی ہر لٹ میں لپٹے اور چھپے ہیں کالے ناگ
من کی بات کو پوری کر کے دیکھو مداری ٹھہرا یار!
ایک اک کر کے نکلے اس کے تھیلے سے لہراتے ناگ
اِچھا دھاری ناگوں نے ہے مانو جیسا دھارا روپ
آگے پیچھے گھوم رہے ہیں آزاد اب انجانے ناگ
شہر میں اب کے دکھنے لگے ہیں کتنے سارے ایسے لوگ
ہاتھ میں دیکھو راہبؔ ان کے کیسے ہیں اٹھلاتے ناگ

جب سلگتی دھوپ کو جشنِ طرب سمجھا گیا
منجمد احساس کو حسنِ طلب سمجھا گیا

تتلیوں کے پرخراشوں سے مزین تھے اگر
پھول رُت کو کس لئے پھر بے ادب سمجھا گیا

جھوٹے لفظوں کی نمائش چند جملوں کا ہجوم
آج کے اس دور میں تازہ ادب سمجھا گیا

اب نشستوں میں پرانی وضع داری ہے کہاں
اُن ادب کی محفلوں کا کرب کب سمجھا گیا

تپتا سورج ، ریت کے اڑتے بگولے دیکھ کر
سر پہ چھائی دھوپ کا نام و نسب سمجھا گیا

ایک مٹھی دھوپ کافی تھی حرارت کے لئے
سرد موسم تجھ کو کیوں وحشت طلب سمجھا گیا

شاعری ورثہ میں آئی ہے ذکی طارق ترے
باغپت کا باغپت شہر ادب سمجھا گیا

مخالف سی ہوائیں ہوں تو منظر ٹوٹ جاتا ہے
اگر لمبی اڑانیں ہوں تو شہپر ٹوٹ جاتا ہے

نہ دینا آئینہ اپنی انا کا غیر ہاتھوں میں
ذرا سی ٹھیس لگتے ہی یہ اکثر ٹوٹ جاتا ہے

مری اوقات کیا ہے آسمانی قہر کے آگے
گہن پڑتا ہے تو سورج کا پیکر ٹوٹ جاتا ہے

لہو رشتے مرے حالات پر جب طنز کرتے ہیں
دلوں میں زہر کا نشتر اتر کر ٹوٹ جاتا ہے

شرافت کے چراغوں کو سنبھالو تیز ہے آندھی
قدم جب لڑکھڑا جائیں تو گھر بھر ٹوٹ جاتا ہے

بگڑتے شہر کا چہرہ تو دیکھو اے ذکی طارق
ہوا کی ایک سرگوشی سے منظر ٹوٹ جاتا ہے

جب ہوا سنکے حویلی میں تو ڈر چیختا ہے
اپنے ماضی کے حوالے سے کھنڈر چیختا ہے
جھلملاتے ہیں جو سیلاب زدہ سے منظر
ایسا لگتا ہے کہیں دیدۂ تر چیختا ہے
زلزلے کتنے ہی آباد زمیں میں گم ہیں
دھوپ کے قہر سے ہر برگ و شجر چیختا ہے
غم کا سناٹا تو چسپاں ہے مری روح کے ساتھ
جسم کے ساتھ یہاں کون بشر چیختا ہے
سرخیاں لکھتا رہا روز جو اخباروں میں
اُس صحافی کا قلم لکھ کے خبر چیختا ہے
روشنی آتشِ وحشت کی ہے پھیلی ہر سو
کونسا خوف ہے جس خوف سے گھر چیختا ہے
یاد آتے ہیں ذکی اپنے ہی اجداد مجھے
پاؤں جب گھر سے نکالوں تو سفر چیختا ہے

حصارِ آتشیں سے پھوٹتے ہیں
شرارے سب وہیں سے پھوٹتے ہیں
پہاڑی نخل کی قسمت تو دیکھو
جو پتھریلی زمیں سے پھوٹتے ہیں
یہ منظر جو فلک پر دیکھتے ہو
شفق کی آستیں سے پھوٹتے ہیں
جہاں پر خواب زاروں کی ہے سرحد
وہیں سے خواب سارے پھوٹتے ہیں
کہاں تک بے یقینی کا گلہ ہو
بھروسے بھی یقیں سے پھوٹتے ہیں
یہ گل بوٹے، یہ کلیاں ، رنگ خوشبو
زمیں میں تھے زمیں سے پھوٹتے ہیں
ذکی اس دور کے تیزاب منظر
ہمارے ہی قریں سے پھوٹتے ہیں

غزل ـــــــــــــــــــــــــــــ عبدالمتین جامی

دنیا کے رنگ و بو کی ضلالت میں تو رہا
تاریکیوں کی گندی سیاست میں تو رہا
سمتوں سے بے نیاز گزرتا رہا تھا نور
بے وجہ ظلمتوں کی حمایت میں تو رہا
پاسِ ادب تھا نام ترا لے نہیں سکا
یوں تو مری ہر ایک عبارت میں تو رہا
بے چہرگی نے مجھ کو کہیں کا نہیں رکھا
ہر وقت اپنی شکل و شباہت میں تو رہا
موسم بہار کا تھا فضا خوش گوار تھی
اپنی حماقتوں کی رفاقت میں تو رہا
میری نظر کی پیاس تجھے ڈھونڈتی رہی
اپنی انانیت کی عمارت میں تو رہا
ہم کو تو ساتھ ساتھ ہی رہنا تھا عمر بھر
میں شہرِ غم میں وادئ حسرت میں تو رہا
حقانیت بلاتی رہی تجھ کو دور سے
سارے غلط عمل کی اعانت میں تو رہا
جامؔی ترے مزاج سے نا آشنا ہوں میں
تخلیقیت کی فکر و ریاضت میں تو رہا

شر بن کے میں جنون کی دشنامیوں میں تھا
وہ شخص اس زمین کی رعنائیوں میں تھا
پہنچی کہاں صدا مری اس کے قریب بھی
وہ تو فصیل وقت کی اونچائیوں میں تھا
اس کی تلاش شہر کی گلیوں میں کرتے کیوں
وہ جو خود اپنی ذات کی تنہائیوں میں‌تھا
ویران رہ گزر ہی مقدر میں تھی مرے
یار اپنا انبساط کی شادابیوں میں تھا
مجھ کو جھلس رہا تھا حقائق کا آفتاب
وہ عمر بھر سکون کی پرچھائیوں میں تھا
انسان ٹکڑیوں میں بٹا کر رہا تھا جنگ
امن و اماں کا خواب مگر حاشیوں میں تھا
غارت گری کا سنگ برستا تھا ہر طرف
اک ہی نظارہ دوست کئی زاویوں میں تھا
شہرِ غمِ ثبات میں گذرے جو واقعات
اپنا بھی نام ان کے سبھی راویوں میں تھا
مجھ کو پتہ نہ تھا کہ سکوں کیا امان کیا
میں عمر بھر سفر کی پریشانیوں میں تھا
جامؔی ہے حق پرست یہی سن رہا تھا میں
لیکن قدم قدم پہ وہ دشواریوں میں تھا

غزلیں ________________ شارق عدیل

شہر کی ظلمتیں حد سے بڑھنے لگیں
پھر مری وحشتیں حد سے بڑھنے لگیں
میرے ہونٹوں کے زخموں کو سیراب کر
پیاس کی شدّتیں حد سے بڑھنے لگیں
خود پسندی ہمیں کھینچ لائی کہاں
آپسی نفرتیں حد سے بڑھنے لگیں
روح کھونے لگی اپنی تابانیاں
جسم کی چاہتیں حد سے بڑھنے لگیں
لوٹ آیا ہے کیا مجھ میں بچپن مرا
بے تکی عادتیں حد سے بڑھنے لگیں
دلکشی اپنی کھودے نہ حسنِ غزل
ندرتیں ، جدّتیں ، حد سے بڑھنے لگیں
کیوں نہ نالاں ہوں شارقؔ سے تنہائیاں
ہجر کی مدّتیں حد سے بڑھنے لگیں

فکر و فن کے چراغ روشن کر
اہلِ دل کے دماغ روشن کر
زندگی بے خودی پہ مائل ہے
میز پر اب ایاغ روشن کر
ظلمتِ شب میں ڈوبنے والے
دل کے پوشیدہ داغ روشن کر
صاحبِ عزم ہے تو منزل کے
ہر قدم پر سراغ روشن کر
اس کی یادوں کی شوخ کرنوں سے
اپنے خوابوں کا باغ روشن کر
منہ چھپالیں گی ظلمتیں شارقؔ
ذہن و دل کے چراغ روشن کر

غزلیں ________________ خالد عبادی

تیغ و شمشیر کے مزے لوٹو
ان لٹیروں کو خاص کے لوٹو
تم نہ بیٹھو تو بیٹھتا ہے جی
اور بیٹھو تو تہہ کدے لوٹو
اس سے پہلے غروب ہو سورج
کا ملو ڈوب ڈوب کے لوٹو
ورنہ پھر صرفۂ تحصل ہے
اس سے پہلے کہ غل مچے لوٹو
پاس ہے تمغۂ سپاہت تو
دن دہاڑے سرِ رہے لوٹو
وقت رہتا نہیں سدا یکساں
اب کھلی چھوٹ ہے جسے لوٹو

رات تاریک تر چراغ نہیں
روشنی کا مجھے دماغ نہیں
زہرسے پر مرا ایاغ نہیں
اس لئے دل بھی باغ باغ نہیں
جستجو میں جو اس کی نکلے ہم
اپنا پا یا کہیں سراغ نہیں
ظلم کی داستان ہے جھوٹی
جسم پر تو ہمارے داغ نہیں
ایک آتی ہے ایک جاتی ہے
الجھنوں سے مجھے فراغ نہیں
عہدہ بر آ ہوا سنا کے غزل
مجھ پہ کچھ اور جز بلاغ نہیں

غزلیں ـــــــــــــــــــــــ خالدعبادی

اُمید سے زیادہ ملے آرزو سے کم
بیٹھے بٹھائے خوب ملے جستجو سے کم
تو بن رہا ہے باتیں بنا کے تو خوب بن
بنی سے بنی ہے بنی خوب رو سے کم
جھپکی تو اک نظر سی ہوئی وجد میں نظیر
توحید کررہاہوں تجھے وصل خو سے کم
جانے کی بات آئی تو پھر جان پڑگئی
کس کو سمجھ رہا تھا میں کس کم سبو سے کم
دیکھے کوئی تو جیسے مصور تمام ہو
تصویر ہو چکی ہے تری رنج مو سے کم
آزاد گی میں لطفِ قفس کی بہار ہے
ترویج کررہا ہوں کسی گل نمو سے کم

چشم فلک بساط میں کیا تھا کہو کہو
دل گفتنی کلام سے باہر ہے جو کہو
بے گفتگو رہے نہ خموشی کیا وقار
یعنی وہی کسی کو پکارو سنو کہو
دو چار دن نوازش بر حق رہا نصیب
سوحال اب یہ ہے کہ تمہی دلبرو کہو
یا خاک وخوں میں لوٹتے رہنا کمال ہے
یا پھر سے اس جہان میں ایسا نہ ہوکہو
ایسے میں آئینہ بہ تصور ہوئے بہم
جو کہہ سکو تو پہلے مری گو مگو کہو

غزلیں ______________ ساجد حمید

وصل کی رات مختصر اتنی
ہائے برسات مختصر اتنی
کیوں سمجھ میں کبھی نہیں آئی
زیست کی بات مختصر اتنی
پھیل کر ذہن و دل پہ چھا گئی ہے
وہ جو تھی ذات مختصر اتنی
صرف اتنے سے درد مٹھی بھر
غم کی سوغات مختصر اتنی
ہیں ادھورے پڑے بہت سے کام
عمر بے ہات مختصر اتنی
میں نے ساجدؔ تجھے دکھائی ہے
رود جذبات مختصر اتنی

گلستاں دھیرے دھیرے زعفرانی ہو رہا ہے
یہ قصہ تھا زمیں کا آسمانی ہو رہا ہے
نکل آئے گا تھوڑی دیر میں آنکھوں کے رستے
جو تودہ برف کا دل میں تھا پانی ہو رہا ہے
سلیقے سے جو لفظوں میں نہ ڈھل پایا تخیل
تصور ساز لمحہ آنجہانی ہو رہا ہے
مرے ہمزاد کو جس نے کیا ہے غرق دریا
وہ چہرا یاد آنکھوں کو زبانی ہو رہا ہے
جتن لاکھوں کئے کیسے ہوا پھر راز افشا
جو تھا روپوش مجھ میں پانی پانی ہو رہا ہے
بہت تاریک تھا تنہائیوں کی خاک اوڑھے
تری یادوں سے کمرہ ضو فشانی ہو رہا ہے
جسے ساجدؔ میں لاثانی بنانا چاہتا تھا
وہ لمحہ جانے کیسے نقش ثانی ہو رہا ہے

جو مجھ میں عالم سرور سا ہے
تمہاری خوشبو کے نور سا ہے
بہت اکیلا میں پڑ گیا ہوں
خدا بھی اب دور دور سا ہے
مری نگاہیں تو ہیں مطہر
یہ ذہن میں کیوں فتور سا ہے
میں خود کو قابو میں رکھ تو لونگا
یہ دل ذرا ناصبور سا ہے
بلا رہا ہے بہت دنوں سے
وہ ایک ٹیلہ جو طور سا ہے
چلو کہ ڈالیں یہیں پڑاؤ
تھکن سے تن چور چور سا ہے
ہے اس کی آواز کوئلوں سی
اور ناچتا بھی میور سا ہے
جو ایک جرعہ پلایا اس نے
ذرا شراب طہور سا ہے
ہے چال اس کی زمینی ساجدؔ
پہ ناک نقشہ تو حور سا ہے

اسی لئے تو کہا تھا سنبھل بہکنا نہیں
یہ وہ جگہ ہے جہاں کوئی میرا اپنا نہیں
تمام رنگ اداسی کے بھر دئے میں نے
کہ کینوس پہ کوئی خانہ اب برہنہ نہیں
وہ ایک آندھی جو مسمار کر گئی سب کچھ
سناؤں گا وہی قصہ مگر بھڑکنا نہیں
جہاں پہ شل ہوئی جاتی ہیں قوتیں ساری
اب ایسے شہر تنزل میں پاؤں رکھنا نہیں
نکل پڑے ہو اگر، کیوں ہے خوف رسوائی
وہ دشت ہی کیا، جہاں عمر اک بھٹکنا نہیں
بکھرنے میں جو ہیں پوشیدہ لذتیں ساجدؔ
میں کیا بتاؤں بس اتنا مجھے سمٹنا نہیں

درد ہے چارہ ہو گیا ہے اب
دل بھی بنجارا ہو گیا ہے اب
عشق تو ہی سنبھال لے خود کو
حسن آوارہ ہو گیا ہے اب
سوچنا دل پہ ہاتھ رکھ کر تم
کون ناکارہ ہو گیا ہے اب
دل ترے جیتنے کی خواہش میں
کس قدر ہارا ہوگیا ہے اب
جس میں رکھّی ہے لاش یادوں کی
دل وہ گہوارہ ہو گیا ہے اب
جس سے بھرتے تھے روز پانی تم
وہ کنواں کھارا ہوگیا ہے اب
رونقیں اب کہاں رہیں وارثؔ
گھر کا بٹوارا ہو گیا ہے اب

جو اپنی فکر کی گہرائیوں سے ملتا رہا
وہ اپنے آپ ہی اونچائیوں سے ملتا رہا
وہ کیفیت مری اب تک سمجھ نہیں پایا
جو عمر بھر مری پرچھائیوں سے ملتا رہا
مری خوشی کا سبب ہے تو صرف اتنا ہے
میں درد پال کے شہنائیوں سے ملتا رہا
مری حیات کا ہر لمحہ بزم تھا لیکن
میں اپنے آپ کی تنہائیوں سے ملتا رہا
تبھی تو ہو گئے میرے خلاف بھائی مرے
مرا حریف مرے بھائیوں سے ملتا رہا
شفق سے رکھّی ہے میں نے گلاب کی نسبت
تمام عمر ہی رعنائیوں سے ملتا رہا
ہے ایسے موڑ پہ وارثؔ محبتوں کا سفر
جہاں پہ صرف میں رسوائیوں سے ملتا رہا

یوں ترے ہجر میں آ جاتے ہیں اکثر آنسو
ہو گئے جیسے ان آنکھوں کا مقدّر آنسو

کبھی سوکھے ہوئے دامن کو بھگو دیتے ہیں
کبھی آنکھوں کو بنا دیتے ہیں پتھر آنسو

میرے ہونٹوں پہ سجی رہتی ہے ہر وقت ہنسی
یہ الگ بات کہ ہیں میرا مقدّر آنسو

بن گئے ہوتے کسی آنکھ کا موتی اب تک
کاش! منقار میں لے جاتے کبوتر آنسو

میرے سینے پہ بڑی شان سے کھیلا لیکن
اور پھر خود ہی اگلنے لگا خنجر آنسو

خواب جتنے بھی تھے غرقاب ہوئے جاتے ہیں
اُنکی آنکھوں میں بلا کے ہیں سمندر آنسو

پھر ہواؤں میں ہیں اثرات نمی کے وارثؔ
پھر بہاتا ہے کہیں کوئی قلندر آنسو

ایک پختہ یقین تک ہی رہے
مر کے بھی ہم زمین تک ہی رہے

جن کو دل میں اترنا چاہئے تھا
وہ مری آستین تک ہی رہے

نیند اُلجھی ہوئی تھی سانپوں میں
خواب جتنے تھے بین تک ہی رہے

سر پہ اب سج رہے ہیں تاج اُنکے
کل جو کوڑی کے تین تک ہی رہے

اُنکی تاریخ بھی رقم ہوگی
عمر بھر جو مشین تک ہی رہے

وہ جو انپڑھ تھے ہو گئے فاضل
اور ہم قاف شین تک ہی رہے

لوگ وارث بنا رہے تھے ہمیں
ہم تو بس اپنے دین تک ہی رہے

فراق و ہجر کی سرحد کو پار کرتا رہا
میں ساری عمر ترا انتظار کرتا رہا
دیا نہ آج تک اس نے مسافتوں کا بدل
مگر میں راہ وہی اختیار کرتا رہا
مرے رفیق تری جستجو کا ہر لمحہ
اذیتوں سے مجھے ہمکنار کرتا رہا
وہ جس کے گھر کبھی کلکاریاں نہیں گونجی
تمام عمر کھلونوں سے پیار کرتا رہا
میں اپنے گاؤں میں بیٹھا نہیں سکوں سے کبھی
تمہارا شہر مجھے بے قرار کرتا رہا
میں شہر جاں کا محافظ جسے سمجھتا تھا
سلوک اس کا مجھے شرمشار کرتا رہا
میں سادہ لوح رفوگر جسے سمجھتا تھا
ردائے جاں کو وہی تار تار کرتا رہا

غبار بن کے عمل کا زیاں چمکتا ہے
کہ فصل گل میں بھی رنگِ خزاں چمکتا ہے
ابھی تو لگتے ہیں جگنو بھی آفتاب مجھے
ہے اس کا ساتھ تو سارا جہاں چمکتا ہے
بچھی ہے دھند کی چادر زمیں سے تا بہ فلک
یقین جھلسا ہوا ہے گماں چمکتا ہے
عجیب آگ تھی جس میں جلے تھے خواب مرے
مری نگاہ میں اب تک دھواں چمکتا ہے
اندھیری رات میں اکثر یہ سوچتا ہوں میں
مرے نصیب کا تارا کہاں چمکتا ہے
جہاں میں گزرے ہیں ایسے بھی لوگ اے انور
نشان جن کا کراں تا کراں چمکتا ہے

بے چین روح جسم سے پرواز کر گئی
اچھا ہوا کہ سر سے قیامت گزر گئی

مٹھی جو بند تھی تو کوئی پوچھتا نہ تھا
مٹھی کھلی تو شہر میں ہنگامہ کر گئی

اس دورِ اِرتقا میں عجب معجزہ ہوا
انسان زندہ رہ گیا تہذیب مر گئی

جب بھی کسی کے جسم سے چھینی گئی رِدا
اک موج خوں کی آنکھ میں آ کر ٹھہر گئی

اس دورِ رو سیاہ میں سب کے مکان سے
انسانیت کے نام کی تختی اتر گئی

انورؔ ترا بکھرنا کہاں رائیگاں گیا
بپھری ہوئی ہوا کی طبیعت جو بھر گئی

تم سے بچھڑ کے خواب سے رشتہ نہیں رہا
آنکھیں رہیں پہ آنکھوں میں چہرہ نہیں رہا

آتے نہیں قریب رفیقوں کے قافلے
جب سے ہمارے پیڑ میں سایہ نہیں رہا

اک سلسلہ ہے ٹوٹتے رشتوں کا دور تک
فرصت ملی تو سوچیں گے کیا کیا نہیں رہا

گذری ہے ساری عمر مری ریگذار میں
وابستہ مجھ سے کوئی بھی دریا نہیں رہا

شاخیں گھنی ہوں کیسے مرے اعتبار کی
اپنے لہو کا رنگ بھی اپنا نہیں رہا

انور وہ شخص سب کی نگاہوں میں ہیچ ہے
جس کو خیال اپنی انا کا نہیں رہا

یہ کیا ہوا کہ اندھیروں کی ہوگئی یلغار
ابھی تو دیکھے تھے آثار صبح کے میں نے

جواب میں مری جانب ہی دکھتی رہی بس
سوال جب بھی کیا اپنی شام سے میں نے

جو تیرے لمس کی خوشبو چھپائے تھے خود میں
حوالے کردئے دریا کے وہ گھڑے میں نے

تو خواب دیکھتا رہتا تھا سو یہ میں نے کیا
بچھائے راہ میں کانٹے ترے لئے میں نے

خبر یہ تھی کہ مرا ماہتاب آئے گا
سجادیے تھے ستاروں سے راستے میں نے

جو وجہِ فصل ہوئے میرے اس کے بیچ کبھی
تو نورؔ خود سے کیے ختم رابطے میں نے

مٹھی میں قید کرنے لگا ہوں ہوا کو میں
دو گام اب سمجھتا ہوں شہرِ سبا کو میں

انجم سے، ماہتاب سے، جگنو سے، مہر سے
ضوبار دیکھتا ہوں ترے نقش پا کو میں

ہر چند ہفت خواں سے گزرنا پڑے مجھے
دیکھوں گا آج عکسِ پسِ آئینہ کو میں

واقف ہے خوب ان کے ضرر سے مرا شعور
آنے نہ دوں گا پاس کسی تسمہ پا کو میں

اے نورؔ! کچھ ہوا نہ خلا میں اچھال کر
اب پھینکتا ہوں جھیل میں سنگِ نوا کو میں

سب ندی نالے تو زہریلے ہوئے
کس لئے صحرا مرے پیاسے ہوئے

سارے منظر ہیں مرے دیکھے ہوئے
کون پرکھے راستے پرکھے ہوئے

سر پہ سورج درپئے آزار تھا
پاؤں میں تھے راستے تپتے ہوئے

پائی ہے سچ بولنے کی یہ سزا
بند مجھ پر سارے دروازے ہوئے

بے خبر تھے قافلے اس بات سے
حادثے تھے راہ میں بیٹھے ہوئے

ایسے نازک راستے بھی ہیں کئی
ڈر لگے گا پاؤں بھی رکھتے ہوئے

قتل ہو کر ہم ہی قاتل بن گئے
قتل کرکے بھی وہ بیچارے ہوئے

وہ زمیں سونا اگلتی تھی کبھی
جس سے جاری خوں کے فوارے ہوئے

جانی پہچانی سنی دستک تو پھر
نورؔ جھوٹے خواب بھی سچے ہوئے

جلا کے گام بہ گام آس کے دئے میں نے
غرور شب کے کئے بند راستے میں نے

مرے خلاف گئے کام کچھ نہ آئے مرے
کیے تھے اپنے لئے خود جو فیصلے میں نے

ہوں کامیاب کہ ناکام دیکھئے کیا ہو
پیامِ شوق کے بھیجے ہیں قافلے میں نے

ترے خیال نے سونے نہیں دیا مجھ کو
سو ترے نام لکھے سارے رتجگے میں نے

ہوا سے کہہ دو اٹھادے نقاب چہروں سے
کئے ہیں نصب سرِ راہ آئینے میں نے

غزل ____________ گلفام صدیقی

صرف اس کا ہی نام چل رہا ہے
ہم فقیروں کا کام چل رہا ہے
اچھے اچھے نہ چل سکے جس پر
دیکھ تیرا غلام چل رہا ہے
عشق کی نیند سے نہیں بنتی
نصف شب کا قیام چل رہا ہے
تھک گئے ہیں قدم تو کیا غم ہے
دل بصد احترام چل رہا ہے
اس کی تاثیر ہی کچھ ایسی ہے
اب بھی حسنِ کلام چل رہا ہے
تم شریعت کے ہو امیں تو پھر
کیوں یہودی نظام چل رہا ہے
سست گامی کو ترک کر دے تُو
ہر کوئی تیز گام چل رہا ہے
یہ جو دنیا ہے، ایسا لگتا ہے
قصہء ناتمام چل رہا ہے
وہ حقیقت سے آشنا ہی نہیں
وہ تو خوابوں کو تھام، چل رہا ہے

رخِ حبیب کے جلوے مچل کے دیکھیں گے
ہم ایک روز کرشمے اجل کے دیکھیں گے
ابھی وہ جن کو نگاہیں نہ دیکھ پاتی ہیں
بدن کی قید سے باہر نکل کے دیکھیں گے
ہے شرط یہ کہ خلیلی مزاج پیدا ہو
تمام شعلے، شرارے اچھل کے دیکھیں گے
ہمیں یقیں ہے کہ وہ ڈوبنے نہیں دے گا
ہم اس لیئے تو سمندر پہ چل کے دیکھیں گے
فرشتے رشک سے دیکھیں گے آسمانوں سے
ترے معیار کے سانچے میں ڈھل کے دیکھیں گے
ہمارے آئینہ خانے میں آیئے اک دن
حضور آپ مناظر بھی کل کے دیکھیں گے
ذرا سی دیر میں مَیں لُوٹ لوں گا محفل کو
تمام لوگ کرشمے غزل کے دیکھیں گے
یہ شرط ہے کہ ہو نظروں میں شانِ دیرینہ
تری نظر کو نظارے مچل کے دیکھیں گے

وصل کی رات ہے بانہوں میں سمٹ آئی ہے
میں نے دیکھا تو یہ پایا مری تنہائی ہے
کون صیّاد ہے ؟ کیسی یہ ستم آرائی
چاندنی رات میں زخموں سے ٹپکتے آنسوں
بات پھیلے گی مگر چاند کی رسوائی ہے
خود سے ملتا ہوں تو لگتا ہے شناسا ہوں میں
یہ شناسائی بھی کیا خوب شناسائی ہے
عمر بھر ساتھ چلا دشتِ جنوں میں کوئی
اب یہ کہتا ہے محض بادیہ پیمائی ہے
چشم نم ہے یوں صبا دیکھ کے گلچیں کا ستم
باغ تو باغ بہاروں پہ قضا آئی ہے
کس سے پرویزؔ صلہ اپنی وفا کا مانگوں
غیرتِ عشق یہاں آج تماشائی ہے

دیارِ عشق میں یارو کوئی گلہ نہیں کرتے
اگر گلہ ذرا بھی ہے تو فاصلہ نہیں کرتے
تو بے وفا نہیں ہے یہ یقین دل مجھے بھی ہے
مرے رقیب سے چھپ کر مگر ملا نہیں کرتے
بہک رہا ہوں میں ساقی تمہاری مے پی پی کر
مرے بھلے برے کا اب یوں فیصلہ نہیں کرتے
نظر چھپا نہیں سکتی خمار عشق کو ہرگز
کسی کی آرزو ہے، عشق برملا نہیں کرتے
وفا کی راہ میں دیکھا جفا کا کھیل ہی عالمؔ
وفا یوں چھوڑ دی ہم نے یہ مشغلہ نہیں کرتے

غالب کا ایک شعر

(غالب کی روح سے معذرت کے ساتھ)

ممتاز انور، کولکاتا

اردو کے معرض وجود میں آنے کے بعد جب اسے دفتری زبان کا حق حاصل ہوا تو لوگ بلاتفریق مذہب وملت اس کے سیکھنے، جاننے اور سمجھنے میں دل جمعی سے دلچسپی لینے لگےلیکن دفتری اختیارات ختم ہوتے ہی یہ سلسلہ سمٹ کر فقط محبان اردو تک رہ گیا اردو کا ہر طالب علم جانتا ہے کہ مغل نے اردو دی۔ اردو نے مشاعرہ دیا اور مشاعرے نے اردو کو مقبولیت دی۔ آج عالم یہ ہے کہ غیر اردوداں طبقہ بھی مشاعرہ سننے اور پڑھنے میں بڑے شوق سے لگا ہوا ہے۔ اب اس کے حاشئے پر مطلب خواہ کچھ بھی ہو لیکن اردو نے اپنے دامن میں انہیں بھی پناہ دی جو اس کی تہذیب سے قطعی ناواقف رہے میرے پاس ایک دن ایک نوجوان مرزا غالب کا مشہور یہ شعر لے کر حاضر ہوا۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

میں نے سوال کیا یہ شعر تم نے کہاں سے نوٹ کیا تو اس نے بتایا کہ ''میں شاعر ہوں ویسے تو میں اردو نہیں جانتا لیکن اردو کے مشاعرے میں شامل ہوتا ہوں۔ یہ شعر میں نے مشاعرے کے ناظم سے سنا ہے میں اسے سمجھ نہ سکا چونکہ اس میں ''گالیاں'' لفظ ہے اس لئے سمجھنے کی ''خواہش ہوئی کہ شاید کسی کو گالی دینے میں یہ شعر کام آجائے مجھے اس کے ترتیب جملوں اور اس کے لہجے پر جھلاہٹ ہوئی لیکن اردو کی ہمہ گیری پر سینہ چوڑا ہو گیا۔ اور میں نے زیر لب مسکرا دیا اور کہا کہ ''یہ شعر اردو کے مشہور شاعر غالب کا ہے، جانتے ہو غالب کون تھے؟ اس نے قدرے سکون سے کہا بھارت بھوشن کیا......؟ میں نے منہ پھاڑ کر کہا۔

اس نے قدرے اطمیان سے سمجھانے کی کوشش کی۔

ہاں اسے سہراب مودی نے ۱۹۵۴ میں بنایا تھا۔ ستیاناس ہو۔ میں فلمی کردار کی بابت نہیں کہہ رہا ہوں پھر اس نے فوراً دوسرا موڑ لیتے ہوئے کہا ''اوہو! آپ نئے غالب کی بات کر رہے ہیں تو یہ بھی مجھے پتہ ہے نصیر الدین شاہ، جو چھوٹے پردے کے لئے تھا جسے گلزار نے تیار کیا تھا۔ میں تو چونک کر رہ گیا کہ اردو مشاعروں

میں اب کیسے کیسے گنوار صفت لوگ شعرا کی صف میں سستی شہرت اور آمدنی کے نام پر حاضر ہونے لگے ہیں۔ بیڑہ غرق ہو ایسے مشاعروں کا۔ پھر اچانک خوشی ہوئی کہ چلو ایک مشاعرے نے اس نوجوان کو غالب جیسے نابغۂ روزگار شاعر سے متعلق دلچسپی پیدا کرائی اب میری ذمہ داری ہے کہ اس سلسلے میں جانکاری فراہم کروں۔

میں نے اس نوجوان کو اشارے سے سامنے لگی کرسی پر بیٹھنے کو کہا اور طاق سے ''دیوان غالب'' نکال کر کے سرورق پر غالب کی نمایاں تصویر دکھاتے ہوئے پوچھا بتاؤ یہ کون ہیں؟

اس نے تصویر غور سے دیکھی اور فکر انگیز انداز میں کہا ''یہ تو کسی مولانا یا کسی مؤذن کی تصویر لگتی ہے'' اس کے جواب پر میں نے قہقہہ لگا کر بتایا ''برادر عزیز یہی غالب ہیں' شاعر غالب اور جنھیں تم نے فلم یا ٹی وی پر دیکھا ہے وہ اداکار ہیں جنھوں نے اسی غالب کا کردار پیش کیا ہے۔ وہ فرضی غالب تھے اور یہ حقیقی غالب۔'' یہ ہیں جو اردو اور فارسی کے بڑے شاعر گزرے ہیں میں بولتا رہا اور وہ کتاب پر غالب کی تصویر کا آنکھیں پھاڑ کر جائزہ لیتا رہا۔

''لیکن میں نے سنا ہے کہ غالب بہت بڑے پیکّڑ تھے''

''پیکّڑ نہ کہو، مےنوش کہو، مےنوش''

''بات تو ایک ہی ہے انکل''

یہ لفظ انکل سنتے ہی جیسے میرے تن بدن میں آگ لگ گئی کہ عجب وقت آیا ہے جو بھی دو چار سال کا چھوٹا ملا جھٹ سے انکل بول اٹھا اور تو اور لگتا ہے لڑکیاں انکل بول کر چٹکی لیتی ہیں جبکہ مجھ سے بڑا یا ہم عمر فلم ایکٹر سلمان خان کو اکثر نوجوان سلمان بھائی اور جوان لڑکیاں پرپوز کرتی پھرتی ہیں۔ ہائے رے قسمت ، میں اس سوچ میں تھا اور وہ نوجوان بولتا رہا لیکن یہ مولانا کی طرز کا شاعر اور شراب کی عادت، بات کچھ ہضم نہیں ہوئی۔

اب تو اس جگہ میں بھی لا جواب ہونے کو آیا لہٰذا موقع غنیمت جان کر اسے پیش کیے گئے شعر کی جناب گھسیٹا۔

کتنے شیریں ہیں تیرے لب کہ رقیب
گالیاں کھا کے بے مزا نہ ہوا

پہلے لفظوں کے مطلب سمجھو، شیریں یعنی میٹھا، لب ہونٹ اور رقیب یعنی دشمنی لیکن اردو شاعری میں رقیب قاصد بھی ہوتا ہے یا وہ جو عاشقوں میں ہو مگر حقیقتاً عشق سے بے بہرہ ہو اس نے سنتے ہی ٹوکا، قاصد بولے تو؟

خط کالا نے اور لے جانے والا‘‘ میں نے یوں ہی سا کہہ دیا‘‘ تو اس نے جملہ آگے بڑھایا او ہو، عاشق و معشوق کا چمچہ میں نے مسکرا کر پھر بات آگے بڑھائی۔ اب شعر کا مطلب سمجھو۔ شاعر معشوق سے کہتا ہے کہ تیرے ہونٹ کتنے میٹھے ہیں کہ رقیب نے گالیاں کھائیں وہ بے مزانہ ہوا یعنی اسے وہ گالیاں بری نہ لگیں۔ لیکن انکل عاشق کو پتہ کیسے چلا کہ معشوق کے ہونٹ میٹھے ہیں‘‘؟ میں نے جواب دیا شاعری تو خیالی چیز کا نام ہے اور اردو ہی نہیں ہر زبان میں شاعری کا یہی پیمانہ ہے۔ چلئے آپ ہی کی بات سہی میں نے مان لیا کہ معشوق کے ہونٹ میٹھے ہیں اور میٹھے ہونٹ سے اس نے گالیاں دیں لیکن یہ کیسے سمجھا جائے کہ اس نے گالیوں میں کیا کہا اور کونسی کونسی گالیاں دیں کیونکہ یہاں جب گالیاں درج ہیں تو ظاہر ہے ایک گالی تو اس نے دی نہیں ہوگی اور گالیوں میں تو ماں بہن کی گالی سن کر کوئی بھی قابو سے باہر ہو سکتا ہے۔ چاہے معشوق ہو یا اس کا باپ بات تو ٹھیک ہے لیکن معشوق سے ادب کے دائرے میں رہ کر گالیوں کی امید کی جانی چاہئے۔ میں نے اپنی خفت مٹاتے ہوئے کہا انکل وہ تو ٹھیک ہے مگر گالیوں میں تہذیب اور ادب کی گنجائش کہاں؟‘‘ گالیاں تو گالیاں ہیں۔ اب مجھے غصہ آنے لگا۔ میں نے جھڑک کر کہا، اجی سنو بھی گالیاں دی ہیں غالب کے معشوق نے اور اپنے رقیب کو وہ بھی غالب کے سامنے تو ایسے میں غالب سمجھیں رقیب سمجھے اور اب یہ تینوں تو ہیں نہیں کیوں مجھے جھنجھٹ میں ڈال رہے ہو کہ میں بتاؤں گالیاں کون سی تھیں۔ جو شعر کا مطلب تھا بتا دیا سمجھے مطلب یہ ہی تو سمجھ میں نہیں آیا کہ غالب جب معشوق سے ڈائریکٹ بات کر رہے ہیں تو یہ رقیب وہاں کیا کر رہا ہے؟ جھک مار رہا ہے سمجھے یہ رقیب بالکل واہیات آدمی ہے اچھا ہوتا تو رقیب کہلاتا کیا؟ لیکن انکل ابھی آپ نے بتایا کہ رقیب کی گنتی عاشقوں میں ہوتی ہے تو کیا‘‘ کہتے ہیں قاصد ہاں قاصد بھی ہو سکتا ہے تو معشوق یہ جانتے ہوئے بھی اسے گالیاں دے یہ اچھی بات ہے کیا؟ تو کیا کرے تم ہی بتاؤ؟ اسے تنبیہ کی جانی چاہئے اس کے گھر والوں سے شکایت کی جانی چاہئے۔

’’پھر بھی عادت سے باز نہ آئے تو؟‘‘

تب تو الگ معاملہ ہے‘‘

’’اسی لئے تو غالب نے یہ اشارہ شعر کی شکل میں دیا ہے‘‘

انکل ! مانا کہ رقیب گھٹیا ہے بے ہودہ ہے بدتمیز ہے مگر یہ غالب کا بھی چال چلن ٹھیک نہیں ایک تو بوڑھے اور داڑھی رکھ کر شراب پیتے ہیں دوسرے شاعری کے نام پر گالم گلوچ کی بات کرتے ہیں اب تو میں بے قابو ہو کر بول اٹھا‘‘ اچھا تو تم میرے پاس غالب کو کوسنے آئے ہو۔

’’نہیں نہیں میں تو...... یونہی‘‘

یونہی...... کیا یونہی؟‘‘

سنو! صدیوں میں ایک غالب پیدا ہوتا ہے۔ان کی فکر کی پرواز اور شاعری کی تہہ داری سے مطلب نکالنا آسان نہیں زمانہ بیت گیا لیکن آج بھی غالب کی شاعری تحقیق طلب ہے۔آپ تو خواہ مخواہ بگڑنے لگے۔ میرے کہنے کا مطلب ہے کہ غالب نے یہاں جو ترکیب استعمال کی ہے کہ گالیاں کھا کے بے مزانہ ہوا یہ کہاں تک ٹھیک ہے۔گالیاں بھی کیا کھائی جاتی ہیں۔اگر مار کھا کے لات کھا کے جوتے کھا کے گھونسے کھا کے یا دوسرے کوئی کھائی جانے والی چیز کھا کے کہتے تو الگ بات تھی یہاں اگر گالیاں سن کے بے مزانہ ہوا کہا گیا ہوتا تو بات ماننے کی بھی ہوتی۔ابھی وہ کہہ ہی رہا تھا کہ میں نے اس کی بات کاٹ دی اور گرج اٹھا خاموش! اب آگے ایک لفظ بھی کہنے کی ہمت نہ کرنا۔وہ رقیب غالب کے زمانے کا ہے اب اسے غالب گالیاں کھلائیں یا گالیاں سنائیں، سمجھے۔چلو اٹھو جاؤں یہاں سے نکلو۔فوراً نکلو۔وہ روہانسا ہو کر چلا تو گیا لیکن میں بہت دیر تک اس ادھیڑ بن میں تھا کہ غالب نے گالیاں کھا کے تو درست لکھا ہے پھر میں اسے سمجھا کیوں نہ سکا اور اب بھی تنہائی میں یہ سوچتا ہوں کہ اردو سے نابلد کوئی بھی شخص اگر اہلِ زبان پر تنقید کرے یا زبان کے کسی نکتے کو سمجھنا چاہے تو اس پر بھپرنا اچھا ہے یا اسے ہر زاویے سے سمجھا کر اطمینان دلانا اچھا ہے......!!

گدھے

قیوم بدر

گدھے اا پنی گونا گوں خوبیوں کی بنا پر جانوروں میں افضل ہیں۔ بہت سے معاملات میں انسانوں پر بھی بھاری ہیں۔اس کا ثبوت یہ ہے کہ ہم عام طور پر ایک دوسرے کو گدھے سے مماثل قرار دیتے ہیں۔مثلاً تم اوّل درجے کے گدھے ہواگر کسی گدھے کوانسانوں سے تشبیہ دی جائے تو وہ نہ صرف اسے اپنی توہین سمجھے گا بلکہ شرم سے پانی پانی ہو جائے گا۔

گدھے کی صفات میں صبر خصوصاً ضبط اوّلیت کا درجہ رکھتی ہے انسانوں کے اندر یہ صفات آجائیں تو اس کا کریڈیٹ گدھے کے سرہی جاتا ہے۔

گدھے کے سر پر سینگ نہیں ہوتا جس کے سبب اسے معصوم جانور سمجھا جاتا ہے۔سینگ توانسانوں کے سر ہر بھی نہیں ہوتا لیکن وہ اپنی فطرت کے عین مطابق سینگ مارنے سے باز نہیں آتے۔

گدھے دھوبیوں کے لئے بہت کارآمد ہیں کہ ان کے بغیر ان کا تصور ممکن نہیں کرشن چندر کی شہرت میں بھی گدھے کا بہت بڑا ہاتھ ہے۔'' ایک گدھے کی سرگذشت'' ''گدھے کی واپسی' ، 'اورایک گدھا نیفے میں'ان کی مشہور کتابیں ہیں جنہیں پڑھے بغیر قلمکار ہونا ممکن نہیں ظاہر ہے ایسے قلمکار سے متعلق یہی کہا جائے گا کہ فلاں زندگی بھر قلم چلاتا پھر بھی گدھے کا گدھے رہا۔

کچھ دن قبل میں جس محلّے میں رہتا تھا وہاں دھوبیوں کی خاصی تعداد تھی ظاہر ہے ان کے ساتھ گدھے بھی ہوں گے ایک دن مشہور ادیب شوکت عظیم مجھ سے ملنے آئے

آس پاس اگل بغل گدھوں کو دیکھ کر کہا .... یہاں گدھے بہت ہیں۔

میں نے کہا............ ہاں کچھ باہر سے بھی آجاتے ہیں۔

مشہور شاعر پروفیسر عاصم شہنواز شبلؔی نے ایک مشاعرے میں نقابت کے دوران ایک واقعہ سنایا کہ ایک دیہاتی گنوار اپنے گھوڑے پر بیٹھ شہر سے گذر رہا تھا۔اس کی نظر ایک اشتہار پر پڑی۔

یہاں ڈگریاں بکتی ہیں

دیہاتی گنوار شخص نے ایک موٹی رقم دے کر ایک بڑی ڈگری خرید لی تھوڑی دور جانے کے بعد اسے

خیال آیا کیوں نہ ایک ڈگری اپنے گھوڑے کے لئے بھی خریدلوں لہٰذا

کاؤنٹر پر اپنا مدعا بیان کیا کاؤنٹر کلرک نے کہا...... معاف کیجئے گا یہاں ڈگریاں گدھوں کو ملتی ہیں گھوڑوں کو نہیں۔

شاید یہی سبب ہے کہ اب اصل اور نقل کی پہچان مٹتی جا رہی ہے۔

عام طور پر کسی کو ذلیل کرنا مقصود ہو تو اسے گدھے پر بیٹھا کر گلی کوچوں میں گھمایا جاتا ہے اور بچے لہک لہک کر یہ نعرہ لگاتے ہیں کہ۔ ''عاشق کا جنازہ ہے ذرا جھوم کے نکلے''۔ اس سے گدھے کی توقیر اور انسانوں کی بے وقعتی کا پتہ چلتا ہے۔

عموماً سیاسی پارٹیوں کے نشانات شیر بیل اور گھوڑے کو بنایا جاتا ہے۔ اب تک کسی سیاسی پارٹی نے گدھے کو اپنا سمبل نہیں بنایا یہ یقیناً سیاست دانوں کی کم فہمی ہے۔ جس کے سبب لاکھ جتن کے باوجود انکی پارٹی عوام میں مقبولیت حاصل نہیں کر پاتی کہا جاتا ہے کہ مشہور فلم ساز ناصر حسین کی فلم گدھے کے بغیر مکمل نہیں ہوتی تھی فلم میں کہیں نہ کہیں گدھا ضرور دکھایا جاتا تھا جو ان کے فلم کے ہٹ ہونے کی ضمانت سمجھی جاتی تھی یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ گدھا مبارک جانور ہے۔

ہمارے ادب میں گدھوں کی کمی نہیں اس کا علم مجھے اس وقت ہوا جب میں اپنا مسودہ اکیڈمی میں جمع کیا تھا مسودہ تو منظور ہو گیا لیکن مبصر نے اپنی سخت ناراضگی کا اظہار کیا تھا کہ مسودے میں جگہ جگہ گدھے کا استعمال ہوا ہے جو قابلِ اعتراض ہے ''گدھا'' غیر ادبی اور بازاری لفظ ہے حالانکہ فاضل مبصر نے گدھے کی ادبی لفظ کی نشاندہی بھی نہیں کی تھی اگر ایسی بات ہے تو انہیں سب سے پہلے کرشن چندر کی خبر لینی چاہئے تھی کہ انہوں نے اپنی کتابوں کے عنوانات کے لئے گدھوں کا انتخاب کیوں کیا!

خواجہ الطاف حسین حالی نے کہا ہے کہ

ع جس حال میں ہیں اسی میں ہیں شاداں

ظاہر ہے موصوف کا اشارہ گدھے کی طرف ہے

بادشاہت ہو یا جمہوریت صاحبِ اقتدار انہیں کو پسند کرتے ہیں جو گدھے کی طرح سینگ سے عاری ہوں دوسری صورت میں ان کا وجود خطرے کا باعث ہے گویا دنیا گدھوں کے لئے ہے یا پھر دنیا کے لئے گدھے ناگزیر ہیں۔

سرکشی خالقِ کائنات کو بھی پسند نہیں چنانچہ اس کی سرکوبی کی خاطر اس کے پاس تدابیر کی بھی کمی نہیں جن

میں مچھر اور جوتے سب سے مؤثر ہیں رعایا پر اپنی دھاک بٹھانے نیز حکومت کی گرفت مضبوط کرنے کی خاطر صاحبِ اقتدار وقفہ وقفہ سے اس حربہ کو بروئے کار لاتے رہتے ہیں بعد میں چمکارتے بھی ہیں۔

تمام مخلوقات میں آدم کی اولاد سب سے کم فہم اور معصوم مخلوق ہے انہیں یہ زعم ہے کہ وہ مخلوقات میں سب سے افضل ہیں ممکن ہے یہ ان کی خوش فہمی ہو عین ممکن ہے کہ کائنات کی دوسری مخلوق خصوصاً گدھے کو بھی یہی کہہ کر استوار کیا گیا ہو دراصل یہ سیاست ہے۔

ع باغباں بھی خوش رہے راضی رہے صیاد بھی

اور سیاست زمینی پیدا رتو ہے نہیں دنیا ہو یا پھر حکومت اس کے قیام واستحکام کی خاطر یہ حکمت ناگزیر ہے۔

اربابِ اختیار کے خلاف لب کشائی جرم کے مترادف ہے تاہم ہر دور میں عیسٰی وسقراط پیدا ہوتے رہے ہیں۔مشہور شاعر جمیل مظہری بھی انہی میں سے ایک تھے لہٰذا ہر مصلحت سے پرے بے خوف کہہ دیا۔

ع خدا اور شیطان کے اشتراک سے چل رہا ہے یہ کارخانہ

ایک بار مشہور سائنسداں نیوٹن سمندر کے کنارے ٹہل رہا تھا ایک شخص اس کے پاس آیا اور سمندر کی طرف اشارہ کر کے کہا کہ آپ بھی علم کے معاملے میں سمندر ہیں۔

نیوٹن اس شخص کی بات سن کر مسکرایا اور ایک کنکرا اٹھا کر کہا ....علم یقیناً سمندر کی مانند ہے اور میری حیثیت اس کنکر سے زیادہ نہیں برعکس ایں ہمہ ہم میں ایسوں کی کمی نہیں جو علم کی ذرا سی بوجھ سے جھکے جاتے ہیں یا پھر وہ ایسا ہی تاثر دیتے ہیں ان کے گھر کے دروازے سے بھی یہی تاثر ملتا ہے حالانکہ کسی شاعر نے کہا کہ

ے کہہ رہا ہے موجِ دریا سے سمندر کا سکوت
جس کا جتنا ظرف ہے اتنا ہی وہ خاموش ہے

اس ضمن میں یہ بھی کہا جاتا ہے کہ گدھے کے پیٹھ پر کتابیں لاد دینے سے گدھا عالم نہیں ہو جاتا یا ممکن ہے ان کا اپنے علم کو مشتہر کرنے کا مقصد اہلِ محلّہ پر اپنی دھونس جمانا ہو بہر کیف!

یہاں تک تو غنیمت ہے لیکن کچھ لوگ مرنے کے بعد قبر کے کتبے پر ڈگریوں کے علاوہ عہدہ و منصب تک لکھوا دیتے ہیں گویا جیتے جی زندوں پر رعب ڈالا اور مر کر مردوں کو بھی مرعوب کرنے سے باز نہیں آئے۔

چرکہ

بنگلہ کہانی : سمریش مجمدار __________ مترجم: عظیم انصاری

اس طرح بادلوں کا گرجنا اس برس اور نہیں دیکھا گیا۔ گرچہ ساون کا درمیانی حصہ ہے لیکن سورج تو دور کی بات ہے بھری دوپہر میں اندھیرے کا سایہ منڈلا رہا ہے۔ ایسے وقت میں ایک ضروری میٹنگ بلائی گئی ہے۔ مقامی کمیٹی نے یہ سوچ کر میٹنگ بلائی تھی کہ ایک اہم فیصلہ کرنا ہے لیکن دوپہر ڈھلتے ہی آندھی چلنے لگی اور شام ہوتے ہی موسلا دھار بارش ہونے لگی۔ نیندو سر پر چھاتا لگائے جب پارٹی آفس پہنچا تب تک اس کی پینٹ بھیگ چکی تھی اور پیٹھ بھی پانی سے شرابور تھی۔ پہنچتے ہی کشور نے کہا۔ ''آیئے نیندو بھیا، آج میٹنگ نہیں ہوگی۔''

کمرے میں اس وقت پانچ افراد بیٹھے ہوئے تھے۔ اُن کے درمیان للیتا نہیں تھی۔ اس نے دھیمی آواز میں پوچھا، ''لگتا ہے کچھ لوگ نہیں آپائے ہیں نا؟''

''کیسے آئیں گے! ایسی بارش میں پاگل اور ہم جیسے لوگوں کو چھوڑ کر کوئی باہر نہیں نکلتا۔ میں سکریٹری کے گھر گیا تھا۔ انھوں نے میٹنگ کو ملتوی کرنے کو کہا۔'' کشور نے کہا۔

''آج کیسے ہیں وہ؟''

''وہی پہلے جیسا۔ ساری زندگی انھیں گھر ہی میں رہنا ہوگا۔'' یہ بات کہہ کر کشور نے اپنی آواز تھوڑی دھیمی کر لی اور پھر کہا ''اُن کی خواہش ہے کہ اس بار آپ سکریٹری بنیں؟ بھابی کی وہ حمایت نہیں کر رہے ہیں۔ اُن کا کہنا ہے کہ کسی خاتون کو سکریٹری بنانا اس صنعتی علاقے کے لیے بڑی ذمہ داری ہے اور 'یادو' کو وہ اس لائق نہیں سمجھتے لیکن بھابھی کی حمایت کرنے والے لوگ بھی کم نہیں ہیں۔''

تقریباً ایک گھنٹے تک نیندو پارٹی آفس میں رہا۔ باہر سے لگاتار بارش کی آواز آرہی ہے۔ روشنی کانپ رہی ہے۔ کسی بھی لمحے لوڈ شیڈنگ ہوسکتی ہے۔ علاقے کی کئی ایک مطالبات کو لے کر عوام تک پہنچنا ہے۔ اس کا مسودہ تیار کرنا ہے۔ یہ ذمہ داری ہمیشہ سے نیندو نبھاتا آیا تھا۔ پھر اس نے اپنے خیال کو جھٹکا کہ اب گھر پر بیٹھ کر یہ کام کرے گا۔ اس کی نظریں بار بار دروازے تک جا رہی تھیں۔ للیتا ابھی تک نہیں آئی تھی۔ گرچہ پارٹی آفس میں آنا، اس کا روز کا معمول تھا۔ اس کے اسکول کے سامنے اکثر پانی بھر جاتا ہے۔ للیتا اس کی بیوی ہے۔ بائیس برس

سے اُن کی شادی شدہ زندگی بغیر چوں چرا کے کٹی ہے۔ بائیس برس سے وہ ایک ہی طرح کی سیاست کر رہے ہیں۔ پارٹی جس وقت دو حصوں میں منقسم ہوئی، تب بھی وہ ایک ساتھ تھے۔ پارٹی سے جب بہت سے لوگ الگ ہو گئے تو بھی وہ پارٹی کے ساتھ رہے۔ ایک ساتھ آندولن میں شامل رہے، پولس کی لاٹھی کھائی۔ یہ اور بات ہے کہ نبیند و نے بہت پہلے پارٹی جوائن کی تھی۔ اس وقت وہ جوانی کی دہلیز پہ تھا۔ آزادی کے بعد پارٹی پر پابندی لگ گئی۔ وہ انڈر گراؤنڈ رہ کر مارکس کی تعلیم سے فیضیاب ہوتا رہا۔ اس کا خون ہمیشہ رواں رہا۔ بعد میں للیتا اس کی ساتھی بنی۔ ایک ہی علاقے کی کمیٹی میں اُن کا وقت کٹتا رہا۔ نبیند و کو کبھی عہدے کی پرواہ نہیں رہی۔ آج مرکزی رہنماؤں میں سے زیادہ تر اس کے دوست ہیں یا شاگرد۔ نبیند و نے ایک ہی جگہ رہنا پسند کیا۔ لیکن آج اس لوکل کمیٹی کی حالت ناگفتہ بہ ہے۔ سکریٹری اب صحتمند ہونے سے رہے۔ بہت سے لوگوں نے اس سے درخواست کی وہ پارٹی کو سنبھالے یہاں تک کہ مرکزی کمیٹی سے بھی درخواست آئی۔ نبیند و راضی ہوا لیکن اسے یادو کی اُمیدواری سے کوئی جھٹکا نہیں لگا کیونکہ وہ شروع سے عہدہ کا خواہش مند تھا لیکن حیرانی اسے تب ہوئی جب للیتا نے بھی اس عہدہ کے لیے مقابلہ کرنا چاہی۔ اب میاں بیوی کے درمیان لڑائی تھی، یادو مقابلے سے بہت دور رہ گیا تھا۔

نبیند و وللیتا کی شادی شدہ زندگی خوشگوار تھی۔ گرچہ زندگی میں کچھ کمی بھی تھی۔ اُن کی کوئی اولاد نہیں تھی لیکن انہیں کوئی افسوس بھی نہیں تھا۔ للیتا اور نبیند و میں کبھی کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی' کوئی دیوار بھی حائل نہیں رہی۔ اُن کے تین کمروں پر مشتمل گھر میں پارٹی کے لڑکے لڑکیوں کے آنے جانے کا تانتا بندھا رہتا تھا۔ کبھی کبھی تو ایسا لگتا تھا کہ اُن کا گھر پارٹی آفس میں تبدیل ہو گیا ہو۔ اتنی ساری باہری ذمہ داری کے ساتھ گھریلو کاموں پر بھر پور توجہ رکھتے ہوئے وہ اسکول میں پڑھانے بھی جایا کرتی تھی۔ نبیند و کو للیتا کے ہاتھوں کھانا کھا کر ہی سکون ملتا تھا۔

جس دن اس نے پہلی بار خبر سنی۔ وہ للیتا نے ہی گھر آ کر بتائی تھی کہ ''وہ لوگ چاہتے ہیں کہ میں پارٹی کی سکریٹری بنوں، کچھ لوگ نہیں بھی چاہتے ہیں۔ سمجھ میں نہیں آ رہا ہے کیا کروں''۔

''میں نے تو سنا ہے کہ تم رضامندی دے چکی ہو۔ ٹھیک ہے انتخاب ہونے دو۔ اس سے پارٹی کا جمہوری چہرہ مزید اُجاگر ہوگا۔ مجھے ذرا بھی افسوس نہیں ہے۔''

للیتا اس کے سینے سے لپٹ گئی'' تم مجھے غلط مت سمجھنا!''

''نہیں نہیں... ہاں اگر تم چاہو تو میں اپنی اُمیدواری واپس لے سکتا ہوں۔''

''خبردار ایسا ہرگز مت کرنا۔ ورنہ یادو تمام لوگوں کو کہتا پھرے گا کہ بیوی کے لیے تم دستبردار ہوئے ہو

۔ہم لوگ انتخاب لڑیں گے لیکن اس کا اثر گھر پر نہیں پڑنا چاہئے۔''

للیتا کے بالوں کو سہلاتے ہوئے نبیندو نے کہا۔''اس بات کا خیال رکھنا کہ ووٹ مانگنے کے لیے ہم لوگ ایک دوسرے کو نشانہ نہیں بنائیں گے۔''

''ٹھیک ہے ہم لوگ بغیر campaign کے مقابلہ کریں گے۔''

بارش کم ہونے کی کوئی اُمید نہیں ہے۔ کشور کو آفس بند کرنے کا حکم دے کر نبیندو سر پر چھاتا سنبھالتے ہوئے نکل پڑا۔ ہوا کا جھونکا تیز ہے۔ بارش کی بوندیں بڑی بڑی سی ہیں۔ کچھ قدم چلنے کے بعد وہ بالکل بھیگ گیا۔ ابھی رات کے آٹھ بجے ہیں۔ للیتا کا اسکول ڈیڑھ میل کی دوری پر ہے۔ وہ کیا ابھی بھی اسکول میں پھنسی ہوئی ہے؟ وہاں جانے سے پہلے اپنے گھر جانا مناسب لگا۔ کچھ دور چلنے کے بعد اسے احساس ہوا کہ ایسے موسم میں اکیلے نکلنا ٹھیک نہیں۔ سیاسی فضا اتنی مکدر ہوگئی ہے کہ کوئی بھی راحت محسوس نہیں کر رہا ہے۔ آس پاس کے گاؤں میں خون خرابہ ہو رہا ہے۔ پارٹی کے اونچے عہدے پر فائز لوگوں پر حملے ہو رہے ہیں۔ ان کی تنظیمی صلاحیت سے ہار کر خود غرض لوگ اُن پر حملے کر رہے ہیں۔ گرچہ اس ضلع میں ابھی تک اس طرح کی کوئی بات نہیں ہوئی ہے۔ پھر بھی مرکزی کمیٹی کی طرف سے اِنتباہ کردی گئی ہے۔ نبیندو کو اس بارش میں بھی ہنسی آ گئی۔ انسان اب انسان کے ہاتھوں ہی پریشان ہے۔ مزدوروں کا بڑا دشمن بن کر نمودار ہوا ہے اور ایک مزدور طبقہ۔

ابھی آدھی مسافت طے ہوئی تھی کہ روشنی چلی گئی ایسا لگا کسی نے شہر کے اوپر ایک کالا جال پھینک دیا ہو۔ بارش ہونے سے ہی لوڈ شیڈنگ ہوگئی۔ روشنی نہیں ہونے کی وجہ سے راہ چلنے میں دشواری ہو رہی تھی۔ ایسے وقت میں نبیندو کو احساس ہوا کہ اس کی عمر ڈھل رہی ہے۔ پہلے جیسی تیزی اس کے اندر نہیں ہے۔ اتنی زوردار بارش میں جب چھاتا کوئی کام نہ آ رہا ہو تو اسے سر پر سنبھالے رکھنا سوائے عادت کے کچھ بھی نہیں۔

گھر کے سامنے آ کر کچھ راحت کا احساس ہوا۔ اندر لالٹین کی روشنی ہے۔ لگتا ہے للیتا گھر واپس آ گئی ہے۔ دروازہ کھولتے ہی للیتا چیخ پڑی''اوہ ماں! یہ کیا؟ اس بارش میں بھیگتے ہوئے آئے ہو۔ ایسے ہی سانس لینے میں تمہیں دقت ہوتی ہے اور اس پر بھیگتے ہوئے چلے آئے۔ تم بیماری کو خود ہی دعوت دیتے ہو۔ دیکھ رہے ہو کہ دن اس طرح کا ہے۔ کیا ضرورت تھی اس طرح باہر نکلنے کی۔''

''آج میٹنگ ہونے کی بات تھی۔'' چھاتا بند کر کے نبیندو نے پانی رسنے کے لیے اسے ایک جگہ رکھ دیا۔

باتھ روم سے جیسے ہی نیند و تازہ تر ہو کر باہر نکل کر چارپائی پر بیٹھا ،للیتا نے اسے ادرک سے لبریز چائے تھما دی۔ نیند و نے تشکر آمیز نظروں سے بیوی کی طرف دیکھا۔ بچہ نہیں ہوا تھا، اسلئے للیتا کے جسم میں زیادہ کچھ تبدیلی نظر نہیں آتی تھی لیکن چہرے پر عمر کا اثر صاف دکھائی دے رہا تھا، بال گرچہ اس نے کالے کر لیے تھے لیکن نیند و کو آج بھی للیتا پر کشش لگتی تھی۔ اس نے بدلے ہوئے لہجے میں کہا، ''تمہارا منتخب ہونا ضروری ہے۔''

''میں بھی بیوی ہونے کے ناطے یہی کہنا چاہوں گی۔ بہر حال یہ بتاؤ کہ آج میٹنگ نہیں ہوگی، اس کے بارے تم جانتے نہیں تھے؟''

''نا۔ تمہیں معلوم تھا کیا؟

''ہاں اسکول میں ہی خبر ملی تھی۔''

ایک کسک سی دل میں محسوس ہوئی۔ اُن لوگوں کا للیتا کے ساتھ تعلق کچھ زیادہ ہی ہے۔ ایک سانس بھرتے ہوئے کاغذ وغیرہ لے کر وہ چائے کی چسکی میں ڈوب گیا۔ للیتا اسکول کی کاپیاں لے کر بیٹھتے ہوئے بولی ''کھانے کی خواہش ہو تو بولنا۔ زیادہ رات نہ ہو تو بہتر ہے۔ جتنا بارش میں بھیگے ہو، اس کے لیے اچھا یہی ہوگا کہ جلدی سے سو جاؤ۔ Leaflet کا کام ابھی ختم ہی ہوا تھا کہ دروازے کی کنڈی کھٹکھٹانے کی آواز آئی۔ پہلے نیند و نے خیال نہیں کیا۔ للیتا کو کرسی چھوڑ کر اُٹھتے ہوئے دیکھ کر اس نے زبان کھولی، ''اس بارش میں بھلا کون آیا ہے اس وقت؟''

''دیکھ رہی ہوں۔'' للیتا نے جواب دیا۔

للیتا کے پاؤں بڑھاتے ہی وہ بولا، ''ٹھہرو میں جاتا ہوں۔ ہوسکتا ہے ارون ہو۔ اس نے کہا تھا کہ آج کسی وقت وہ آئے گا۔''

للیتا باہر والے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔ ارون للیتا کا خاندانی بھائی تھا۔ نیند و کو شک تھا کہ للیتا ارون کے مشورے سے ہی انتخاب میں اس کا مقابلہ کر رہی ہے۔ اس نے گھڑی کی طرف نگاہ دوڑائی، پونے گیارہ بج رہے تھے۔ ابھی آنے کا مطلب تھا کچھ دیر تک اس کی بک بک سننی پڑے گی۔ اس نے کمرے میں موم بتی جلا کر دروازہ کھولا، آواز آئی۔

''کس سے ملنا ہے؟'' للیتا نے سوال کیا۔

'' نیند و ہے؟ ''

''آپ کا نام؟

''نام بولنے سے کیا فائدہ۔ پہچان پائیں گی؟ میں اس کا قریبی دوست ہوں ذرا بلا دیجئے۔''

بات چیت کی آواز نیند و کے کان میں آ رہی تھی ۔ گلے کی آواز سے وہ پہچان نہیں پایا۔للیتا ڈرائنگ کر گھر میں داخل ہوتے ہوئے بولی۔''ایک بوڑھا تمہیں تلاش کر رہا ہے۔اس نے نام نہیں بتایا۔رات کے وقت پریشان کرنے چلا آیا،اس کو لوٹا نہیں سکی،بوڑھا آدمی ہے،لگتا ہے اس کی طبیعت بھی ناساز ہے اور پھر وہ تمہارا قریبی دوست بھی ہے''۔للیتا پھر اپنے اسٹوڈنٹس کی کاپیاں لے کر بیٹھ گئی۔

گھر کا باہر والا دروازہ اُدھ کھلا تھا۔بارش کی آواز آ رہی تھی ۔ بہت گہرا اندھیرا تھا۔گھپ اندھیرا،اس کمرے میں دو لیمپ کے سامنے بیٹھ کر دو لوگ کام کر رہے تھے۔موم بتی جل رہی تھی ۔اس کانپتی روشنی میں سکڑے ہوئے بوڑھے کو نیند و نے دیکھا۔کاندھے پر ایک Polythene کا بیگ تھا۔ہاتھ میں ایک پھٹا ہوا چھاتا، سینے تک سفید داڑھی اور سر کے تقریباً آدھے بال غائب تھے۔آنکھیں عجیب ڈھنگ کی لگ رہی تھیں۔

''کیا چاہیے؟''

''نیند و!''اس کے گلے کی آواز میں کپکپی تھی ۔

''میں آپ کو ٹھیک ڈھنگ سے پہچان نہیں پا رہا ہوں ۔کس کے رشتہ دار ہیں آپ؟''

''نیند و تم مجھے پہچان نہیں رہے ہو بھائی ؟''

اچانک نیند و کا سارا جسم کانپنے لگا اور شدید سردی کا احساس ہوا۔ بھائی لفظ کی ادائیگی اُسے فوراً ۱۹۴۸ سال میں لے کر چلی گئی ۔اس کے بعد بہت سے واقعات کے درمیان ۱۹۶۷ میں یہ لوگ پارٹی چھوڑ کر الگ ہو گئے تھے لیکن کیسا چہرہ ہو گیا ہے اس کا۔اس طرح کی خراب حالت میں وہ ہوگا ،نیند و نے اس کا تصور بھی نہیں کیا تھا۔ لیکن اس انسان کے وجود کو تسلیم نہیں کیا گیا۔کسی طرح کا اخلاقی مظاہرہ ،پارٹی کی نظر میں بے آئینی تھی اور کسی طرح کی مدد کرنے کی بھی پابندی تھی ۔ایک بار اس خاص وجہ سے اسے پارٹی سے نکال دیا گیا تھا۔اس کو کیا ضرورت پیش آئی اتنی رات کو؟

''کیا مجھے سچ مچ نہیں پہچان پا رہے ہو؟''

نیند و نے سر ہلایا،''ہاں پہچان رہا ہوں ،کیا بات ہے؟''

''میں تین دن سے بھوکا ہوں ۔آندھرا سے ایک آدمی مجھ سے ملنے آنے والا تھا۔ دن ٹھیک یاد نہیں رکھ

پایا۔وہ آج ہی اس شہر میں آ گیا۔ پیسہ نہیں ہے کہ وہ کسی ہوٹل میں ٹھہرے اور بارش میں راستہ چلنا بھی دشوار ہے۔تمہارا خیال آیا۔تم مجھ کو ایک رات ٹھہرنے دو گے بھائی؟" ایک ہاتھ اس کا تھر تھر کانپ رہا تھا۔ وہ تھوڑا سا آگے بڑھا۔

نبیندو کے دل کے اندر لوہے کی گیند گھوم رہی تھی۔"یہ کیا بول رہے ہیں جگدیش بھیّا! جس آدمی کو پارٹی کے خلاف کام کرنے اور باغیانہ رویہ کی وجہ سے نکال دیا گیا ہو اس کو وہ سرگرم رُکن ہونے کے باوجود پناہ دے...نا ممکن۔ اس کے ساتھ ساتھ اسے ڈھیر سارے الزامات کا سامنا کرنا پڑے گا، یہ جرم ہے۔غیر شعوری طور پر سر ہلاتے ہی جگدیش نے کہا،" پناہ نہیں دو گے نبیندو! بہت اُمید لگا کر تمہارے پاس آیا تھا۔اس بارش میں اگر میں باہر رہا تو نہیں بچ پاؤں گا۔ کئی راتوں سے ڈھنگ سے سو بھی نہیں پایا ہوں۔فاقہ کشی کے ساتھ میں نے سمجھوتہ کر لیا ہے۔لیکن اس عمر میں بارش میں بھیگا جسم شاید یہ برداشت نہ کر پائے۔اس پرانے شہر میں آنے کے بعد تمہاری یاد آئی۔ کتنے برسوں تک ہم نے ایک ساتھ تحریکیں چلائی ہیں۔وہ ۱۹۴۸ میں پولس کے ساتھ۔" جگدیش بھیّا نے سانس کھینچا۔لگا تار بولنے کی وجہ سے شاید ہانپنے لگا تھا۔

نبیندو نے ایک بار گھر کے اندر کے دروازے کی طرف دیکھا۔للیتا کیا یہ سب سن رہی ہے؟نہیں،ابھی بھی دبی ہوئی آواز میں بول رہے ہیں جگدیش بھیّا۔اس گھر میں لالٹین کا سایہ نہیں پڑ رہا تھا۔اس نے واضح انداز میں کہا" لیکن آپ ہمارے پارٹی کے دشمن ہیں"۔

"پارٹی کے دشمن ہو سکتے ہیں،تمہارے تو نہیں۔ہم دونوں ہی کمیونسٹ ہیں،پارٹی میرے لیے زیادہ اہم ہے۔اس کے بعد ہی میرا وجود اور انسان! ہمارا انسانی رشتہ!" نبیندو میں نے تمہیں ہاتھ پکڑ کر مارکسزم سکھایا تھا۔ یاد ہے کیا! آج کی رات مجھے ٹھہرنے دو۔اس بارش کی رات میں کوئی جان بھی نہیں پائے گا۔کوئی بھی انسان راستے میں نظر نہیں آ رہا ہے۔ میں وعدہ کرتا ہوں صبح ہونے سے قبل میں نکل جاؤں گا۔مجھ میں اب قوت نہیں ہے تھوڑا سو لینے دو۔"

نبیندو نے سر ہلایا۔ بہت دنوں کے تعلقات ہیں۔ایک ہی رات کی تو بات ہے کوئی جان بھی نہیں پائے گا اس بارے میں۔للیتا بھی جگدیش کو نہیں پہچان پائی ہے۔کسی کے جاگنے سے پہلے ہی اگر یہ تھوڑا سو کر نکل جائے تو کوئی ہرج نہیں۔اس نے پھر سر ہلایا۔" ٹھیک ہے اس صوفے پر سو جایئے۔صبح ہونے سے پہلے ہی چلے جائے گا۔اُس طرف باتھ روم ہے۔"

''تم نے مجھے بچالیا نیندو'' جیسے بوڑھے میں پھر سے جان آگئی۔

''للیتا کو میں کہدوں گا کہ آپ میرے ہم جماعت نوین کے بڑے بھائی ہیں۔'' بھاری قدموں کے ساتھ للیتا نے آتے ہوئے پوچھا ''کون ہے؟''

جواب نیندو کی زبان پر ہی تھا۔اس نے کہہ دیا کہ رات کو ٹھہرنا چاہتے ہیں۔وہ یہیں رہیں گے۔

''کسی دن تو ان کا نام نہیں سنا میں نے۔ان کی حالت تو بہت خراب ہے۔''

''ہاں'' نیندو کا دل گھبرا رہا تھا۔

''رات ہوگئی ہے، کھانا کھالو اور ہاں! وہ کھا کر آئے ہیں کیا؟''

''کون۔''

''تمہارے دوست کے بھیا''۔

''نہیں معلوم۔تم میرا کھانا نکالو۔''

''یہ کیا بات ہوئی۔گھر پر مہمان ٹھہرے گا اور تم نے یہ پوچھا تک نہیں کہ وہ کھائے گا یا نہیں۔''

''ٹھہرنے دیا یہی کیا کم ہے اور اب کھانے کے بارے میں بھی پوچھوں؟''

''ایسا ہوتا ہے کیا؟ اس کے کپڑے بھی بھیگے ہوئے ہیں۔تم اپنی ایک لنگی تو دے دو۔مہمان گھر میں ٹھہرے تو اس کی پذیرائی بھی ہونی چاہئے۔''

للیتا اُٹھی اور ایک صاف لنگی اور تولیہ لاکر نیندو کو دی۔

نیندو نے پھر کہا'' خواہ مخواہ اپنے کھانے کا حصہ ....!''

''چپ رہو تو۔کبھی کبھی تم الٹی سیدھی باتیں کرنے لگتے ہو جو مجھے سمجھ میں نہیں آتیں'' للیتا نے کہا۔

خشک کپڑے پہن کر اور بھر پیٹ کھانے کے بعد جگدیش کو کافی سکون ملا۔ایک ساتھ کھاتے ہوئے دونوں کے درمیان کوئی بات نہیں ہوئی۔نیندو نے اندازہ لگالیا کہ جگدیش کی جسمانی بناوٹ میں اتنی تبدیلی ہوئی ہے کہ اسے فوراً پہچان لینا بہت مشکل ہے۔للیتا کے لیے تو تقریباً ناممکن ہے۔اس کے علاوہ اس کے ہاتھ اور گلے میں چمڑے کی بیماری اُبھر آئی تھی۔چہرے کا چمڑہ بھی سکڑ گیا تھا۔

بغل والے کمرے میں جگدیش کی ناک بج رہی تھی۔صوفے پر لیٹتے ہی وہ گہری نیند کی آغوش میں چلا گیا۔لگتا تھا ایک لمبے عرصے کے بعد سکون کی نیند آئی ہو۔بستر پر سوئے سوئے نیندو اس کے بارے میں ہی سوچ

رہا تھا۔۱۹۴۸ سے لے کر۱۹۶۲ تک ایک ساتھ کام کرنا' ۶۲ کے بعد پارٹی کا منقسم ہونا اور ۶۷ میں اچانک پارٹی چھوڑ کرانقلاب کی آگ میں کود پڑنا اور آج حالت یہ ہے کہ نہ کھانے کا ٹھیک ہے اور نہ کہیں جائے پناہ۔ ذرا بھی سکون میسر نہیں! کیا فائدہ ہوا پارٹی چھوڑ کر؟ حالانکہ پارٹی کا سرگرم رکن ہونے کے ساتھ ساتھ جگدیش بھیّا ایک اچھے منتظم بھی تھے، جن کا کوئی مقابلہ نہیں کرسکتا تھا۔

نیندو ساری رات سو نہیں پایا۔اس کو ڈر لگ رہا تھا کہ کہیں جگدیش بھیّا سوئے نہیں رہ جائیں۔اگر سورج کی کرنیں نکلنے تک وہ سوئے رہیں اور صبح کو ارون اگر آجائے تو بہت مشکل میں پھنس جائے گا وہ۔

بستر پر ایک طرف للیتا سوئی ہوئی تھی، اخلاص ومحبت سے بھرپور عورت۔اگر ایسی بات نہ ہوتی تو ایک انجان آدمی کو کھانا دیتی کیا؟ نیندو کو لگا کہ للیتا جیسی عورتوں کو پارٹی کی پہلی صف میں ہونا چاہئے تاکہ ملک کے عوام اُن کی محبت کو پاسکیں، لیکن موجودہ اِنتخاب کے لڑے بغیر ممکن نہیں، یہ فی الحال self-respect کی بات بن گئی ہے۔

ابھی چار بھی بجے تھے یا نہیں کہ نیندو بستر سے اُٹھا۔اور تھوڑی دیر میں صبح ہو جائے گی۔جگدیش بھیّا کو اب نکل جانا چاہئے۔بارش کی آواز اب سنائی نہیں دے رہی ہے۔اس نے للیتا کی طرف دیکھا جو گہری نیند میں تھی۔

نیندو دبے پاؤں گھر سے باہر آیا۔جگدیش کا منہ کھلا ہوا اور آنکھیں بند تھیں، بدن سکڑا ہوا۔لالٹین کی روشنی بڑھاتے ہی وہ ہڑبڑا کر اُٹھ کھڑا ہوا۔وہ بہت خوفزدہ لگ رہا تھا۔اس کے بعد سانس لیتے ہوئے کہا''اوہ! یہ تم ہو نیندو۔''

''صبح ہو رہی ہے۔''

''اچھا میں سمجھ رہا ہوں'' ابھی بھی اس کا بدن نیند سے ٹوٹ رہا تھا اور تھکاوٹ بھی نمایاں تھی لیکن جگدیش پھر بھی اُٹھ پڑا۔''بہت زور کی نیند آئی تھی۔بارش تھمی ہے کیا؟''اس نے پوچھا۔

''ہاں!''نیندو نے کہا۔کچھ دیر توقف کے بعد نیندو نے پوچھا''اچھا جگدیش بھیّا یہ سب کر کے آپ لوگوں کو کیا ملا، کیا فائدہ ہوا؟''

''کیا سب؟''جگدیش اپنے آپ کو جیسے تیار کر رہا تھا۔

''یہی ضدی پن۔انتہا پسند لوگوں کے ساتھ ہاتھ ملا کر اپنی پرسکون زندگی کو تباہ کرنا؟''

جگدیش ہنسے۔اس کے بعد انھوں نے کہا''اچھا تو اب چلتے ہیں اپنی بیوی کو شکریہ ادا کر دینا۔میں نہیں

جانتا کہ پھر ملاقات ہوگی یا نہیں، لیکن تمہارے لیے ڈھیر ساری محبتیں اور دُعائیں۔‘‘

بغیر کسی آواز کے دروازہ کھولتے ہوئے جگدیش نے باہر کی طرف دیکھا۔ اس وقت بھی راستہ اندھیرے میں ڈوبا ہوا تھا۔ بادلوں سے گھرا آسمان صبح کی آمد کو روکے ہوئے تھا۔ ٹھنڈی ہوا کا جھونکا شباب پر تھا۔ اچانک منہ گھما کر جگدیش نے کہا’’ کیا فائدہ ہوا؟ تم پوچھ رہے تھے نا؟ فائدہ یقیناً ہوا ہے۔ پچھتر ہزار انسانوں کے دل پر ایک چرکہ تو لگا! ۱۹۶۷ سے لے کر ۱۹۷۱ تک جو ہم نے کیا، اس کی حقیقت میں کوئی قیمت نہیں۔ لیکن تم لوگ تو مارکسزم پر یقین کرتے ہو۔ اُن کے ضمیر کو اگر ذرا سا بھی چرکہ لگا تو سمجھو بہت بڑا فائدہ ہوا، بہت بڑی کامیابی ملی، کیا ایسا نہیں ہے؟‘‘

ہلکے اندھیرے میں جگدیش نکل پڑا۔ اس کا جسم تاریکی میں مدغم ہوگیا۔ دروازہ بند کر کے نیندو صوفے پر آ کر بیٹھا، چپ چاپ۔ دل کے اندر ایک بے چینی سی محسوس ہو رہی تھی۔

صبح کی روشنی نمودار ہوئی لیکن رنگ زردی مائل تھا۔ نیندو کو کیفیت دینی پڑی کہ کیوں اتنی صبح کو بغیر چائے پلائے گھر سے جانے دیا۔ للیتا کے چہرے کی طرف نہ دیکھتے ہوئے نیندو نے کہا کہ اس نے روکنے کی کوشش کی تھی لیکن وہ جانے کے لیے بضد تھا۔ یہ کہہ کر اس نے خود کو تھوڑا سا ہلکا محسوس کیا۔ اس ایک رات کی بات کا کوئی ذکر نہیں ہوگا کہیں۔ لیکن سارا دن جگدیش کی آخری بات دل میں ایک چبھن پیدا کر رہی تھی۔ آخر جگدیش بھیّا کیا بولنا چاہتے تھے۔ طویل مدّت تک پولس سے بھاگتے بھاگتے جب اُن پر حکمرانی کا وقت آیا تو جگدیش بھیّا پھر مارے مارے پھر رہے ہیں۔ قومیت کی باگ ڈور ہاتھ میں آجانے کے باوجود خواہش کی پیاس بجھتی کیوں نہیں؟

لیکن یہ سب فکر جز وقتی تھی۔ رات دن کام کاج کی مصروفیت، پارٹی کے لیے جلوس و جلسہ کے انتظام کے درمیان نیندو اب اس رات کی بات کو بھول گیا۔ دو دن بعد ایک ضروری میٹنگ کے اعلان سے اسے کچھ جھٹکا سا لگا۔ مرکزی رہنما پارٹی کے آنے والے انتخاب اور پارٹی کے حالات کا جائزہ لینے کے لیے آرہے تھے۔ ہر ذمہ دار رکن کو اس میٹنگ حاضر ہونے کو کہا گیا تھا۔

میٹنگ شروع ہوئی۔ کئی ایک ایجنڈا کے بعد لوکل کمیٹی کی سکریٹری کے انتخاب کی بات زیرِ بحث آئی۔ اچانک مرکزی رہنما نے کہا’ اس سے پہلے ایک خاص الزام کے بارے میں بحث کرنے کی ضرورت ہے۔ ہم لوگوں کا ایک کامریڈ، جس پر پارٹی کا خاص بھروسہ تھا، وہ پارٹی کے خلاف کام کر رہا ہے۔ ہم یہ جاننا چاہیں گے کہ اس نے کس طرح پارٹی سے نکالے گئے جگدیش بابو کو رات میں اپنے گھر قیام اور کھانے کا انتظام کیا۔ وہ اچھی

طرح جانتا ہے کہ پولس جس انسان کو تلاش کر رہی ہے اس نے ہماری پارٹی کے ساتھ وشواس گھات کیا ہے۔ اُس کو پناہ دینا بہت بڑا جرم ہے۔''

میٹنگ میں مکمل سناٹا چھا گیا۔ حیرت سے لوگ ایک دوسرے کو تک رہے تھے۔ نبیند و نے آنکھیں اُٹھائیں۔ للیتا بُت بنی بیٹھی رہی۔ چہرہ احساس سے عاری تھا۔ نبیند و نے پاکٹ سے رومال نکال کر اپنا چہرہ صاف کیا۔ مرکزی رہنما نے اس بار سیدھے طور پر سوال کیا،'' کامریڈ نبیند و اس بارے میں آپ کی وضاحت چاہتا ہوں۔''

نبیند و نے بہت مشکل سے اپنے اندر کی کپکپی کو روکا اور کہا'' میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا ہوں۔''

'' سمجھنے کی کوشش کیجئے۔ آپ نے ایک بارش کی رات میں جگدیش بابو کو پناہ دی تھی؟''

'' نہیں''۔ نبیند و نے کہا۔

'' آپ حقیقت کو چھپانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ اس سے آپ کی ذمہ داری اور بڑھ جاتی ہے۔

'' میں ذمہ داری کے ساتھ بول رہا ہوں۔ اس رات میں نے دروازہ نہیں کھولا تھا۔ میری بیوی اس کا صحیح جواب دے سکتی ہے۔''

للیتا نے سر ہلایا۔'' دروازہ میں نے کھولا تھا۔ اس دن لوڈ شیڈنگ تھی۔ جگدیش کو میں پہچان نہیں پائی۔ وہ میرے شوہر کے بارے پوچھ رہے تھے، اس لیے میں نے اُن کو بلا دیا تھا۔''

مرکزی رہنما نے اس بار پوچھا،'' آپ نے اس کے بعد ان کو رات میں ٹھہرنے دیا۔ کھانا بھی کھلایا۔ بیوی کو جھوٹ بول کر انھیں آرام سے سونے دیا۔''

نبیند و نے سر ہلایا'' بالکل نہیں۔ میں ان کو کھانا دینا نہیں چاہتا تھا۔ میری بیوی نے زبردستی انھیں کھانا دیا اور ایک صاف ستھری لنگی دی۔''

للیتا بولی'' یہ سچ نہیں ہے۔ میں نے یہ سب کچھ اس لیے کیا کہ مجھے یہ بتایا گیا تھا کہ وہ میرے شوہر کے بچپن کے دوست کے بڑے بھائی ہیں۔''

نبیند و نے کہا'' بات بالکل سچ ہے وہ میرے بچپن کے دوست کے بڑے بھائی ہیں۔''

مرکزی رہنما نے ہنستے ہوئے کہا'' اس لیے آخری رات میں سیاست کے راز و نیاز کی باتیں کر رہے تھے، آپ لوگ۔''

حیرت زدہ ہو کر نبیند و نے دیکھا اور للیتا نے بغیر ہچکچاہٹ کے کہا کہ کس طرح رات کو نبیند و چپکے سے

اُٹھا، جگدیش سے بات چیت کی اور جاتے وقت کس طرح اس نے کچھ اُپدیش دیا جس پر بہت دیر بیٹھا نبیند و غور و فکر کرتا رہا۔ یہ تمام باتیں للیتا نے تفصیل سے بتائیں، جس پر حاضر تمام لوگوں نے نبیند و سے منھ پھیر لیا۔

مرکزی رہنما نے کہا ''آپ اپنے شوہر پر اِلزام لگا رہی ہیں۔''

للیتا کی آواز ذرا بھی کپکپائی نہیں۔ اس نے کہا ''میں اپنی پارٹی کی وفادار ہوں۔ مارکسزم پر یقین رکھتی ہوں۔ پارٹی کے ساتھ وشواس گھات کر کے وہ میری بھی نظروں سے بھی گر چکے ہیں۔''

پورے میٹنگ ہال میں تالیوں کی گڑگڑاہٹ تھی۔ ایک نے آواز لگائی ''کامریڈ للیتا زندہ باد''۔

مرکزی رہنما نے کہا ''نبیند و بابو! اس اِلزام کی رپورٹ کو میں مرکزی آفس میں بھیجوں گا۔ وہ لوگ جب تک کوئی فیصلہ نہ سنائیں تب تک آپ پارٹی کی تنظیمی کام میں شامل نہیں رہیں گے۔''

نبیند و اُٹھ کھڑا ہوا۔ ''تو کیا مجھے suspend کیا جا رہا ہے؟''۔

''معاملہ کچھ ایسا ہی ہے۔''

نبیند و چپ چاپ باہر نکل آیا۔ بہت رات ہو چکی تھی۔ باہر ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ نبیند و ٹہلتے ٹہلتے گلی کی موڑ تک آ گیا۔ اس کا دماغ ماؤف ہو چکا تھا۔ وہ لوگ اِلزام لگاتے رہے لیکن کسی نے یہ جاننے کی کوشش نہ کی کہ اس نے جگدیش کو اس رات پناہ کیوں دی۔ یہاں تک کہ للیتا نے بھی اس بارے میں کچھ نہیں کہا۔ للیتا کے ساتھ اتنے دنوں کا تعلق ہے۔ پھر بھی اس نے نہیں پوچھا، لیکن پارٹی کو خفیہ رپورٹ دینے میں اس نے دیر نہیں کی۔

اتنے دنوں تک تعلق رہنے پر بھی جب دو لوگوں کے درمیان اس طرح کی خلیج حائل ہو تو پارٹی کے لیے جوانی اور محنت کو برباد کرنے کا یہ صلہ مناسب ہی تھا۔ اس رات کا کوئی گواہ نہیں تھا۔ للیتا نے جو کہا تھا اگر اسے وہ غلط قرار دے دے تو شاید اس کے لیے مشکل کھڑی ہو جائے لیکن ایسا وہ کرنا نہیں چاہتا۔ نبیند و من ہی من ہنسا۔ اسے جگدیش کی آخری بات یاد آئی۔ دل کے اندر ایک چرکہ سا لگا اس لیے باہر سے یہ چوٹ گہری نظر نہیں آ رہی تھی، بلکہ للیتا نے ایک طرح سے اس کی مدد ہی کی تھی۔ لوکل کمیٹی کا اب وہ سکریٹری نہیں بنے گا۔ بے مقصد راہ چلنے کا کوئی معنی نہیں تھا۔ نبیند و نے سر کے اُوپر چھاتا لگایا۔ للیتا کا اب سکریٹری چُنا جانا یقینی ہو گیا۔ شوہر اور پارٹی کے درمیان اس نے ایک لکیر کھینچ دی تھی۔ کیا اب وہ ساتھ رہنا پسند کرے گی؟

بارش ابھی بھی ہو رہی تھی۔ پارٹی کی میٹنگ بھی ختم ہو گئی۔ نبیند و ایک جگہ چھپ کر کھڑا ہو گیا۔ لوگ باہر نکل رہے تھے۔ اس کے بعد اس نے للیتا کو دیکھا۔ گلی میں تیز قدموں کے ساتھ ارون بھی آ رہا تھا۔ ''چلئے للیتا

دیدی، آپ کو گھر تک چھوڑ آؤں، بارش ہورہی ہے۔"

"نہیں نہیں، اس کی کوئی ضرورت نہیں۔ میں رکشہ کرلوں گی۔ کل تم گھر ضرور آنا۔" للیتا نے تشکرانہ لہجے میں کہا۔

"لیکن نیندوا گر گھر واپس آیا تو؟"

"ان باتوں کی فکر مت کرو۔ اس طرح تو انسان زندہ نہیں رہ سکتا" اتنا کہہ کر للیتا بارش میں ہی آگے بڑھنے لگی۔ ارون مخالف راہ کی طرف چل پڑا۔

نیندو نے تیزی سے دو چار قدم بڑھتے ہوئے آواز لگائی "سنو للیتا" حیرت زدہ ہو کر للیتا نے دیکھا۔ بھیگے ہوئے راستے کی روشنی میں وہ نروس دکھائی دی۔

نیندو نے ہنستے ہوئے کہا، "بارش میں مت بھیگو"۔ للیتا کے جسم میں خون کی روانی تھم سی گئی۔ اس کی آنکھوں میں حیرت اور خوف تھا۔ نیندو نے چھاتا بڑھاتے ہو کہا۔ "اسے رکھ لو۔"

موہن سپرا ۲ نومبر۱۹۴۲کوامرتسر پنجاب میں پیدا ہوئے۔ ہندی ادب کاایک معتبر نام ہےاور ۵۵ برسوں سےادب تخلیق کرر ہے ہیں ۔آپ کو ہندوستان میں ہندی ادب کے حوالے سے قدر ومنزلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا ہے ۔اب تک موہن سپرا کی درجنوں کتابیں شائع ہوکر مقبول ہوچکی ہیں،آپ ان دنوں جالندھر پنجاب میں مقیم ہیں اور مسلسل تخلیقی عمل میں مصروف ہیں۔آپ نے انگریزی کی دو کتابوں کا ہندی ترجمہ بھی کیا ہے۔آپ کوادبی خدمات کے اعتراف میں کئی سارے اعزازات سے سرفراز کیا جاچکا ہے،جس میں پنجاب سرکار کا گرانقدر شرومنی ساہتیہ کار ایوارڈ بھی شامل ہے۔

ہندی نظمیں : موہن سپرا _______________ مترجم :سلیم انصاری

(۱)

پریم،انتظار میں
پریم،انتظار میں ہے
منڈیر پر روز آ بیٹھنے والی چڑیا
کہ کب میں
روٹی کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑے پھینکوں
اور وہ کھا سکے
پریم،انتظار میں ہے
گملے کہ تلسی
کہ کب میں
گلاس بھر پانی اسے چڑھاؤں
اور وہ سرسبز ہو سکے
پریم،انتظار میں ہے
چندو کا ببلو
کہ کب میرے
منا کی رنگ برنگی پینٹ پھٹے

(۲)

پریم کے ساتھ، پریم ہی تو ہوا
مٹی نے خود کو سپرد کیا
اور گھڑا بن گئی
اینٹ بن گئی
پریم کے ساتھ، پریم ہی تو ہوا
پانی نے خود کو سپرد کیا
اور ندی ہو گیا
سمندر ہو گیا
پریم کے ساتھ، پریم ہی تو ہوا
بیج نے خود کو سپرد کیا
اور پھول بن گیا
شجر بن گیا
پریم کے ساتھ، پریم ہی تو ہوا

اور وہ اِترا سکے

پریم، انتظار میں ہے

میرے پریم کو

میرے پریم کو پسند ہے

سمندر کی لہروں کا شور

اور

اس کی وحشت

میرے پریم کو پسند ہے

طائروں کا چہچہانا

اور

ان کا دل پسند راگ

میرے پریم کو پند ہے

ہوا کی موسیقی

اور

اس کا نا قابلِ تسخیر جنون

میرے پریم کو۔۔۔۔۔

پریم، سچ میں

پریم، سچ میں

وضاحت ہے

ایک بڑے تغیر کا

ہر ایک کو خوف سے نجات دلائے گا

اس دھرم ویر کو پہچانو تو سہی

پریم، سچ میں

پناہ گاہ ہے

ڈھونڈنے پر ملنے کا

زندگی کی امید کا مفہوم ملے گا

اس کرم ویر کو پہچانو تو سہی

پریم، سچ میں

آواز کی موسیقی ہے

فرحت بخش بنائے رکھنے کا

ہر کسی کو دشا ملے گی

اس فنکار کو پہچانو تو سہی

جانو تو سہی

اڑیہ نظمیں: پرشانت کمار داش ____________________ مترجم :انور بھدرکی

(9284701553)

آج کی سوچ

ذات پات کونہیں

پہچانتا ہوں میں انسان کو

فرقہ واریت ،حسب ونسب کونہیں

جانتا ہوں میں انسانی زندگی کو

مذہب کونہیں ، مانتا ہوں میں انسانیت کو

رنگ ونسل پرنہیں

یقین ہے مجھے ذہنیت پر

زبان وبیان کونہیں

سمجھتا ہوں میں انسانی جذبات کو

جوسورج

ذات-پات

مذہب ونسل ونسب سے قطع نظر

روشنی دیتا ہے غیر متغیّر

کیا وہ نشہ باز ہے ؟

جوہوا

ذات-بےذات

چھوت-اچھوت

اونچ-نیچ ،امیر-غریب

زمین وزماں کی حدود سے پرے

عطا کرتی ہے زندگی

کیا وہ نافہم وبےوقوف ہے؟

کیا وہ قلاش ہے ؟

یا ہے ذہنی عوارض کا شکار ؟

کیا تم نے

کبھی پوچھا ہے سورج سے

کہ کیا ہے اس کی ذات،اس کا مذہب ؟

کیا کبھی پوچھا ہے ہوا سے

کہ کیا ہے اس کی نسل ،اس کا نسب ؟

ذات کے نام پر

مجھے کر سکتے ہو بےذات

مذہب کے نام پر

’’پکڑو پکڑو مارو مارو‘‘ بھی کہہ سکتے ہو

فرقہ کے تعرّض پر مجھے دے سکتے ہو شدید اذیت

سماج کے نام پر مجھے

سماج سے الگ کر سکتے ہو

اور میرا حُقّہ پانی بھی کر سکتے ہو بند

مگر میں نے تو سیکھا ہے

سورج سے غیر مبدّل جذبہ

کرتا رہوں گا میں ہوا کی مانند

سبھی سے پاک اور بےلوث محبت !

اڑیہ نظمیں: ڈاکٹر ہری دھل ________________ مترجم :انور بھدرکی

(9284701553)

ہتھیلی بھر آکاش

یہ لو
ہتھیلی بھر آکاش پکڑ کر
کھڑا ہوں سامنے
آکاش !
سینے میں وسعتیں بھر کر پکڑے رہتا ہے
آکاش بھر چاند تاروں کی پیکر یت
اور نیلی سپردگی کی- خاموش قبولیت
اس سے زیادہ
اور کیا دے سکتا ہوں میں تمہیں ؟
میری ہتھیلی میں ہے
پیار کی سپردگی
ہتھیلی بھر چاند کی ہنستی ہوئی قبولیت
دے رہا ہوں! لے لو !
ہتھیلی بھر آکاش
ٹھیک میرے پیار کی وسعت کی طرح
میرے ذہن کی پاکیزگی کی طرح
اس بار اٹھا لو ہتھیلی میں
دھوپ کی
شفّاف بوندوں کی طرح
بارش کی
بنا شرط سپردگی کی طرح
یہ ہے تمہارے لئے میری
التماس بھری خاموش قبولیت !

تبصرے

[تبصرے کے لئے کتاب کی دو جلدیں بھیجنا لازمی ہیں۔ منتخب تفصیلات پر ہی تبصرے شائع کئے جائیں گے۔ ادارہ]

کتاب کا نام : **سرہانے میر کے**

مصنف : احمد نثار مبصر : **علی احمد فاطمی**

ناشر : مرکزی پبلیکیشنز

صفحات : ۱۶۰، سنہ اشاعت : ۲۰۲۱ء، قیمت : ۱۷۰روپے

احمد نثار کے شعری مجموعہ ''سرہانے میر کے'' کا عنوان دلچسپ بھی ہے اور غور طلب بھی۔ سب جانتے ہیں کہ یہ خدائے سخن میر تقی میؔر کے ایک مکمل مصرعہ کا ادھورا ٹکڑا ہے۔ غور طلب بات یہ ہے کہ اس ادھورے ٹکڑے کو عنوان سخن کیوں قرار دیا۔ ممتاز شعراء کے مصرعوں کو عنوان قائم کرنے کی ایک روایت تو رہی ہے لیکن اس طرح سے ادھورا مصرعہ لے کر عنوان قائم کرنا بظاہر مضحکہ خیز لیکن بباطن معنی خیز دکھائی دیتا ہے عام خیال ہے کہ عمدہ و معیاری غزلیہ شاعری طرب سے زیادہ الم ۔ وصل سے زیادہ ہجر اور خارج سے زیادہ باطن کی مرہون منت ہے۔ اس کی سب سے عمدہ مثال خدائے سخن میر تقی میؔر ہی ہیں جس کے سرہانے بولنے کی ہمت تو غالب جیسے عظیم شاعر غالب کو نہ پڑی۔ میر یونہی تو عظیم نہیں ہوئے۔ ان کی عظمت کے کئی اسباب ہیں۔ ایک بڑا سبب یہ بھی ہے کہ انہوں نے نہ صرف غم کو نشاطِ غم میں بدلا بلکہ تہذیب غم کی تربیت کی تخلیق کی تب جا کر دیوان مرتب ہوا (رنج و غم کتنے کئے تو جمع دیوان کیا) فراق گورکھپوری جو میر کے نہ صرف معتقد تھے بلکہ کہیں کہیں مقلد بھی (ان غزلوں کے پردے میں تو میر کی غزلیں بولے ہیں) کہا کرتے تھے کہ عمدہ و معیاری شاعری کے لئے نہ صرف غم بلکہ شعورِ غم و تہذیب غم ضروری ہے جو تہذیب حیات تک لے جاتی ہے۔ اپنے ایک مضمون حقیقی شاعری کیا ہے؟ میں ایک جگہ لکھتے ہیں کہ شاعری کرنا جس قدر آسان ہے لیکن شاعری میں حقیقی روح پیدا کرنا اتنا ہی مشکل یہ روحِ شاعری کیا ہے؟ اسے ہی سمجھنا مشکل ہے۔ نہ شعور و فہم نہ تو کسی اکادمی کے اعزاز و اکرام سے آتا ہے اور نہ ہی کسی نقاد کی جا و بیجا تعریف و تحسین نہ شور و غل اور پبلی سٹی سے روح شاعری ہو یا روحِ افسانہ عموماً غم زدگی۔ زخم خوردگی۔ والہانہ سپردگی اور سنجیدہ بالیدگی سے پیدا ہوا کرتی ہے جو غیر معمولی احساس و شعور، ادراک و آگہی کا مطالعہ رکھتی ہے۔ جو میر میں تھی۔ غم زدگی تو فانی میں بھی تھی لیکن وہ غم کی نشاطیہ کیفیت اور حیات کی رمزیت کو اس طرح نہ سمجھ سکے وہ اشک فسانی اور گریباں شکنی کو ہی

اظہار کا پیمانہ سمجھتے رہے۔میر نے اسے قلب وجگر میں جذب کیا اور ایک ایسی سوزش اور دردمندی پیدا کردی جو ہر اک کے بس کی بات نہ تھی۔تبھی تو میر نے کہا۔

میرے رونے کی حقیقت جس میں تھی

ایک مدت تک وہ کاغذ نم رہا

اور غالب نے اسے فلسفہ کی شکل دیتے ہوئے کہا

عشرتِ قطرہ ہے دریا میں فنا ہوجانا

درد کا حد سے گذرنا ہے دوا ہو جانا

کتابوں کی بھیڑ بھاڑ اور شوروغل میں جب عالمی فلک کے مدیر احمد نثار کا شعری مجموعہ موصول ہوا تو سب سے پہلے عنوان اور سرورق نے ہی متوجہ کیا اس کے بعد سلیم انصاری کا یہ جملہ بھی متوجہ کر گیا......''ان کی شاعری نہ صرف درد کی تہذیب کا خوبصورت اظہار ہے بلکہ جینے کا حوصلہ بھی عطا کرتی ہے۔''اس جملہ میں درد اور حوصلہ بظاہر متضاد احساس ہے لیکن عمدہ شاعری تضاد اور تلاطم سے ہی وجود میں آتی ہے اور اسی سے ایسے Paradoxes بنتے ہیں جو نہ صرف جہت وعکس عطا کرتے ہیں بلکہ سپاٹ پن اور اکہرے پن سے بھی الگ کرتے ہیں۔اس کے بعد ممتاز شاعر وادیب رؤف خیر نے بھی ایک جگہ لکھا......''زندگی دھنک رنگ آئینوں سے عبارت ہے تو بے رنگ کیسے ہوسکتی ہے اگر جذبہ صادق ہو تو کنواں پیاسے تک آجاتا ہے......''انہوں نے ایک اور اچھی بات کہی......زمانے کے ساتھ ساتھ محاورہ بدل جاتا ہے اور احمد نثار نئے لہجے کے شاعر ہیں۔''اب اس کا کیا کیا جائے کہ بامعنی وبامقصد شاعری کے لئے شعور جذبہ کی صداقت۔احساس واضطراب کی دبازت اور زندگی کی معنویت تو ہر دور میں رہی ہے بدلی ہوئی صورتوں میں بھی۔دیکھنا یہ ہے کہ شعری روایت کا احترام اور جدید تقاضوں کے التزام کس قدر مفکرانہ وفنکارانہ طور باہم مدغم ہوئے ہیں صرف لہجہ کی تبدیلی کافی نہیں ہوا کرتی۔زندگی کے نئے کیف وکم اور پیچ وخم کو بھی سمجھنے کی ضرورت ہے۔اب میں براہ راست احمد نثار کے چند اشعار پیش کرتا ہوں۔

دھند چھٹنے کو ہے موسم نئے امکان بنے

ہم زمانے کے لئے رستہ آسان بنے

ہے پس و پیش فقط مجھ کوتن آسانی سے

مسئلے اور بڑھاؤں تو کوئی حل نکلے

دہلیز پر جلتے ہیں چراغوں کی طرح ہم
کس دھند میں کھوئے ہیں گھرانے نہیں ملتے
کچھ پیڑ خزاؤں میں بھی شاداب ملیں گے
ہر شخص کو موسم کے خزانے نہیں ملتے
مصیبتوں میں جلے تھے شجر امیدوں کے
مگر جڑوں سے نئی روشنی نکلنے لگی

اب میں ایک غزل کے چند اشعار بھی پیش کرتا ہوں۔

نمو ملی تو لبادہ نیا بدلنے لگے
ہوا چلی تو شجر سردیوں میں جلنے لگے
نیا فلک ہو اگر بازوؤں کو پھیلائے
مری زمیں بھی اُدھر پاؤں پاؤں چلنے لگے
مرے لہو سے بجھانا مرے چراغوں کو
کبھی سفر میں تمہیں روشنی جو کھلنے لگے
کبھی بکھیر دے قدموں میں میرے تاریکی
چراغ بن کے کبھی راستوں میں جلنے لگے
گلے سے بڑھ کے اگر آج وہ لگالے مجھے
تو مدتوں کی جمی برف بھی پگھلنے لگے

مثالیں اور بھی ہیں بہر حال ان اشعار سے آپ اندازہ لگا سکتے ہیں کہ احمد نثار کی پریشانی اور غم زدگی ہی انہیں تخلیقی طور پر مہمیز کرتی ہے اور بات مہمیز تک ہوتی تب بھی حیرت کی بات نہیں لیکن اس مہمیزی رہ زندگی کی رمق اور روشنی کی کرن دیکھتے ہیں ان کا یہ رجائی زاویۂ نظر ہی انہیں قابلِ قدر شاعر بناتا ہے اور ہم عصروں سے الگ بھی کرتا ہے۔ ایسا اس لئے بھی ہے کہ وہ صرف شاعری کا نہیں میر کا ہی نہیں زندگی اور انسان کا شعور رکھتے ہیں۔ کہیں کہیں تو یہ شعور زیادہ بیقرار ہو کر ایسے اشعار بھی کہلوا دیتا ہے۔

میں کسی گنگ کا نعرہ نہیں ہونے والا
اس کا دستور گوارا نہیں ہونے والا
ہم سمجھتے ہیں نزاکت سبھی رشتوں کی میاں
بے غرض کوئی ہمارا نہیں ہونے والا
ہے آج مسئلہ دشوار کل نہیں مشکل
ہو آسمان زمیں کا بدل نہیں مشکل
شروع میں تو ہے دشوار منزلوں کا سفر
بس ایک عزم ہے درکار چل نہیں مشکل

ایک ترقی پسند ادیب کی حیثیت سے میں اس نوع کے اشعار کو پسند کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ جیسے زندگی کے مختلف رنگ ہوا کرتے ہیں شاعری کو بھی اسی طرح رنگا رنگ ہونا چاہئے ۔ جو لوگ شاعری میں روایتی جمالیاتی رنگ دیکھنے کے عادی ہوتے ہیں انہیں ایسے اشعار نقلی اور غیر حقیقی معلوم ہوتے ہیں۔ شاعری میں رومان اور جمال کی قدر و قیمت سے کسے انکار ہوسکتا ہے۔ تغزل اور تجمل کی اہمیت سے بھی انکار ممکن نہیں لیکن غزل پرانی ہو یا نئی اس کے لئے اگر تغزل ضروری ہے تو ساتھ ہی تفکر بھی۔ شاعری کا کام محض مسرت پہنچانا نہیں اس کا معیار اتنا نہیں گرانا چاہئے اسے اپنے عہد کی تصویر تعبیر بلکہ کہیں کہیں تنقید بھی ہونی چاہئے۔ اس کے لئے شاعری کے ساتھ ساتھ نظریۂ شاعری کی بھی ضرورت ہوتی ہے اور نظریۂ شاعری بھی اُسی وقت ممکن ہے جب کوئی نظریۂ حیات ہو۔ فیض سے کسی نے انٹرویوں میں سوال کیا کہ آپ اتنے مقبول شاعر ہیں پھر بھی آپ کے پاس مقدار شاعری اس قدر کم کیوں ہے؟ فیض نے مسکرا کر جواب دیا...... کم شاعری کرنا اتنا بڑا گناہ نہیں جتنا کہ بے مقصد شاعری کرنا گناہ ہے۔

میں شاعری کے لئے یا کسی نوع کی فنکاری کے لئے کسی شرط کا تو قائل نہیں لیکن بے مقصد شاعری اور بے مقصد زندگی کے خلاف ضرور ہوں اور یہ بھی سمجھتا ہوں کہ شعر و ادب کے معاملات بڑے عجیب و غریب ہوا کرتے ہیں وہ اکثر ناہموار ماحول میں ہی نمو پاتی ہے۔ ہر دور میں اس کی نشو و نما کے معاملات بھی مختلف رہے ہیں لیکن پھر بھی شاعری ہوتی رہی ہے۔ ممتاز ناقد احتشام حسین نے اپنے ایک مضمون (ادیب کی انفرادیت اور عصری رجحانات) میں لکھا ہے کہ اگر انسان دیوانہ اور بے حس نہ ہو تو گرد و پیش کے حالات سے متاثر ہونا اس کے لئے لازمی اور فطری ہے۔ ادیب اپنے زمانے اور معاشرے میں گرفتار بھی ہے اور انفرادی تخلیق اظہار میں آزاد بھی

حالانکہ یہ آزادی کبھی مکمل اور مطلق نہیں ہوتی۔ انفرادیت سماجی تضادات و تفادات کے پردے میں ہی اپنا اظہار کرتی ہے۔ انفرادی زندگی مختلف سماجی محرکات سے ہی مرکب ہوتی ہے۔ غزلیہ شاعری کو بھی شاعر کی انفرادیت اور سماج کی حقیقت اور زندگی کی سفاک حقیقت کے درمیان تلاش کیا جاسکتا ہے۔ ترقی پسند فنکاروں نے بدصورتی میں خوبصورتی کو تلاش کر کے ایک نئی زمینی وانسانی جمالیات کو پیش کر کے تاریخی کارنامہ انجام دیا۔ جدید اور مابعد جدید شاعری کی جمالیات وشعریات کیا ہے یہ غور طلب تو مسائل ہیں لیکن ان پر کوئی غور کرنے کے لئے تیار نہیں۔ صرف نئے پن کا ہونا کافی نہیں اور یہ نیا پن بھی صرف لسانی ہے، تہذیبی وثقافتی اور جمالیاتی؟

دور کوئی بھی ہو اور شاعری بھی کسی نوع کی ہو وہ کسی دور میں انسان اور نسانی معاشرہ سے الگ نہیں ہوسکتی لیکن میں یہ بھی کہتا چلوں کہ شاعری کو پہلے شاعری ہونا چاہئے۔ جدید یا مابعد جدید بعد میں اور اس میں شک نہیں کہ احمد نثار کی شاعری پہلے شاعری ہے بعد میں کچھ اور...... لیکن اس کچھ اور میں سبھی طرح کی جھلک دکھائی دیتی ہے۔ روایت کا احترام، جدیدیت کا التزام اور عزم وحوصلہ کا مزاج بھی جس کی آج بڑی ضرورت ہے انہیں کے دو اشعار پر گفتگو کو تمام کرتا ہوں۔

ہوا کے روبرو جو ہر ہمارے
کھڑے میں عزم ہی ڈٹ کر ہمارے
چلے آنا کبھی فرصت ملے تو
بسا اک شہر ہے اندر تمہارے

کتاب کا نام : **عکس گم گشتہ**

شاعر : شعیب نظام مبصر : **پروفیسر کوثر مظہری**

صفحات : ۱۴۸، قیمت : ۲۰۰ روپے

سفر سرابوں کا بس آج کٹنے والا ہے
کہ میرے پاؤں سے دریا لپٹنے والا ہے

سفرِ سراب کی اذیت اور 'دریا' کے پاؤں سے لپٹنے کی سرخوشی، یہ دو محاذِ زندگی شعورِ انسانی کے توازن کے لیے ضروری ہوتے ہیں۔ بہت سیدھے سچے انداز میں دیکھیے تو خوشی اور غم کی باتیں ہیں۔ مصائب وآلام کے بعد مسرت آگیں لمحات میسر آتے ہیں۔ یعنی ان دونوں فطری رویوں (محاذوں) کے درمیان انسان کی زندگی چلتی

رہتی ہے۔شعیب نظام نے اسی انسانی نفسیات اور فطری رویوں کو تخلیقی وجدان کی روشنی میں پیش کیا ہے۔ یہاں اس بات کا ذکر بھی کیا جاسکتا ہے کہ ان دونوں فطری رویوں سے گریز یا فرار کسی طرح بھی ممکن نہیں۔ یہ بھی جاننا ضروری ہے کہ انسانی زندگی انہی تناقضات کے درمیان گزرتی ہے۔خوشی اور غم یا پھر یاس اور امید۔فرار تو کسی بھی طرح ممکن نہیں۔شعیب نظام کو بھی اس کا یقین محکم ہے:

خود سے فرار اتنا آسان بھی نہیں ہے　　سائے کریں گے پیچھا کوئی کہیں سے نکلے

پھر یہ کہ انسانوں کی تحلیل نفسی بھی ملاحظہ کر لیجیے:

کوئی قطرے میں سمندر دیکھ کر سیراب ہے　　کوئی دریا سے مسلسل تشنہ کام آتا ہوا

شعیب نظام کے فکری ابعاد میں عشقیہ رموز کی پرچھائیاں بھی ملتی ہیں۔ یہ عشقیہ مضمون یوں تو قدیم بھی ہے، فرسودہ بھی، لیکن اس کا جادو ہمیشہ سر چڑھ کر بولتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اس مضمون میں چمک اور جہت پیدا کرنا بہت آسان نہیں رہ گیا ہے کیونکہ کلاسک عہد سے لے کر ترقی پسند اور اس کے بعد کے شعرا نے اس مضمون کو مختلف زاویوں اور رنگوں میں پیش کیا ہے۔محبوب سے نسبت خاص کا ذکر ہو، یا پھر اس کی یادیں یا خیالات۔شعیب نظام کے یہ اشعار دیکھیے ؎

جلتا بجھتا ایک جگنو کی طرح تیرا خیال　　بس یہی نسبت ہے اپنی رات کو تنویر سے
پتہ میں نے اس کا جو گم کردیا　　تو یاد آئے اُس کے قرینے بہت
خود اس کے ساتھ مجھے بھی بہت عجیب لگا　　پکارنا اُسے بے ساختہ دوبارہ مجھے
یہ کیا ہوا شب تنہائی کیوں مہک اُٹھی　　تو کیا خیال بھی خوشبو خصال ہے اس کا
ایک مبہم سا تصور ایک بے چہرہ سا نام　　میری تنہائی میں اکثر میرے کام آتا ہوا

شعیب نظام کے یہاں اس نوع کے مضمون کی پیش کش میں شدت کے بجائے ایک طرح کی سنجیدہ گداختگی اور نرم لہجگی کا عکس نظر آتا ہے۔اس عکس میں کئی رنگوں کی ترنگیں ہیں مگر ان میں بھی جھرنے کا شور نہیں بلکہ آہستگی سے بہتے ہوئے آبشار کی نغمگی ہے۔اوپر جو اشعار پیش کیے گئے ہیں ان میں لفظوں کے برتنے کا جو تخلیقی انداز ہے، وہ بھی لائق توجہ ہے۔ابہام میں بھی تو ہم سے زیادہ وہ یقین سے قریب ہوتے ہیں۔ پہلے، تیسرے اور پانچویں شعر میں آپ دیکھیے کہ کس طرح خیال کو جگنو، خیال کو، خوشبو خصال اور مبہم تصور کو 'تنہائی میں کام آتا ہوا' دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ محض التباس نہیں ہے، Illusion نہیں ہے، بلکہ خیال کو التباس آسا تیقن کا درجہ دیا

گیا ہے۔ یوں بھی ہم سب انسانی معاشرے میں التباس آساتیقن کے سہارے ہی جیے جاتے ہیں۔ کوئی دوسرا راہ فرار بھی نہیں۔ یوں بھی شعیب نظام 'عکس گم گشتہ' کی جستجو میں ہیں۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ یہ 'عکس گم گشتہ' التباس آساتیقن کی 'ردا' ہے۔ اس 'ردا' کی حرمت وتکریم تخلیقی سطح پر بڑھ جاتی ہے۔ تخلیق کار پراس کے تحفظ کی ذمہ داری عائد ہوتی ہے۔ شعیب نظام چونکہ اس 'ردا' کی تحفیظ وتکریم کے لیے اپنے پاس تخلیقی ہنرمندی رکھتے ہیں، اس لیے سب کچھ خوبصورت اور رچا بسا معلوم ہوتا ہے۔

ماحول اور معاشرے کی سفا کی اور پراگندگی سے ایک طرح کا نقشہ ابھرتا ہے جس میں ویرانی اور دہشت نا کی کے نقوش نظر آتے ہیں۔ سیاسی بدقماشیوں اور شعبدہ بازیوں نے انسانیت کے سینے کو چاک کرنے کی کوششیں کی ہیں۔ یہ چند شعر ملاحظہ کیجیے جن سے عصری معنویت واضح طور پر سمجھ میں آسکتی ہے:

تجھے شناخت نہیں ہے مرے لہو کی کیا
میں روز صبح کے اخبار سے نکلتا ہوں

خنجر ظلمت ہمارے سر قلم کرتے رہے
اور ہم بیٹھے دعائیں خود پہ دم کرتے رہے

زمیں سمٹ کے آگئی ہے پنجۂ عقاب میں
اور آسماں بھی چھپ گیا ہے شہپروں کے درمیاں

ظلمت کے کاروبار میں، اس کا بھی ایک دن
چہرہ غبارِ شب سے اُٹے تو پتہ چلے

دنیا میں موضوعات اور مضامین بہت سے ہیں، لیکن ایک حساس فنکار اپنے آس پاس کی روشنی اور اندھیری دنیا کو پہلے دیکھتا ہے۔ پھر تہذیب کے ٹمٹماتے دیوں پر اس کی نگاہ رک جاتی ہے۔ تمام تر انتشار، خلفشار اور بدعقیدگیوں کی دُھند میں اس کے اندر کا انسان صداقتوں کی جستجو کرتا ہے۔ اس کی اضطراب آسا روح ایک عجیب سی کیفیت میں مبتلا رہتی ہے۔ رزم وبزم یا عیش وطرب اور محرومی یہ سب جیسے گڈمڈ سی ہوتی ہوئی مجرد اشیا میں مبدل ہونے لگتے ہیں۔ بے نام سی، چھوٹی سی دنیا جسے وہ Explore کر کے دنیا والوں کو دکھانا چاہتا ہے۔ شعیب نظام اسی قبیل کے تخلیقی فنکار ہیں:

کرو بلند کہ حرف دعا غنیمت ہے
سکوت شب میں یہی اک صدا غنیمت ہے

خود اپنی ذات کا عرفاں نہیں رہا ورنہ
یہ بحر و بر بھی سمجھتے تھے کل اشارہ مرا

کچھ چراغ نو کو جلنے کا سلیقہ بھی نہیں
کچھ ہوا بھی ان دنوں پھرتی ہے دیوانی بہت

اتنا نور کہاں سے لاؤں تاریکی کے اس جنگل میں
دو جگنوں ہی پاس تھے اپنے جن کو ستارہ کر رکھا ہے

ابھی بھی وقت ہے اٹھا لے پائمال ہی سہی
ابھی وہ شے چمک رہی ہے ٹھوکروں کے درمیاں

دُھند میں روشن ہوتی ہوئی نشاط امید کی شمع جیسے جھلملا رہی ہو۔اس شمع کے لیے شعیب نظام کی تخلیقی پرواز کبھی فانوس کا کام کرتی ہے تو کبھی سرپھری ہواؤں کا رخ موڑنے اور دم گھونٹنے کا کام کرتی ہے اور یہ سب کچھ اس آہستگی سے ہوتا ہے کہ جیسے بادصرصر میں کوئی سوکھا ہوا پتا بھی ہلتا نہ ہو۔یہی ہے ان کے ایک پختہ کارفنکار ہونے کا جواز۔شعیب نظام کے اس تیور کو سلام کرتے ہوئے اجازت!

دوعالم آگ بن جاتے ہیں جب بھی　　ہم اشکوں سے بجھا لیتے ہیں تھوڑا

○

کتاب کا نام : **دیکھ لی دنیا ہم نے**

مصنف : غضنفر　　مبصر : **ڈاکٹر رمیشا قمر**

صفحات : 336　قیمت : 350 روپے　اشاعت : 2021

ناشر　: عرشیہ پبلی کیشنز، دہلی

کہو" دیکھ لی دنیا ہم "نے رمیشا
غضنفر کے اس تجربے کی نظر سے

(رمیشا قمر)

"دیکھ لی دنیا ہم نے" کتھا ہے ایک کتھا کار کی، زندگی ہے ایک تخلیق کار کی، خواہش ہے ایک فن کار کی ،انوکھے اور انمول جذبوں کے کلاکار کی، فکشن اور شاعری کے اداکار کی، پانی کو استعارہ بنانے والے کہانی کار کی ،ہندی اور اردو شبدھوں کو دینے والے نئے آکار کی، اپنے تجربات و مشاہدات کو بنانے والے شاہکار کی، شعروں سے سر بنانے والے سنگیت کار کی، صلح کروانے والے صلح کار کی، اچھائی تلاشنے اور بیان کرنے والے نیکو کار کی اور سب سے اہم "دیکھ لی دنیا ہم نے" کتاب ہے ایک قلم کار کی یعنی ہست کار غضنفر کی۔

غضنفر نام ہے ۵۰ سال تدریسی خدمات اور اردو زبان وادب کے فروغ کے لیے کئی کارنامے انجام دینے والے استاد کا۔ان کے یہ بلند حوصلے ،عزم مصمم اور جہد مسلسل والی طبعیت انھیں بھلا کیسے خاموش بیٹھنے دیتی،غضنفر جو کہ خود تخلیق اور تدریس کا استعارہ ہے جو خدا نے ان کے اندر ودیعت کیا ہے یہ تدریسی شعلہ ریٹائرمنٹ کے بعد پھر سے بھڑ کنے لگا تو انھوں نے اپنے تجربات و مشاہدات کا ایک ایسا مکتب کھولا جسے پوری دنیا استفادہ کر سکے۔اپنے" اسکول آف ایموشنز اینڈ ایکسپیریمنٹ" (school of emotions and

(experiments سے درس وتدریس کا ایک نیا راستہ کھوج نکالا جو' دیکھ لی دنیا ہم نے'' کی شکل میں ۔۔۔آج کل ہر رسالے، ہراخبار، ہر پورٹل پر کئی مضامین اس کتاب کی مقبولیت اور انفرادیت میں اضافہ کرر ہے ہیں بہت سارے ناقدین و ماہرین ادب نے نہ صرف اسے خودنوشت ناول کہا ہے بلکہ کتاب میں مشہورو معروف فکشن رائٹر سید محمد اشرف بعنوان ''غضنفر کی خودنوشت ۔ چند تاثرات'' میں لکھتے ہیں۔

''آپ بیتی لکھنا آسان کام نہیں ہے آپ بیتی لکھنے میں دور کاوٹیں قدم قدم پر دامن گیر ہوتی ہیں۔دوسروں کا خوف اور اپنے آپ سے محبت ۔خودنوشت سوانح میں مصنف نے تاریخ کے پس منظر میں اپنی ذات اور شخصیت کی کہانی بیان کرتا ہے۔اپنی شخصیت کے بارے میں لکھنا اتنا مشکل نہیں جتنا اپنی ذات کی گہرائیوں میں اتر کر دور نظر آنے والے پانی کی تہہ سے صدف برآمد کرنا۔خودنوشت سوانح کا سب سے بڑا جوہر صداقت ہے۔غضنفر اپنی آپ بیتی'' دیکھ لی دنیا ہم نے'' میں ان تمام مراحل سے سرخ رو گذرے ہیں۔

(دیکھ لی دنیا ہم نے:از:غضنفر ص ۹)

بلاشبہ خودنوشت سوانح عمری ایک سخت دشوار اور قوت فیصلہ کو متزلزل کردینے والی صنف ہے۔آپ بیتی کیا ہے۔عبدالحمید قریشی اس سلسلے میں رقمطراز ہیں۔

''آپ بیتی یا خودنوشت سوانح حیات وہ کتاب ہے جس کے اوراق میں انسان حیات مستعار کے مختلف ادوار کو بلا کسی تکلف اور تصنع کے دوسروں کے سامنے پیش کرتا ہے کہ کن حالات میں اس جہان رنگ و بو میں آنکھیں کھولیں، کس طرح سے وہ طفیل شیر خوار سے لڑکپن کی منزل میں داخل ہوکر اس کا زمانہ طالب علمی کیسے سیر ہوا،عروس شباب نے کیونکر اسے خوش آمدید کہا، زندگی میں کامرانیوں اور کامیابیوں نے کیسے اس کا خیر مقدم کیا۔ان کے ساتھ تلخیاں، محرومیاں اور ناکامیاں کیسے اس کی راہ میں سنگ ہائے گراں بن کر حائل ہوئیں اور کس طرح وہ اس گرداب بلا سے اپنی کشتی حیات کو بچاتا ہوا نکلا زندگی میں آدمیوں سے اس کا سابقہ پڑا اور ان کے متعلق اس کی آراء اور تاثرات کیا ہیں اس زمانہ کا طرز معاشرت اور رہن سہن کیسا تھا اور رسم ورواج کی کیا

کیفیت تھی غرض آپ بیتی کے روپ میں ایک دور کی ہماہمی اور گہما گہمی پوری طرح جلوہ گر ہوتی ہے۔

(عبدالحمید قریشی: آپ بیتی اردو ادب میں: آپ بیتی نمبر ۱۹۶۴ص ۲۹)

زندگی کے حقائق کو افسانوی رنگ میں پیش کرنے کا فن شاہکار تخلیق کا باعث بنتا ہے سوانح کو افسانوی رنگ میں پیش کرنا سوانحی ناول کہلاتا ہے اسی طرح خودنوشت سوانح عمری کو جب افسانوی رنگ میں پیش کیا جائے تو اس کے لیے خودنوشت سوانحی ناول کی اصطلاح استعمال کی جاتی ہے۔مصنف زندگی کے تجربات ومشاہدات کی بنیاد پر ہی ناول تخلیق کرتا ہے اس لیے اس میں سوانحی عناصر کا شامل ہونا بعید از قیاس نہیں اور کہ دنیا کو دیکھنے کا عدسہ مصنف کی ذات ہے جس کے گرد تمام واقعات گھومتے ہیں اور اس دنیا کو دکھانے کا مقصد، ذات وصفات کے جلوئے دکھانا ہے کیونکہ آدمی کی صفات میں تاریخ، خاندان، ماحول اور زمانے کا بڑا عمل دخل ہے مگر ذات کا معاملہ بڑا نازک ہوتا ہے اپنی ذات تک رسائی اور پھر صبر وتحمل بیان کرنا آسان کام نہیں،عرفان ذات کے پس منظر میں سبق آموز واقعات اور تجربات کا لامتناہی سلسلہ ہوتا ہے یہ ذاتی تجربات ہوتے ہیں مگر ان کو انسانی تجربے خیال کر کے ان سے استفادہ کیا جاسکتا ہے اور یہی اچھے معیاری ادب کا کام ہے میں تو یہ کہوں گی کہ اپنے تجربات اور دستاویزی معلومات کو خوبصورت انداز میں پیش کرنے کا نام ہی ادب ہے۔جس میں افسانے کی آمیزش ضروری ہے اور کیا چھپانا ہے؟ کیا پیش کرنا ہے اور کس طرح پیش کرنا ہے؟ یہی مرحلہ سب سے اہم ہوتا ہے اس کی بہترین مثال غضنفر کی خودنوشت ناول ”دیکھ لی دنیا ہم نے“ ہے۔دنیا جس کے پیچھے ہم بھاگتے ہیں خواب اور خواہشات جو بہت مختصر بھی ہوتی ہیں اور اتنے طویل بھی کہ انھیں پورا کرنے کے چکر میں زندگیاں گزر جائیں اور ہاتھ کچھ نہ آئے۔

عرشیہ پبلی کیشنز: عمدہ طباعت منفرد سرورق اور اچھے کاغذ کے لیے داد کی مستحق ہے اور سرورق پر خود مصنف ظاہر اور باطن کی آنکھ سے پراسرار اور معنی خیز مسکراہٹ کے ساتھ ایسے براجمان ہیں کہ جیسے بتا رہے ہوں یہ لیجئے جناب یہ رہی میری دیکھی ہوئی دنیا آپ بھی دیکھ لیں۔اگر پسند نہ آئے تو پیسے واپس۔آغاز قصہ میں مصنف خود لکھتے ہیں۔

”سرشت جنوں میں کیسی کیسی ہشیاریاں اور دشت جنوں میں کیا کیا گل کاریاں ہوتی ہیں؟ دشت جنوں سے کیسے معرکے سر ہوتے ہیں؟ ان معرکوں میں کس کس

کے سر گرتے ہیں؟ کس کس کے دھڑ الگ ہوتے ہیں کس کس کے بازو کٹتے ہیں؟ کس کس کے پاؤں ٹوٹتے ہیں؟ کس کس کے جسم و جاں لہولہان ہوتے ہیں؟ انگشت جنوں کیسے کیسے منظر بناتی ہے؟ کیا کیا رنگ دکھاتی ہے؟ کن سرخیوں سے زردیاں ابھرتی ہیں؟ کن زردیوں میں سرخیاں دمکتی ہیں؟ ان سرخیوں اور زردیوں سے کیسی کیسی شعاعیں پھوٹتی ہیں؟ اور وہ شعاعیں کہاں تک پہنچتی ہیں؟ کس کس تک کی جاتی ہیں؟ یہ سب کچھ سامنے نہیں آتا''۔

(دیکھ لی دنیا ہم نے: غضنفر ص ۷ تا ۸)

یہ غضنفر کی دنیا ہے جناب! ہمت و حوصلہ مندی، جرات مندی، جواں مردی، عزم و استقلال اور صبر و تحمل سے اپنے وجود میں شراروں کی فصل کے ساتھ زندگی بسر کرنے والے کی دنیا۔ ایک ایسے انسان کی دنیا جو معاشرے کی بے توجہی، اذیت رسانی اور استحصال کا بھی شکار رہا لیکن پوری قوت کے ساتھ قدم قدم آگے بڑھتا رہا، طوفانوں کا مقابلہ کرتا رہا اور زندگی کے سرسبز مرغزاروں کے حصول میں کامیاب رہا اور اپنی ذہانت و علمی تعمق کے بل بوتے پر اپنی ایک مستحکم شناخت بنائی۔ وقت کا دھارا اور بہاؤ، دریا کی بے کرانی، غضب ناکی و خشم گیتی کا بھی انھیں مسلسل احساس رہا اور اس کیفیت کا اظہار ان کی نظم و نثر دونوں میں ملتا ہے۔ ان کی کہانیوں میں پانی سے جڑے مختلف عوامل و عناصر، مسائل و مشکلات، اہمیت و عظمت، پیاس کی شدت جھلک دکھاتے ہیں بلکہ پانی ایک استعارے کی شکل میں موجود ہے اور وہ بھی آتش سیال کی طرح۔۔۔ اسی لیے انھوں نے اپنے ناولوں کے نام پانی، کینچلی، کہانی انکل، دویہ بانی، فسوں، شور آب، وش منتھن، مم اور مانجھی وغیرہ رکھے ہوں گے۔ زندگی کی پر پیچ راہوں سے گزرتے ہوئے تعلیمی، ادبی، علمی اور انتظامی تعمق کے بل بوتے پر اپنی نئی دنیا پیدا کی۔ اقبال کے اس شعر کے مصداق:

اپنی دنیا آپ پیدا کر اگر زندوں میں ہے
سرِ آدم ہے ضمیر کن فکاں ہے زندگی

غضنفر کی ان ہی کاوشوں کا قلمی نمونہ ہے ''دیکھ لی دنیا ہم نے''۔ جس میں ابتدائی حالات میں بچپن کے کچھ واقعات کے اہم پہلوؤں پر روشنی ڈالی ہے ماحول اور حادثات کو پیش کرنے میں سلیقہ مندی سے کام لیا ہے۔ تعلیمی سفر، شاعری کی ابتداء، مشاعروں و ادبی مجالس میں شرکت، والد کا علی گڑھ میں داخلہ لینے سے منع کرنا علی گڑھ کی علمی و ادبی فضا میں ان کی تخلیقی و تعلیمی مدارج طئے کرنا، اساتذہ سے محبت اور ان کی شفقت، کچھ اساتذہ اور

دوست احباب کی مخالفت، ملازمت کے حصول کی کٹھانیاں، محبت کا بیان، شادی کی مختصر داستان، ذاتی احوال کے مختصر تذکرے، ملازمتی اسفار کا تفصیلی گیان اور اس کے ساتھ ان شہروں کی معاشرت، طرز زندگی اور تہذیب کا بیان بھی ملتا ہے۔

ہمارے ناقدین، مبصرین اور ماہرین زبان وادب نے اسے خودنوشت ناول ہے۔۔میں تو یہ کہنا چاہوں گی کہ اس میں کئی اصناف کے نمونے ملتے ہیں۔سوانح کی جھلک بھی ہے شاعری کی چمک بھی، افسانہ کی دھمک بھی، ڈرامہ کی للک بھی ہے، سفرنامہ کی کھنک بھی ہے، خاکہ کی دھمک بھی، یادوں کی مہک بھی، غرض 'دیکھ لی دنیا ہم نے' ست رنگی اصناف کی دھنک لیے ہوئے ہے۔

'دیکھ لی دنیا ہم نے' ہے تو خودنوشت ہی مگر غضنفر کی بے پناہ تخلیقیت اور مختلف اظہار بیان پر ان کی قدرت اور مختلف النوع انداز کے تجربات ومشاہدات اور ان کے تخیل کی بلند پروازی نے اس میں کئی تخلیقی رنگ گھول دیئے ہیں آیئے ان رنگوں کو دیکھتے ہیں۔۔۔ اس میں اشعار کی فراوانی ہے جو کہانی کو روانی عطا کر رہی ہے شعر ونثر دونوں پر مصنف کو دسترس حاصل ہے برمحل اور فی البدیہہ اشعار کا استعمال اس طور کرتے ہیں کہ گویا وہ اشعار ان کے نثری خیال کے ترجمان بن جاتے ہیں۔مثالیں ملاحظہ کیجئے۔

کہ اس کے اردگرد ایسی بہت ساری لوریاں جاگ رہی ہیں
جن کے جاگنے کا مقصد ہی یہ ہے
کہ میرا کام ہو جائے
مجھے ڈر لگتا ہے کہ کہیں ایسا ہو
تو بہت کچھ ہو جائے گا
بہت کچھ کھو جائے گا
(ص ۸۸)

یاروں نے جاکے خوب زمانہ سے صلح کی
میں ایسا بدمداغ یہاں بھی بچھڑ گیا
(ص ۹۹)

کاش یہ راز عیاں مجھ پہ نہ ہوتا کہ مرا

دوست بھی دل میں مرے واسطے شر رکھتا ہے

ایسے کئی اشعار ان کے اسلوب کی زینت بنے ہیں فی البدیہہ اشعار سے ان کے شاعرانہ وصف کا پتا چلتا ہے کہ شاعری میں کیسی قدرت رکھتے ہیں ان کے دو شعری مجموعے شائع ہو کر داد و تحسین حاصل کر چکے ہیں اردو کی ایسی شعری صنف جو دور حاضر میں دم توڑ چکی ہے اس کو پھر سے حیات بخشی ''مثنوی کرب جاں'' آج کے اس دور میں نہ صرف سانسیں لے رہی ہے بلکہ اپنے وجود کا احساس پھر سے کروا چکی ہے۔

نثر بھی شاعرانہ ہے جہاں قافیہ پیمائی بھی ہے اور لفظوں کی جمالیاتی تنظیم و ترتیب بھی۔۔ جو قاری کو اپنی جانب ملتفت کرتی ہے۔الفاظ خود بخود نوک قلم پر آ جاتے ہیں تنظیمی امور کے جتنے واقعات بظاہر عام آدمی کی دلچسپی سے باہر کی چیز ہے لیکن غضنفر کے دلکش اور متاثر کن اسلوب نے انھیں بھی اہم بنا دیا ہے بات سے بات پیدا کرنا اور لفظوں سے خوبصورت منظر بنانا انھیں خوب آتا ہے یہی وجہ ہے کہ اس ضخیم کتاب کو پڑھتے ہوئے اکتاہٹ محسوس نہیں ہوتی۔اقتباسات سے آپ کو اندازہ ہو جائے گا۔

''ایک منزل وہ بھی تھی جہاں محبت کا رس ٹپکتا تھا،خلوص کا شیرہ بنتا تھا،لطف وانبساط کی شیرینی بٹتی تھی جہاں پہنچ کر شیریانوں میں مٹھاس گھلتا تھا جہاں مجھے انسانی قدروں کی خوشبو ملی،نیک جذبوں کا رنگ ملا،خلوص کے لمس کا ذائقہ حاصل ہوا جہاں میں سخاوت کا گر سیکھا رواداری کا درس پایا بے غرض خدمت گزاری کا سبق پڑھا قریب کرنے اور قریب ہونے کا ہنر حاصل کیا۔''

(ص۱۶۹)

''بنچے تھے تو دفتری بابو مگر وہ بابوانہ خصائص سے عاری،رشوت خوری سے دور،ایذا رسانی سے پاک،طمع سے پرے،فکر پرموشن سے آزاد،تنگی ذہن سے الگ،جذبۂ انتقام سے خالی اور اپنے سے بڑوں اور اونچے عہدوں والوں کو نیچا دکھا کر خوش ہونے والے رویے سے مبرا تھے۔'' (ص۲۳۷)

''پنجابیوں کی زندہ دلی،خندہ پیشانی،کشادہ قلبی،فراخ ذہنی،تن کی تندرستی،من کی مستی،چہرے کی شگفتگی،رنگ و روپ کی تر و تازگی،رنگین مزاجی،بےفکری،بےباکی،بےخوفی آزاد مشربی یعنی کہ ان کی پر بہار زندگی کے اسباب کیا ہیں۔وہاں جا کر پتا چلا کہ پنجاب

کی پانچ ندیوں جہلم، چناب، راوی، ستلج اور بیاس کا پانی جسم و جان میں روانی اور طغیانی
بھر دیتا ہے پیری اور کودکی میں بھی جوانی ڈال دیتا ہے پردیس کو دیکھ کر یہ بھی سمجھ میں آیا
کہ دنیا کے بعض علاقوں کی زمینوں میں خشکیاں، فضاؤں میں اداسیاں، چہروں پر
مژمردگیاں، دلوں میں بے کیفیاں اور ذہنوں میں بے تابیاں ہوا ہیں۔''

(ص ۲۴۰)

دیگر آپ بیتوں کی طرح ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' کا ایک حصہ خاکوں پر مبنی ہے جن احباب سے مصنف کا واسطہ رہا ان کے افعال و کردار پر خوب روشنی ڈالی ہے۔ جہاں بھی کسی شخص کا ذکر آیا مصنف نے اس کی جامع تصویر پیش کی ہے اور تعصب سے کام نہیں لیا جن جن کرداروں کو پیش کیا ان کی خوبیوں کا برملا اعتراف کیا یہ مصنف کی اعلیٰ ظرفی کا ثبوت ہے کہ انھوں نے تمام کے تمام کرداروں کے اوصاف کو پیش کرنے میں پس و پیش سے کام نہیں لیا۔ مصنف خود بہترین خاکہ نگار ہیں ان کے دو خاکوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں مجتبیٰ حسین غضنفر کی خاکہ نگاری کے متعلق رقم طراز ہیں۔

''غضنفر جو بھی لکھتے سچ لکھتے ہیں اور سچ کے سوا کچھ نہیں لکھتے، کہا جاتا ہے کہ سچ کڑوا بھی
ہوتا ہے لیکن کڑواہٹ غضنفر کے خاکوں میں کہیں نظر نہیں آتی کیونکہ خاکہ نگاری کی
حلاوت تحریر میں اتنی گھلی ہوئی ہوتی ہے کہ کڑواہٹ کو سر اٹھانے کا موقع ہی نہیں ملتا۔''

مجتبیٰ حسین کی اس رائے کو آپ خود بھی ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' کے کرداروں میں محسوس کر سکتے ہیں چند مثالیں دیکھیے۔

''بناؤ، سجاؤ، رچاؤ اور کساؤ سے خالی ڈھیلے ڈھالے بدن سے ایک نہایت
فعال، متحرک، پر جوش، ہمہ وقت ہلنے ڈولنے اور بات بات میں قہقہہ لگانے والی
شخصیت باہر آ گئی۔ اس شخصیت کے باطن کا شور۔ اس کا اضطراب اس کی فعالیت اور اس
کا عمل سبھی چیخ چیخ کر بتانے لگے کہ وہ شافع ہے۔'' (ص ۱۵۹)

''یہ طارق چھتاری وہی باغ کا دروازہ والے طارق چھتاری ہیں جنھوں نے دوچھور جیسے
کاروباری اور تنگ علاقے میں بھی خلوص و محبت کا ایک کشادہ باغ لگا رکھا ہے اور جس

کا دروازہ ہر ایک کے لیے ہر وقت کھلا رہتا ہے جس میں پھل اور پھول دونوں کی خوشبوئیں بجی رہتی ہیں جس میں داخل ہوتے ہی دل و دماغ پر افسانوں فسوں طاری کو جاتا ہے مساموں میں خوشبوئیں گھل جاتی ہیں۔ جہاں بیٹھ کر دنیا کی آلودہ ہواؤں اور فضاؤں سے نجات مل جاتی ہے جہاں خانقاہوں جیسا سکون حاصل ہوتا۔ یہ باغ مجھ پر کچھ زیادہ ہی مہربان رہا۔اس باغ کے مالک نے دل و جان سے چاہا کہ میں علی گڑھ میں رک جاؤں۔''

(ص۱۷۲)

''نوکِ قلم میں تلوار کی دھار پیدا کرنے اور اپنی اس شمشیر کو بے محابہ چلانے کے عمل میں بیگ احساس کے نام کے دونوں اجزاء کی معنویت صاف صاف دکھائی دیتی ہے ان کا احساس تو کمانیں تانتا ہی ہے بیگ بھی تیر چھوڑنے سے ذرا بھی نہیں ہچکتا۔

دوسرا بیگی یعنی جلالی جوہر ان کی اعلیٰ ظرفی اور ضبطِ نفسی کی صورتوں میں اپنا جلوہ دکھاتا ہے یہ جوہر ویسے تو ان کے معاملات دل، کاروبار دنیا، منصب مدیر، ان کی تحریر تقریر سب میں دیکھنے کو ملتا ہے مگر محفل کیف و سرور میں اس کی تب و تاب ایسی نظر نواز ہوتی ہے کہ دیکھنے والوں کی آنکھیں چوندھیا جاتی ہیں۔۔''

(ص۳۰۲،۳۰۳)

خاکوں کے ساتھ اس میں صنف سفر نامہ کی بھی خصوصیات ملتی ہیں یہ اسفار دراصل ان کے ملازمتی ٹرانسفرز کے تھے۔ جہاں ہندوستان کے مختلف شہروں کو جانا پڑا وہاں کے حالات و واقعات کو جیسا دیکھا محسوس کیا قلم سے ان کی ویسی ہی متحرک تصاویر بیان کر دیں۔جن میں علی گڑھ، بہار، ہماچل پردیش، سولن، پٹنہ، ممبئی، لکھنو، کلکتہ، میسور، حیدرآباد اور قطر وغیرہ کا ذکر تفصیلی ملتا ہے جس سے ہر شہر سے ان کی نسبت اور محبت کا اظہار ملتا ہے۔مثالیں:

''علی گڑھ سے جا کر اور علی گڑھ سے زیادہ بہت صورت حال میں وہ کر بھی علی گڑھ کو بھول نہ پایا۔ یہ علی گڑھ سے علی گڑھ کے طالب علموں کا ایسا رشتہ ہے جسے منطق کے پیمانے سے نہیں ناپا جا سکتا اور اسے ہر کوئی سمجھ بھی نہیں سکتا۔۔۔ یہ وہ رشتہ ہے

جوعلی گڑھ سے دور جا کر بھی علی گڑھ میں رکھتا ہے جوعلی گڑھ سے متعلق چوری ڈکیتی تک کی خبریں پڑھوالیتا ہے۔جس نے مجھے چھٹیوں میں سولن، ہماچل پر دیش سے گھر یا سسرال جانے کے بجائے علی گڑھ آنے پر مجبور کیا۔جس نے مجھے لکھنو سے دلی اور دلی سے لکھنو آتے جاتے وقت علی گڑھ میں روک لیا۔جس نے مجھے لکھنو میں رہتے ہوئے علی گڑھ میں زمین کا پلاٹ خریدوادیا اور عارضی ملازمت کے دوران بھی علی گڑھ میں میرا پکا مکان بنوادیا۔ (ص ۱۷۲)

''مجھے جنوب کے اس شہر میں بھی جانے کا اتفاق ہوا جو حکمت ،نظام حکومت ،حکمرانی ،سیاسی بیداری ،سپہ گری ،مصوری ،عمارت سازی ،ادب نوازی اور عشق شہنشاہی میں آگرہ اور دلی سے کبھی کم نہیں رہا۔وہ شہر صرف چار میناروں کو ہی نہیں دکھاتا ،چار اور چیزوں کا بھی نظارہ کراتا ہے کل کارخانوں کے شوروموں سے لے کر گلوں اور گوری کالی کلائیوں تک میں سجے صاف شفاف سچے موتیوں کی چمک ،بازاروں، بستیوں اور بسوں سے لے کر باہوں اور بالوں تک کے گجروں کی مہک ،ایوان بالا سے لے کر گلی کوچوں تک سیاسی بیداریوں اور معاملات مملکت کی ہشیاروں کی دھمک اور مردانہ لب ولہجے میں بولنے والی باادب بیویوں کی بے باکانہ بولیوں کی کھنک یہ ایسی خوبیاں ہیں جو خیر آباد کو ہمیشہ اخبار کی سرخیوں میں رکھتی ہے اور اس شہر کو ایک ایک کی مرکز نگاہ بناتی ہے۔''

(ص ۳۰۰)

ایسے کئی اسفار اور شہروں کا نقشہ غضنفر کے قلم سے چلتا پھرتا محسوس ہونے لگتا ہے۔میری ریاست کرناٹک کے ضلع میسور میں بھی غضنفر نے کافی عرصے تک خدمات انجام دیں۔دکن اور شمال کا موازنہ انھوں نے دیکھ لی دنیا ہم نے کے صفحے ۲۹۵ پر کچھ یوں کی ہے کہ اہل دکن ہونے پر فخر ہونے کے ساتھ ساتھ غضنفر کے خلوص ومحبت اور احترام کا قائل بھی ہونا پڑتا ہے لکھتے ہیں۔

''نگاہیں اٹھائیں اور پتلیاں گھمائیں تو جنوب شمال سے خاصا مختلف نظر آیا۔دسترخوانوں پر گیہوں کی روٹی کے بجائے میدے کے پراٹھے اور بکری کے گوشت کی جگہ بھیڑ کے گوشت والے سالن نظر آئے ۔ناشتے میں پوری ،ترکاری، چھولے

بھٹورے کے بجائے اڈلی ،وڑا اور سانبر،ڈوسا ملا۔ڈیری سینٹروں میں بھینس کے دودھ
کی جگہ گائے کے دودھ کی پیکٹ دکھائی پڑے۔سالنوں اور پکوانوں میں گھی تیل کی چمک
دمک کی جگہ ناریل کے روغن کی سفیدی دکھائی پڑی۔مردانہ جسم پاجامے کی جگہ لنگی اور
زنانہ شلوار سوٹ کے بجائے لہنگا چولی میں ملبوس نظر آئے۔شمال میں 'پرسوں' کا جو معنی
مستعمل ہے وہ معنی جنوب میں نہیں ملا۔۔۔۔یہ فرق جغرافیائی اور تہذیبی صورتوں میں
ہی نہیں بلکہ دونوں سمتوں کے سوچ میں بھی نظر آیا جنوب کے سوچ میں سیدھا پن تھا
،سادگی تھی ،صفائی تھی جب کہ شمال کی فکر میں ٹیڑھ پن تھا،پیچدگی تھی،بعض معاملات میں
گندگی بھی تھی جنوب کے ذہنوں میں عیاری اور مکاری بھی کم نظر آئی۔جب کہ شمال کے
دماغوں میں دونوں خصوصیات کچھ زیادہ ہی بھری پڑی ہیں۔''

(ص۹۶_۲۹۵)

جہاں تک میں نے سنا ہے اہل شمال ،اہل جنوب کو خاطر میں نہیں لاتے انھیں بے شمار علمی وادبی
خدمات کے باوجود اعتراف کرنے میں پس وپیش سے کام لیتے ہیں۔مگر ایک اہل شمال نے یہاں بھی اپنی ایماندار
نہ سوچ سے اپنے ظرف کا بے مثال ثبوت دیا ہے۔

غضنفر اردو دنیا میں فکشن رائٹر کی حیثیت سے جانے مانے اور پہچانے جاتے ہیں اور یہ انداز ان کے
اسلوب میں ہر صنف میں دکھائی دیتا ہے۔ان کا کمال یہ ہے کہ وہ ہر کہانی پر گرفت رکھتے ہیں اس کو کبھی بھی کہیں بھی
ڈھیلا پڑنے نہیں دیتے اور یہی چیز قاری کی دلچسپی کا سبب بنتی ہے۔شروع سے آخر تک مصنف ایک خاص سحر طاری
کرکے قارئین کو اپنی گرفت میں لیے رکھتا ہے اس کا نمونہ ''دیکھ لی دنیا ہم نے'' کا آغاز ہے۔

''میں جس حلیے میں گھر کے اندر تھا اسی حلیے میں باہر نکل پڑا تھا بغیر کسی سے
ملے، بنا کسی کو کچھ بتائے ماموں کی بیٹھک سے نکل کر میں سیدھے سیوان ریلوے اسٹیشن
پہنچ گیا۔نیم بدحواسی کے عالم میں کیے گئے اس سفر پر اب جب غور کرتا ہوں تو لگتا ہے کہ
میرا یہ ناگہانی سفر ضرور کسی اضطراری کیفیت کے دباؤ کا نتیجہ تھا اور یہ سمجھ آتا ہے کہ قربتوں
میں جب دوریاں آجاتی ہیں تو درودیوار ڈرانے لگتے ہیں اور توقع کی لو جب بجھتی ہے تو
رشتوں سے دھواں اٹھنے لگتا ہے اور یہ دھواں ایسا دبیز اور دم سوز ہوتا ہے کہ اس کے گھنے

گھیرے میں کھڑا ہونا دوبھر ہو جاتا ہے۔''

(ص ۱۳)

اسی طرح ہر صفحہ آگے پڑھنے کے تجسس میں اضافہ کرتا دکھائی دیتا ہے ان کا اسلوب اور طرز تحریر منفرد ہے۔ اسلوب ایک ذوقی اور وجدانی شئے ہے اور اس کی جمالیاتی حقیقت کا دارومدار بھی امتزاجی یا ترکیبی وحدت پر ہے۔ جو تخلیق کار جتنا زیادہ عقل سلیم کا مالک ہوگا، زبان اور لفظیات پر گرفت جتنی مضبوط ہوگی اس کا اسلوب بھی اس قدر متاثر کن ہوتا ہے۔ یہ ہی چیزیں غضنفر کے اسلوب کو فصاحت اور بلاغت عطا کر کے وقیع بناتی ہے۔ مثلاً جب کھانے کا ذکر کرتے ہیں تو سارے لوازمات آجاتے ہیں اور کپڑوں کی بات کرتے ہیں تو کوئی بھی پہلو نہیں چھوٹتا ہے مثال:

''اس شہر کی زندگی پر کسی قسم کا ملمع نہیں تھا جو جیسا تھا ویسا نظر آتا تھا یہاں کے رہن سہن ،کھان پان، ہاؤ بھاؤ، کردار گفتار میں کسی قسم کا کوئی تصنع و تکلف نہیں تھا۔ یہاں زندگی کرنے میں آسانیاں بہت تھیں سپر مارکیٹ جانا ہو یا بگ بازار پہنچنا ہو، مال میں جا کر مال خریدنا ہو، یا کسی سینما ہال میں پکچر دیکھنی ہو، کسی جلسے میں شرکت کرنی ہو یا کسی کا مہمان بننا ہو نہ کوٹ پینٹ چڑھانے اور ٹائی باندھنے کی جھنجھٹ نہ ہی شیروانی پاجامہ پہننے کی ضرورت، آپ جس لنگی کرتا میں گھر پر ہیں اسی لنگی کرتا میں کہیں بھی پہنچ جائیے۔ نہ اندر کوئی تناؤ، نہ ہی باہر کوئی دباؤ۔ سب کو مطمئن کر دینے والا اس کا انوکھا انداز، زیادہ پیسے والا بھی خوش اور کم پیسے والا بھی مست۔ نہ احساس برتری کا بوجھ نہ احساس کمتری کی الجھن۔ ایسا سادہ چلن کہ نہ گھٹن نہ چبھن۔

(ص ۲۹۰)

سوانحی ناول کی بنیاد حقیقی کرداروں پر ہوتی ہے مرکزی کردار کے گرد ناول کا تانا بانا بنا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ دیگر کردار بھی بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں۔ ناول نگار فرضی کرداروں سے بھی مدد لیتے ہیں مگر غضنفر نے سارے حقیقی کردار حقیقی ناموں کے ساتھ پیش کیے ہیں۔ کردار ہی سب سے اہم جزیا ستون ہوتے ہیں جس پر ناول کی عمارت کھڑی ہوتی ہے اور وہی متعدد صفات کے حامل ہوتے ہیں۔ مصنف نے نہایت خلوص، سادگی اور نیک دلی سے کرداروں کے مثبت پہلوؤں کو پیش کیا ہے۔ سادہ لوحی، منکسر المزاجی اور سچائی ان کی تحریر سے چھلکتی ہے اس

کے اہم کرداروں میں عزیز و اقارب، اساتذہ اور دوست احباب دونوں شامل ہیں۔ والد صاحب، احمداللہ چچا، ماسٹر صاحب، نعیم، حافظ صاحب، نسیم قریشی، عتیق احمد صدیقی، نادر علی خاں، خلیل الرحمٰن اعظمی، قاضی عبدالستار، شہریار، زیدی جعفر، خورشید الاسلام، ، ڈاکٹر نور الحسن، جاوید حبیب، خورشید، ابوالکلام قاسمی، یونس، اسلم بینائی زاہد، امین، رشید قریشی، کیپٹن افتخار، واحد، ثریا آپا، نسیم عمر، سلمیٰ، رفعیہ سلطانہ، شائستہ، شافع، سعیدہ آپا، امین، طارق چھتاری، شافع قدوائی، اقبال مجید، پیغام آفاقی، بیگ احساس، مہہ جبین، زبیر شاداب، محسن خان، سنجے موریہ، اودے نارائن سنگھ وغیرہ ہیں۔ جنھوں نے غضنفر کی دنیا میں اپنے اپنے کردار ادا کیے ہیں اور ان کی فلم میں اپنا اپنا رول بخوبی نبھایا ہے۔ کبھی ویلن کی انٹری بھی ہوئی ہے مگر ان کو زیادہ اہمیت نہیں دی گئی ہے۔

ان کرداروں کے ساتھ اس حقیقی فلم کا ہیرو خود مصنف ہے کیونکہ ان کی ہی داستان حیات یہاں بیان کی گئی ہے جو غیر معمولی صلاحیتوں کا حامل ہے جو اسے کسی فلمی ہیرو کے ہم پلہ بنا دیتی ہے۔ وہ ایک خوش شکل، خوش اخلاق، تعلیم یافتہ، ملنسار، مثبت سوچ وفکر رکھنے والا، حساس، ہمدرد، اپنے کام کے تئیں ایماندار، مخلص، اردو زبان سے بے لوث محبت، دیانت دار، محنتی، اساتذہ کی عزت، شاگردوں سے محبت، ذہین و فطین، تمام مسائل کو سلجھانے اور زندگی کی الجھنیں چٹکیوں میں دور کرنے والا ہے۔ ہیرو کے کام کرنے کا انداز، مسائل سے نمٹنے کا طریقہ دیکھ کر مجھے فلم، نائک کے ہیرو انیل کپور کے کردار کی یاد آگئی جب اسے ایک دن کا چیف منسٹر بنایا جاتا ہے۔ تو وہ کس طرح ان ۲۴ گھنٹوں میں کر دکھاتا ہے جو ہمارے لیڈرس اپنی ۵ سالہ معیاد میں بھی نہیں کر پاتے ٹھیک اسی طرح اس حقیقی زندگی کے ہیرو نے اپنے کار منصبی کے دوران جو کارنامے انجام دیے ہیں کچھ نمونے ملاحظہ کیجیے۔

> ''وہاں پہنچا تو بہت سارے مسائل گھڑیال کی طرح منہ کھولے کھڑے تھے
> سب سے بڑا مسئلہ راستے کا تھا ایک طرف یونیورسٹی تھی اور دوسری طرف ایک گاؤں اور بیچ میں ہمارا ریجنل ناردن لنگویج سنٹر۔۔۔ گاؤں والے ہمارے سنٹر سے ہوکر یونیورسٹی آیا جایا کرتے تھے۔۔۔ کسی بات پر یونیورسٹی کے ایک آفیسر نے اس گیٹ پر تالا ڈال دیا تھا جس پر ہمارے سنٹر کا تالا پڑا رہتا تھا۔۔۔ پرنسپل انچارج گاؤں تب سے سنٹر کا نہیں بلکہ یونیورسٹی کا ہے اور گاؤں والے تب سے سنٹر پر بھی خفا ہو گئے تھے اور واقعی ہمیں قصور وار مانتے تھے۔
> چائے آگئی' چائے کے ساتھ نمکین اور بسکٹ بھی جب ناشتہ سے فارغ ہو گئے تو میں نے

آگے بیٹھے سب سے معمر آدمی کی طرف مخاطب ہوتے ہوئے کہا!

’’جی اب فرمایا جائے کیا مسئلہ ہے؟‘‘

’مسئلہ کیا جی ہمارا راستہ بند کر دیا گیا ہے گیٹ پر تالا لگا دیا گیا ہے اس وجہ سے بہت پریشا
ن ہیں۔‘‘

’’اس تالا بندی سے تو ہم بھی بہت پریشان ہیں کیا آپ چاہتے ہیں کہ یہ راستہ کھل جائے؟میں نے پوچھا تو وہ بولے!

اسی لیے تو ہم آئے ہیں‘‘

آپ کی طرح ہم بھی چاہتے ہیں کہ تالا کھل جائے اس لیے کہ ہمیں بھی بہت ساری دقتوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے کہ ہمارے کاموں کے بھی زیادہ تر دفتر یونیورسٹی ہی میں واقع ہیں میں یہ چاہتا ہوں کہ اس کام میں ذرا بھی دیر نہ ہو اس لیے آپ لوگ میرے ساتھ گیٹ پر چلیے میں ابھی آپ کے سامنے اپنا تالا کھول دیتا ہوں۔

میں انھیں لے کر اپنے اسٹاف کے ساتھ گیٹ پر پہنچ گیا اور اپنے چوکیدار سے بولا کہ اپنا تالا کھول دو۔چوکیدار نے آگے بڑھ کر تالا کھول دیا۔جب ہمارا تالا کھل گیا تو میں نے گاؤں والوں سے کہا کہ اب یونیورسٹی کے چوکیدار سے کہیے کہ وہ بھی اپنا تالا کھول دے۔

گاؤں والے نے چوکیدار سے تالا کھولنے کے لیے کہا تو اس نے یہ کہہ کر منع کر دیا کہ اوپر سے آڈر نہیں ہے۔

دیکھا آپ نے!اب آپ ہی بتایئے کہ قصور ہمارا ہے یا یونیورسٹی کا؟اب اس کا ایک ہی راستہ ہے کہ آپ لوگ وی سی پر دباؤ ڈالیے کہ وہ اس آفیسر پر دباؤ بنائے جو ابھی نیا نیا فوج سے ریٹائر ہو کر آیا ہے اور یونیورسٹی کو فوجی اڈا بنا دینا چاہتا ہے۔

گاؤں والے اصل ماجرے کو سمجھ کر لوٹ گئے اور وہی کہا جو میں نے انھیں سمجھایا تھا انھوں نے میرے مشورے پر عمل کیا اور یونیورسٹی کا تالا بھی کھل گیا۔اس طرح یہ مسئلہ جو مہینوں سے اٹکا ہوا تھا ایک میٹنگ میں حل ہو گیا۔‘‘

(ص۴۳-۲۴۴)

اس کہانی کے ہیرو کا ایک اور کارنامہ دیکھیں:

''ہمیں ہماری ضرورت اور پسند کا کھانا نہیں مل رہا ہے''

مطلب؟

سر! مطلب یہ کہ گوشت ہمارے روزمرہ کا حصہ تھا مگر یہاں ہمیں اس سے محروم کر دیا گیا ہے آپ اندازہ نہیں لگا سکتے کہ اس وجہ سے کس قدر کرب میں مبتلا رہتے ہیں کیسی کیسی پیچدگیوں کا شکار ہو رہے ہیں؟

کیوں گوشت کیوں نہیں ملتا؟

کہتے ہیں کہ ہوسٹل میں الاوڈ نہیں ہے

ٹھیک ہے میں دیکھتا ہوں اس سلسلے میں کیا کیا جا سکتا ہے۔-------

ٹھیکیدار بولا سر یہ تو منع ہے۔

کس نے منع کیا ہے؟ میرے اس سوال کا اس نے یہ جواب دیا

سر یہ تو معلوم نہیں ہے، مگر کسی افسر کہ کہنے پر ہی ایسا کیا گیا ہوگا اور یہ پرتھا برسوں سے چلی آ رہی ہے

اچھا تو اب آپ اس پرتھا کو بند کر دیجیے اور کل سے گوشت مچھلی بھی دینا شروع کر دیجیے۔

ہفتے میں کم از کم دو بار گوشت اور ایک بار مچھلی ------

جیسے ہی یہ خبر ٹریز تک پہنچی وہ دوڑے ہوئے میرے چیمبر میں پہنچے اور شکریہ تھینک یو کی تو بھر مار لگا دی ان کی آنکھوں میں چمک اور چہرے پر دمک تھی ان کے آواز اور لہجے سے ایسا لگ رہا تھا جیسے انھیں کسی خزانے کی بشارت دے دی گئی ہو۔

(۲۴۹)

''دفتر کا ایک دوسرا بڑا مسئلہ یہ تھا کہ ہاسٹل کی عمارت کے مین داخلے کے سامنے کلاس روم تھا اور سنٹر کے اندر وہ اپنی گاڑیوں پر دندناتے ہوئے داخل ہوتے تھے

گاڑیوں کے آنے پر کلاس ڈسٹرب ہوتی تھی اور کبھی کبھی تو کلاس روم میں دھواں بھی گھس جاتا تھا پیٹرول کی بد بو طالب علموں کو الگ پریشان کرتی تھی۔

شام تک واقعی کوری ڈور صاف ہوگیا تمام سامان دو کمروں میں بھر دیا گیا ۔۔۔بعض لوگوں نے تو یہ تک کہا کہ جس کام کو ہمارے ڈائرکٹر صاحب بھی نہ کر سکے اسے آپ نے کر کے سی آئی ایل کی ہسٹری میں ایک ریکارڈ قائم کر دیا۔واقعی یہ بہت بڑا کام ہوگیا سر۔۔۔دوسرے دن میں نے چوکیدار کو بلایا اور بولا کہ پرسوں صبح سے کوئی بھی گاڑی اس کوری ڈور کے اندر نہیں آئے گی اگر ایک بھی گاڑی اندر آگئی تو تمہاری چھٹی ہو جائے گی تیسرے دن واقعی اس چوکیدار نے تمام گاڑیوں کو باہر روک دیا ایک بھی گاڑی اندر نہ آسکی ۔۔۔تیسرا مسئلہ رمضان میں تراویح کا تھا۔۔۔۔وہ بھی حل ہوگیا۔"

ہمارے سماج میں کچھ ضعیف الاعتقاد واقعات بھی رونما ہوتے ہیں۔ جو ایسے لوگوں پر یقین کرتے ہیں اور اپنی جمع پونجی تک لٹا دیتے ہیں ایسے کشفی، مافوق الفطرت ہستیوں اور واقعات کے روائین کی کمی بھی ہمارے معاشرے میں نہیں جس سے یہ اندازہ لگانا مشکل ہی نہیں کہ ان لوگوں کے کچھ مقصد ہوتے ہیں۔ جو عوام وخواص کی کم علمی اور ضعیف الاعتقادی کے راستے پورے ہوتے ہیں جیسے ان کی خودنوشت میں دو بھی واقعات ملتے ہیں ۔ایک خود مصنف کی بیماری اور علاج ومعالجے کو لے کر تو دوسرا محبت کو پانے کے چکر میں جو جو نادانیاں ہوئی ہیں یعنی اپنے مقصد کو پانے میں جو کچھ کر گئے ہیں وہ بھی من وعن بیان کر دیا ہے۔

خلاصہ بحث یہ ہے کہ غضنفر کی ان ہی کاوشوں، کوششوں اور جہد مسلسل کا قلمی نمونہ ہے" دیکھ لی دنیا ہم نے"۔ جو گونا گوں اسرار ورموز کو سمیٹے ہوئے ہے۔ایسا لگتا ہے کہ یہ اپنے تجربہ سے ایک دنیا دکھانا، درس وتدریس کے نئے پہلوؤں کو سکھانا، مشاہدات سے نئے جہانوں کی سیر کروانا، اردو کے فروغ کے کاز اور اہمیت کو بتانا، اپنے ایڈمینسٹریٹیو ورک (Administrative work) سے ہمارے جذبے اور حوصلوں کو نئی توانائی بخشنا، دوستی اور خلوص ومحبت کا سبق پڑھانا، استاد کی تعظیم وتکریم سے آگاہ کرنا، تعلیم کی اہمیت وافادیت کو سمجھانا، تدریس کے نئے گر سکھانا، فکر اور نظر کے نئے در وا کرنا، خیالات کو ندرت اور حساسات کو تازگی عطا کرنا، اخلاقی اقدار سے رشتوں کو پائیدار بنانا، اور اپنی اس کہانی سے مثبت، اچھے اور بہتر انسان کی تشکیل چاہتے ہیں ان میں انسانیت ، اردو زبان

سے چاہت اور سماجی رشتوں سے محبت کی جوت جگانا چاہتے ہیں اور وہ اس میں کامیاب ہیں۔

بقول ساحر لدھیانوی

دنیا نے تجربات وحوادث کی شکل میں
جو کچھ مجھے دیا ہے وہ لوٹا رہاہوں میں

کتاب کا نام : **شگفتگی و برجستگی قلمکاروں کی**

مصنف : نارنگ ساقی مبصر : **انور بھدرکی**

صفحات : 360، قیمت: 400روپے، اشاعت:2019ء

ناشر : ایم۔آر۔پبلی کیشنز، دہلی

نارنگ ساقی ادبی لطیفوں کے لئے جانے جاتے ہیں اور ادبی لطائف نارنگ ساقی کے لئے۔اردو ادب میں نارنگ ساقی ایک معتبر نام تو ہے ہی عظیم شخصیت بھی۔انہوں نے اردو ادب میں کئی اچھی کتابوں کا اضافہ کیا ہے جسے شوق سے پڑھا بھی جاتا ہے۔نارنگ صاحب کی حیثیت تب اور بھی بڑھ جاتی ہے جب ان کی کتابوں میں ان کے ساتھ اردو ادب کی کئی مایہ ناز شخصیتوں کی ایک پوری کہکشاں پر نظر جاتی ہے جو ہمیشہ ان کی کتابوں کا حصہ رہی ہیں۔صرف یہی نہیں انہیں 'لطیفوں والے نارنگ ساقی' کے نام سے بھی ادبی حلقوں میں جانا جاتا ہے۔نارنگ صاحب نے خود کہا ہے کہ ان کی پچھلی کتابوں سے کچھ لطیفے اس کتاب میں شامل کئے گئے ہیں کچھ تو انہوں نے دوستوں سے جمع کیا ہے، کچھ کو بارڈر پار سے دوستوں نے بھیجا ہے۔بڑی صاف گوئی سے نارنگ صاحب نے ساری باتوں کا خلاصہ کیا ہے اور اپنی کاوش کا بھی۔ان کی صاف گوئی کا صلہ ہے کہ انہیں نہ صرف اردو ادب میں معتبریت حاصل ہے بلکہ قدر کی نگاہ سے دیکھے بھی جاتے ہیں۔

زیرِ نظر کتاب ''شگفتگی و برجستگی قلمکاروں کی'' کا انتساب مایہ ناز اور مشہور بین الاقوامی مزاح نگار محترم حسین احمد شیرازی کے نام ہے۔کتاب کو چار حصوں میں منقسم کیا گیا ہے۔پہلا حصہ نثر کا ہے جو پیش لفظ، دیباچہ، اپنی بات وغیرہ مشمولات سے مزین ہے۔چونکہ فہرست لمبی ہے جس کو کل 360 صفحات کی کتاب میں 6 صفحہ میں سمیٹا گیا ہے۔مضامین کے لئے 11 سے 47 صفحہ مقرر ہے۔چار صفحوں میں نارنگ صاحب کی فیملی کی رنگین تصاویر کتاب کی زینت بنی ہیں۔جن میں ایک خوشحال فیملی کے چار پشتوں اور احباب کو مسکراتے ہوئے دیکھا جاسکتا ہے نیز نارنگ صاحب کے وقار کو سمجھا بھی جاسکتا ہے۔

پھر شروع ہوتا ہے لطیفوں کا سلسلہ۔ شروعات محترم آغا جانی کاشمیری سے ہوئی ہے اور اختتام محترم یوسف ناظم (سید محمد یوسف) پر۔ اس حصہ کے لئے 49 سے 195 تک کا صفحہ وقف کیا گیا ہے۔ حصہ متفرق 196 صفحہ، جناب آصف فہمی سے شروع ہو کر صفحہ 313 میں جناب یعقوب راہی پر ختم ہوا ہے۔ تبرکات کے بطور تین بڑے غیر ملکی ادیب (آئین سٹائین، بر برنارڈ شا اور ونسٹن چرچل) کو با تصویر اور بارہ دوسرے غیر ملکی ادیب جن کی تصویر نہیں دی گئی ہے بھی شامل کئے گئے ہیں۔ گوشہ تصویر خانہ 323 سے 360 تک پھیلا ہوا ہے جس میں کل 272 تصاویر آویزاں ہیں جن میں نارنگ صاحب کے ساتھ ملک اور بیرونِ ملک کے اپنے وقت کے سارے معتبر ادیبوں کو دیکھا جا سکتا ہے۔ یہ ایک بہترین Collection ہے۔ جس سے ایک ادیب کے ناطے ان کی حیثیت محتشم ہوتی ہے۔ مضامین کے حصہ میں پیش لفظ گوپی چند نارنگ صاحب کی ہے جس میں انہوں نے نارنگ صاحب کے ساتھ اپنے رشتے کی وضاحت کی ہے اور پھر لطیفہ کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''ہنسنا ہنسانا سامنے کا چہرہ ہے، اس کی تہ میں لسانی نکتہ رسی، نکتہ جوئی اور نکتہ آفرینی ہے۔ یہ لسانی قدرت جب حسِ مزاح سے انگیز ہوتی ہے تب احساس کی لطیف ترین سطح پر لطیفے کا 'بار' آتا ہے۔ ویسے ہنسنا ہنسانا انسانی فطرت ہے، حسِ مزاح تو بہتوں میں ہوتی ہے لیکن یہ لطیفہ تبھی بن پاتی ہے جب زبان پر قدرت ہو۔ یہ بات انوکھی لگے گی لیکن صحیح یہی ہے کہ لطیفہ قائم لسانی تخلیقی حس سے ہوتا ہے اور اگر لسانی ساخت میں ذرا سی بھی کور کسر ہے تو لطیفہ کثیفہ ہو جاتا ہے۔ لطیفے کے لئے ذہانت، فطانت، طباعی اور نکتہ رسی شرط ہیں۔ اردو چونکہ انتہائی بالیدہ اور معیار رسیدہ زبان ہے، اس میں بذلہ سنجی، حاضر جوابی اور لطیفہ گوئی کی روایت صدیوں سے ملتی ہے۔'' (ص:13)

اس اقتباس سے جہاں لطیفہ کی ساخت کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے وہیں اس کی لسانی اہمیت بھی اجاگر ہوتی ہے۔ دیباچہ شمس الرحمٰن فاروقی صاحب نے لکھا ہے۔ فاروقی صاحب، جیسا کہ ان کے شعار میں شامل ہے انہوں نے اردو کی تعریف میں جو کچھ کہا ہے، حقیقت ہے۔ سچائی پر مبنی ہے۔ فرماتے ہیں:

''حاضر جوابی کے یہ لطف ہر زبان میں نہیں ہیں۔ یہ انہیں زبانوں میں

زیادہ ہیں جن میں ایہام اور ذو معنین فقروں کے امکان زیادہ ہوں، مثلاً سنسکرت، فارسی، انگریزی یا اردو۔ فقرے بازی، پھبتی، طنز، بات میں بات پیدا کرنا، ان سب کے ایک سے ایک عمدہ نمونے اس کتاب میں موجود ہیں۔'' (ص:16)

اپنے مضمون میں نارنگ صاحب کو''لطیفوں والے نارنگ ساقی'' کہتے ہوئے مجتبیٰ حسین صاحب نے بڑے ہی انہماک کے ساتھ نارنگ صاحب سے اپنی نزدیکی کو یاد کیا ہے، جس سے دونوں ادیبوں کے رشتے کو سمجھا جاسکتا ہے اور خلوص وعقیدت کو بھی۔ نند کشور وکرم صاحب نے اپنا مضمون''نارنگ ساقی کے ادبی لطیفے'' کے نام سے قلم بند کیا ہے جس میں لطیفے کی تاریخ بتاتے ہوئے لکھتے ہیں:

''لطیفہ بازی اور لطیفہ گوئی دنیا میں صدیوں سے رائج ہے اور ہمارے ملک میں بھی اس کی تاریخ بہت پرانی ہے۔ پہلے یہ سینہ بہ سینہ عوام میں رائج تھی جسے وہ فرصت کے اوقات میں سنتے اور اس سے محظوظ ہوتے تھے بعد ازاں بادشاہوں، نوابوں اور راجاؤں کے دربار میں اس طرح کے مصاحب جلوہ گر ہوئے جو محفل کو زعفران زار بنادیتے تھے اور بادشاہوں کے دربار کا ایک حصہ بن گئے تھے۔ سولہویں صدی میں ریاست وجے نگر کے حکمراں مہاراج کیشو ودیورائے کے دربار میں تینالی رام کی بذلہ سنجی آج بھی کہانیوں اور ٹی وی سیریل کی صورت میں سامعین و ناظرین کو اپنی جانب مبذول کرتی ہے۔ مغل فرماں روا جلال الدین اکبر کے دربار میں بیربل اور ملا دو پیازہ کے لطیفوں سے متعلق تو آج بھی مارکیٹ میں کتابچے دستیاب ہیں۔'' (ص:23-22)

اس طرح کے اقتباس سے ہمیں ہماری تاریخ کو جاننے اور سمجھنے کا موقع ملتا ہے اور ہماری تہذیبی وراثت پر فخر بھی ہوتا ہے۔ نند کشور وکرم صاحب، ہنسنے اور قہقہہ لگانے کی اہمیت بیان کرتے ہوئے نارنگ صاحب کو لطیفوں سے جوڑ کر بھی اچھی باتیں کہی ہیں۔ پھر عطاء الحق قاسمی صاحب کا مضمون'' کے.ایل .نارنگ اور ان کی کتاب'' شاملِ اشاعت ہے۔انہوں نے بھی اپنے مضمون میں کئی لطیفے سنا ڈالے ہیں۔ کتاب

Introduce کرنے کے لئے مضمون ٹھیک ہے۔سارے مضمون نگار اپنی ادبی حیثیت کے لئے جانے جاتے ہیں کاش نارگ صاحب نے اپنے کسی قریبی ابھرتے ہوئے ادیب کا مضمون بھی شامل کیا ہوتا۔

اب تک تو نارنگ صاحب چپ تھے اور دوسروں کو سن رہے تھے اور اپنی باری کا انتظار۔ جیسے ہی انہیں موقع ملا وہ بھلا کہاں چپ رہتے۔انہوں نے بھی بڑی عمدہ جانکاری دی ہے۔ ہنسنے کے تعلق سے فرماتے ہیں:

''اس روتی بسورتی دنیا میں جہاں عموماً لوگ چھوٹے چھوٹے مسائل کے جال میں گرفتار رہتے ہیں ان کے لئے جی کھول کر ہنس لینا نعمت غیر مترقبہ ہے۔خوشی کے لمحات تو آسانی سے کٹ جاتے ہیں، لیکن انسان دکھ کے بھنور میں پھنس کر لاچار محسوس کرتا ہے ایسے میں ضرورت ہے ایک مسکراہٹ کی، جب اچانک ہونٹوں پر مسکراہٹ آتی ہے تو لمحہ بھر کے لئے انسان تناؤ بھول جاتا ہے اور خود کو ہلکا محسوس کرنے لگتا ہے، ایک ذرا سی مسکراہٹ انسان کو جینا سکھانے کے ساتھ ساتھ انسانی زندگی میں تبدیل لانے میں کافی مددگار ہوتی ہے۔'' (ص:31)

نارنگ صاحب کی لطیفہ نویسی کی داستان کافی پرانی ہے۔زیرِ مطالعہ کتاب صنف لطیفہ پر ان کی آٹھویں کتاب ہے۔''ادیبوں کے لطیفے'' ان کی پہلی کوشش 1992 میں منظرِ عام پر آئی تھی۔جس کا پاکستانی ایڈیشن 1993 میں پاکستان میں شائع ہوا۔ اس پر نظر ثانی اور اضافے کے ساتھ 1996 میں تیسرا ایڈیشن شائع ہوا۔مزید اضافے کے ساتھ چوتھا ایڈیشن 2004 میں شائع ہوا۔ 2007 میں ان کا لطیفوں کا نیا مجموعہ ''خوش کلامیاں قلمکاروں کی'' کے نام سے منظرِ عام پر آیا۔اس کا ہندی ایڈیشن بھی اسی سال شائع ہوا۔جس کا پاکستانی ایڈیشن 2014 میں پاکستان سے شائع ہوا۔اس بات کا خلاصہ نارنگ صاحب نے کتاب میں درج کی ہے۔ مضمون سے ان کی لطیفہ شناسی کا پتہ تو چل جاتا ہے لیکن رہ رہ کر ایک بات ستاتی رہتی ہے کہ انہوں نے کہیں بھی اپنے کسی کتاب میں (میں نے ان کی تمامی لطیفوں کی کتاب ریختہ پر پڑھی ہے) اس بات کا خلاصہ نہیں ہے کہ لطیفے اکٹھا کرنے کی عادت انہیں کہاں؟ کیسے؟ کیوں اور کب سے پڑی؟

نارنگ صاحب نے اردو میں لطیفہ نگاری کی تاریخ کو تفصیلی انداز میں بھی پیش کیا ہے جس میں ہندوستان اور پاکستان میں لطیفوں پر تمامی کام کا جائزہ لیا گیا ہے اور لطیفے کی کے بارے میں یوں گویا ہوئے ہیں:

''لطیفے کی تعریف یہ ہے جسے سن کر قاری کے دماغ پر مسرت کی ایک ایسی لہر دوڑ جائے جو ہونٹوں پر تبسم کی لکیروں کو زیادہ روشن ونمایاں کر دے۔ لطیفہ اسے کہتے ہیں جسے سن کر ہم ہنسیں یا ہمیں ہنسنے پر اکسائے۔ کسی بات کو اس انداز میں پیش کیا جائے کہ اسے سن کر یا پڑھ کر ہنسی آئے۔ بات کہنے کا انداز جو سننے والے کی حس مزاح کو بیدار کرے۔ شوخی اور بزلہ سنجی بڑھتی ہے تو تبسم، ہنسی، قہقہے کو ترغیب ملتی ہے۔ لطیفہ وہی اچھا ہوتا ہے جو برجستہ ہو۔ مختصر ہو اور کم از کم لفظوں میں ظرافت سے معمور اور خوش دلی کی ساری کیفیت کو اپنے اندر حتیٰ الامکان سمیٹ لینے کی صلاحیت رکھتا ہو۔ زبان صاف سادہ اور تصنع سے پاک ہو اور بالکل بول چال کی زبان میں ہو۔ یہی لطیفے کی بنیادی خصوصیت ہے۔''

(ص:33)

کتاب کے پہلے باب جس میں 68 ادیبوں کو شامل کیا گیا ہے، تمام ادبی ہستیاں آنجہانی ہو چکے ہیں، ہر شخصیت کی تاریخ پیدائش اور وفات کے ساتھ ساتھ جہاں ضرورت پڑی ان کے اصلی نام، جائے پیدائش بھی درج ہیں جن میں ایک ادیبہ محترمہ عصمت چغتائی شامل ہیں۔ ان ادیبوں کے کل 305 لطیفے شاملِ اشاعت ہیں جو عموماً تین چار کے شمار سے دئے گئے ہیں۔ فراکھ گورکھ پوری اور عطاء الحق قاسمی سے منسلک 9 لطیفے ہیں۔ جگر مرادآبادی اور خالد علوی کے نام کے ساتھ آٹھ آٹھ لطیفے، جوش ملیح آبادی، راجندر سنگھ بیدی ساحر لدھیانوی، علی سردار جعفری، فیض احمد فیض، مجاز لکھنوی، سعادت حسن منٹو، کنور مہندر سنگھ بیدی سحر کے نام کے ساتھ سات سات لطیفے پیش کیے گئے ہیں۔ سب سے خوبصورت بات ہے کہ خود نارنگ صاحب نے اپنے نام کے ساتھ چار لطیفے بھی درج کیا ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ جو خود پر ہنس سکتا ہے وہ دوسرے کو بھی ہنسا سکتا ہے اور یہ ایک حقیقت ہے کہ خود ہنس کر ہی دوسرے کو ہنسایا جا سکتا ہے۔

پھر متفرق کے حصے میں اردو حرفِ تہجی کے لحاظ سے نام کے ساتھ لطیفے شامل ہے۔ کل 303 نام شامل ہیں، ان میں 39 نام کے ساتھ دو دو لطیفے ہیں اور باقی ناموں کے ساتھ ایک ایک لطیفے ہیں۔ اس طرح یہاں کل 342 لطیفے درج ہیں۔ ان ناموں میں 16 ادیباؤں کے نام شامل ہیں۔ غیر ملکی ادیب وشعراء کے گوشے میں کل

24 لطیفے دیئے گئے ہیں اس طرح اس کتاب میں نارنگ صاحب نے کل 671 لطیفے شامل کئے ہیں۔

اس کتاب کو پیش کرنے کا ایک الگ انداز ہے۔جس میں انہوں نے بتایا ہے کہ کتاب کے صفحات کو کس طرح بھرا جانا چاہئے نارنگ صاحب نے اپنی پچھلی کتابوں اور لطیفوں کے تعلق سے چند اچھی آراء اس کتاب میں شامل کی ہے۔اپنی کتاب میں جہاں بھی انہیں خالی جگہ ملا ہے اس کا انہوں نے اچھا فائدہ اٹھایا ہے اس طرح انہوں نے کل 54 آراء اپنی پچھلی کتابوں کے تعلق سے اس کتاب میں شامل کی ہیں۔کتاب کی سرورق کی بات اگر نہ کی جائے تو ناسپاسی ہوگی۔جیسا کہ انہوں نے کہا ہے کہ محبّ دوست حسین احمد شیرازی کی ارسال کردہ ٹائٹل بھی غضب کا ہے۔لطیفے کی طرح جھناکے دار اور لطیف۔ظرف نگاری شاید اسی کو کہتے ہیں جو ٹائٹل ہی ثابت کر رہی ہے۔کتاب میں شامل کچھ آراء یہاں پیش کر رہا ہوں:

''ساقی نارنگ برصغیر پاک و ہند کے تقریباً سارے شاعروں اور زیادہ تر افسانہ نگاروں اور نقادوں سے ذاتی طور پر واقف ہیں اور ان میں سے اکثر ایسے ہیں جنہیں ساقی نارنگ کی ساقی گری سے بھی لطف اٹھانے اور ان محفلوں میں اپنی زبان کے بند کھولنے بلکہ اپنے کردار کے بھی بند کھولنے کا موقع ملا ہے۔لہٰذا ساقی نارنگ نے کتاب میں شامل بہت سی خوش کلامیوں کو اپنے سامنے واقع ہوتے دیکھا اور سنا ہے۔''

(شمس الرحمٰن فاروقی-ص:51)

''نارنگ ساقی ہمہ جہت شخصیت کے مالک ہیں۔ان کے طنز و مزاح میں عامیانہ پن نہیں اور نہ ہی انہوں نے پھکڑ پن کا سہارا لیا ہے۔انہوں نے بڑی مہارت سے اپنے نشترِ قلم سے انسانی رویوں کا پوسٹ مارٹم کیا ہے۔ان کے قلم میں بلا کی کاٹ ہے۔بات سے بات پیدا کرنے کے ہنر میں ان کو عبور حاصل ہے۔اپنے اسی ہنر سے کام لیتے ہوئے موصوف نے بعض ایسی تحریریں تخلیق کی ہیں۔جنہیں شاہکار کہا جا سکتا ہے۔دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں اسی طرح لوگوں کو ہنسانے کا ہنر جاری رکھتے ہوئے عمرِ دراز عطا کرے۔'' (سید نسرین نقاش-ص:135)

''نارنگ ساقی صاحب نے برسوں کی مسلسل تگ ودو اور محنت سے یہ لطیفے جمع کیے ہیں۔ نئے سرے سے ان کی ترتیب وتسوید کی ہے۔ ہم جانتے ہیں کہ ہند و پاک کے لاتعداد مشاہیر شعروادب سے ان کے دوستانہ مراسم ہیں۔ان کی مدد سے انہوں نے کوشش کی ہے کہ لطیفوں کا سب سے مستند روپ ہی شامل اشاعت ہو اور وہ غیر ضروری حاشیہ آرائی یا مبالغہ سے پاک ہو۔ یہ کام بڑا مشکل اور صبر آزما تھا لیکن شاید ان کے حقیقت پسندانہ مزاج نے آسان کر دیا۔ الگ الگ بعض ادیبوں کے لطیفے شائع ہوتے رہے ہیں۔ لیکن جہاں تک مجھے علم ہے باکمال ادیبوں کے لطیفوں پر مشتمل اردو میں یہ پہلا جامع انتخاب ہے، جو امید ہے اہلِ ذوق سے پوری داد حاصل کرے گا۔''

(پروفیسر قمر رئیس-ص: 85)

طنز و مزاح چاہے کیسا بھی کیوں نہ ہو اس کے بیان سے ہی اس میں گدازیت اور مسحور کرنے والا انداز نمایاں ہوتا ہے۔ اسی طرح جب لطائف کو لفظوں کی شکل میں صفحہ قرطاس کے حوالے کیا جاتا ہے تو شگفتہ بیانی چہرے پر مسکراہٹ لانے میں معاون ہوتی ہیں۔ نارنگ صاحب نے سارے لطائف جمع کرنے میں جس طرح کی تحقیق کیا ہے قابلِ تحسین ہے اور ان کی سنک کا نتیجہ ہے کہ ہمیں اتنے اچھے لطائف ایک ساتھ پڑھنے کو مل گئے ہیں۔ سونے پر سہاگا نارنگ صاحب کے لفظوں سے گدازیت پیدا کرنے کو جاتا ہے۔ انہوں نے لطیفہ جس انداز میں سنا ہو لیکن جس انداز میں انہوں نے موقع اور Situation کو بیان کرنے کا طریقہ اپنایا ہے اس سے لطائف میں جان پڑ گئی ہے اور جب قاری انہیں پڑھنے بیٹھتا ہے، لطائف ہمک ہمک کر قاری سے گفتگو کرتی ہوئی محسوس ہوتی ہیں۔ اپنے ساتھ گھنٹوں بتیاتی ہیں۔ آبشار کی ٹھنڈک سے سرشار کرتی ہیں۔ اپنی خوشبوؤں سے عطر بیز کرتی ہیں جن کی بھول بھولئے میں قاری اپنی ساری پریشانیوں کو بھول کر مسکرانے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ سچ میں یہ کتاب پڑھنے سے مطلب رکھتی ہیں۔ آج کے مشینی یگ میں جہاں کس کے پاس وقت نہیں ہے لیکن یہ ایک ایسی کتاب ہے جو ذرا سی حسی پہلو رکھنے والے پڑھے لکھے کو پڑھنے کے لئے اکساتی ہے ایک مرتبہ کتاب شروع کرنے کے بعد اسے ختم کر کے ہی دم لینے پر مجبور کرتی ہے۔ الفاظ آبشار کی مانند ڈھلان کی طرف بہتی چلی آتی ہیں اور تپتے بدن پر گر کر

ٹھنڈک کا احساس دلاتی ہیں گدگداتی ہیں ظریفانہ حس سے ٹھٹھولی کرتی ہیں لبوں پر مسکراہٹ بکھیر جاتی ہیں۔ سیدھے سادے لفظیات اور لکھنے کا معصوم انداز نارنگ صاحب کو عظیم ادیب ہونے پر مہر ثبت کرتا ہے۔

نانارنگ ساقی کی 360 صفحات پر بکھرے ہنسی کے پھوارے سے ورق ورق، نظر نظر اور لفظ لفظ سے گزرنے کی غرض جستہ جستہ پڑھنے سے مطلب رکھتا ہے جو ہمیں رُک رُک کر، آہستہ آہستہ خرام قدمی سے وادئ مسکراہٹ میں گامزن رہنے کی تاکید بھی کرتے ہیں۔ان لطائف سے ہمیں یہ بھی اندازہ گزرتا ہے کہ چاہے وہ کوئی بھی ہو کتنا عظیم انسان اوپر سے سخت نظر آنے والا، اس کے دل کے نہاں خانے میں ظرافت کی کرنیں بھی پھوٹتی ہیں۔اس جنونی کیفیت کی احترام اور بڑھ جاتی ہے جب وہ اپنے قاری سے اپنی کم علمی کا ذکر کرتے ہیں۔آج کے تلخیوں سے بھرے دور میں چند لمحے ہی سہی شیرینیوں میں بدلنے کے لئے نارنگ صاحب مبارکباد کے مستحق ہیں۔ اس کتاب کی کامیابی ان کی محبت کا صلہ ہے۔ ہمارے درمیان ایسے جیالے اور پُر مذاق ادیب موجود ہیں یہ ہماری خوش بختی ہی ہے۔ہم ان سے اسی طرح کی اور بھی کئی کتابوں کی امید رکھ سکتے ہیں۔

جیسا کہ نظر آتا ہے انہوں نے کسی افراط وتفریط کے ادیبوں کو اس مجموعے میں جگہ دی ہے کسی ادیب سے مرعوب ومتاثر ہوئے بغیر سلیقہ مندی سے نیز بے راہ روی سے خود کو بچاتے ہوئے دھیمے دھیمے اپنی بات کہی ہے۔ بے حد سلجھے ہوئے انداز میں اور خوشگوار لہجہ جو ان کا اپنا ہے اس کا استعمال کرتے ہوئے، نہ تو انہوں نے ظرافت کے بہانے کسی کی پگڑی اچھالنے کی کوشش کی ہے اور اس طرح خود کی آبرو کے ساتھ دوسروں کو بھی بچالے جانا نارنگ صاحب کا علاقہ ہے جسے انہوں نے تصدیق کیا ہے۔ زیرِ نظر مجموعہ میں ظرافت کی امیج سطحیت نہیں ہے نہ ہی ابال بلکہ لذت سے استوار اور ظرافت کی ہلکی ہلکی اور دھیمی دھیمی آنچ دل کے نہاں خانے کو محظوظ کرتی ہے۔ لذت کا احساس دلاتی ہے۔ان کے یہاں ادب کے تہذیب ورثے کا نہ صرف احترام ہے بلکہ فنی التزام بھی بدرجہ اتم موجود ہے۔نارنگ صاحب کی حمیت خلوص ملائمت اور متانت، گدازیت کو بڑا دخل ہے۔ظرافت کا فن دلکشی اور شگفتگی چاہتا ہے اور یہ دونوں خصوصیات موصوف کے یہاں خاصیت کے ساتھ پائی جاتی ہے۔انہوں نے چیدہ چیدہ اور منتشر لطیفوں کی جس انداز میں سیرازہ بندی کی ہے اور کتابی صورت گری کا اہتمام کیا ہے اس کے لئے وہ قابل تحسین تو ہیں ہی ان کی ادبی وقار کو مزید مستحکم کرتا ہے۔

نارگ صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں ان تمامی حضرات کا شکریہ ادا کیا ہے جنہوں نے اس کتاب کے لئے مضامین لکھے ہیں اور جہاں کہیں سے بھی انہوں نے لطائف اکٹھا کیا ہے ان کا ذکر کرنے سے گریز

نہیں کیا ہے۔ آخر میں انہوں نے کتاب میں اگر کہیں لغزشیں ہیں تو اس کو اپنی کم علمی پر محمول کیا ہے۔ یقینی طور پر کتاب تلاش و جستجو کے لئے قابل تحسین ہے۔

ایم.آر. پبلیکیشن نے جس پا کیزگی اور نفاست سے اس ادبی مجلّہ کو چھاپا ہے تعریف کے مستحق ہیں۔ نارنگ صاحب کی کتابوں کی فہرست میں یہ سترھویں کتاب ہے۔ زیرِ نظر کتاب پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے۔ یہ کتاب ایک علمی اور ادبی گنجینہ کی حیثیت رکھتی ہے۔ اس معاشی گرانی کے دور میں بھی خرید کر پڑھنے میں خسارہ نہیں ہے۔

کتاب کا نام : **آئینہ در آئینہ**

مرتبہ : جمیلہ صغیر مبصر : **انور بھدرکی**

صفحات : 259، قیمت: 400 روپے، اشاعت: 2021ء

زیرِ نظر کتاب 'آئینہ در آئینہ' دراصل صغیر احمد صاحب کی تحقیقی و تنقیدی بصیرت پر مجموعہ ہے جس کو مرتبہ محترمہ جمیلہ صغیر نے ادبی دنیا کے سامنے پیش کیا ہے۔ عرشیہ پبلی کیشنز جو کتاب پرنٹ میں اپنی الگ شناخت رکھتے ہیں بڑی خوبصورت گٹ آپ کے ساتھ شائع کیا ہے۔ کتاب کا انتساب کہیں یا کچھ اور' 'ان جملہ مخلصین قلمکاروں کے نام کیا گیا ہے جن کی تحریر اس کتاب کی زینت بنی ہے''۔ کتاب کو پانچ ابواب میں منقسم کیا گیا ہے اور پھر ہر باب کے الگ الگ عنوان رکھے گئے ہیں۔ پیش لفظ محترمہ جمیلہ صغیر کی ہے۔ سخن ہائے گفتنی صغیر اشرف صاحب نے لکھی ہے۔ باب اول میں 'مضامین' کے عنوان سے صغیر اشرف کے سات مضامین کو جگہ دی گئی ہے۔ جو کہیں نہ کہیں پہلے شائع ہوئے ہیں۔

سرورق پر صغیر اشرف صاحب کا خوبصورت اسکیچ ہے تو پچھلے کور پیز پر ڈاکٹر نسیم احمد نسیم کی آراء شامل ہے۔ فلپ پر انجینئر شکور سکیر (آسٹریلیا) کی آراء بھی خوب ہے۔ خاص طور پر جو بات اس کتاب کی خاصیت ہے وہ ہے پروف ریڈنگ پر کافی کام کیا گیا ہے اور اس کتاب جو کہ 279 صفحات پر بکھری ہوئی ہے عرشیہ والوں نے خوبصورت گٹ آپ کے ساتھ شائع کیا اور مبارک باد کے قابل ہیں۔

صغیر اشرف کی ادبی کائنات اپنی وسعت کے توسط سے اتنی زرخیز ہے کہ وہ کسی تعریف کے محتاج نہیں ہیں۔ سارے مضامین نگاروں نے نہ صرف ان کی ادبی حیثیت میں ان کی فکشن نگاری، شاعری اور ادب اطفال پر کئے گئے کام کو سراہا ہے بلکہ ایک مصور کے ناطے بھی ان کی خوب خوب تعریف کی ہے۔ جس کا کمال جو پانچ اسکیچ اس کتاب میں شامل ہیں، اپنی بات اپنی خاموش زبان سے خود بیان کرتی ہیں۔ ایک ایک تصویر منھ بولتی داستان ہے

اور کتاب کے مطالعہ کے دوران رُک جانے اور ٹھہر کر انہیں غور سے دیکھنے کو مجبور کرتی ہیں، تب ان کی خاموشی نہایت راز و نیاز کے ساتھ لب کھولتی ہوئی محسوس بھی ہوتی ہیں۔ جس سے صغیر اشرف صاحب کی بحیثیت ایک مصور کے شناخت قائم ہوتی ہے۔ باب اول سے چند اقتباس پیش خدمت ہیں:

-صغیر اشرفؔ، وادیٔ کہسار نینی تال اترا کھنڈ کے وہ خوش نصیب ادیب، شاعر اور صحافی ہیں، جنہوں نے اپنے دور کے اردو ہندی کے مستند شاعر، ادیب، تحقیق و تواریخ پر دسترس رکھنے والی معتبر شخصیات کی صحبتِ ادب سے استفادہ کیا ہے۔ (پیش لفظ)

-قدرت نے مجھے تخلیقی ذہن تو عطا کیا لیکن ستم ظریفی یہ کہ میں تخلیق تو کر سکتا ہوں مگر اس کی تشہیر، اس کے پھیلاؤ یا اسے مقبول بنانے اور مرکزِ نگاہ توجہ مبذول کرانے کے حربوں کا استعمال نہیں جانتا۔ یہی وجہ ہے کہ چار دہائیوں کے طویل تخلیقی سفر میں کوئی بالاقدری حاصل نہیں کر سکا۔ (سخن ہائے گفتنی -از: صغیر اشرف -ص:15)

-جعفری صاحب میں مختلف الجہات ادبی شخصیت میں نتائج اخذ کرنے کی وہ صلاحیت تھی جو ان کے نظریات پر یقین نہ رکھنے والوں کے لیے بھی قابل قبول تھی۔ یہی وجہ تھی کہ دوسرے ترقی پسند نقاد و ترقی پسند ادیبوں نے جگہ جگہ اپنی تحریروں میں ان کی تخلیقات سے استفادہ حاصل کیا ہے۔ (علی سردار جعفری: ترقی پسند ادب کے آئینے میں -از: صغیر اشرف -ص:17)

-اردو ادب نے کرشن چندر سے بڑی ہستیاں پیدا کیں لیکن کرشن چندر برِ صغیر کی ترقی اور حریت پسند تحریکوں میں افق تا افق پھیلے ہوئے نظر آتے ہیں یہی وجہ ہے کہ کرشن چندر کو ایشیا کا سب سے بڑا افسانہ نگار ہونے کا شرف حاصل ہوا۔ (انسانی قدروں کا مرقع نگار: کرشن چندر -از: صغیر اشرف -ص:21)

-شبستانِ جذبات کی اس شمع انجمن میں محشرِ خیال قسم کے افراد کی تمدنی سرگرمیوں میں کنور صاحب آج بھی روشِ مستئی زندانِ جہاں ہی نہیں بلکہ یادوں اور یادداشتوں کے تمام چراغِ روح میں روشن نظر آتے ہیں۔ (ایک ہمہ گیر شخصیت تھی کنور مہندر سنگھ بیدی سحرؔ کی -از: صغیر اشرف -ص:44)

- ملک اور بیرون ملک میں اپنے فن کا جادو بکھیرنے والی اس گائیکہ کو حکومت ہند نے پہلے پدم شری اور بعد میں پدم بھوشن کے اعزاز سے نوازا لیکن ان کا سب سے بڑا حقیقی اعزاز عوام نے انہیں ان سے عقیدت اور پیار کے روپ میں دیا تھا۔ اس لئے بھی کے تھکے ہوئے ذہن کے لیے وہ سریلی آواز کے ساتھ تازگی کا ایک جام تھی جس نے کئی غیر ممالک، افغانستان، سوویت یونین اور پاکستان کا بھی دورہ کیا۔ (بیگم اختر: فن اور شخصیت کے آئینے

میں-از:صغیر اشرف-ص:45)

-ڈاکٹر ضیاالرحمٰن کا بطورِ مقالہ،اس کاوش کے ذریعہ اپنی ادبی تحقیقی اور تنقیدی صلاحیتوں،اور قلم کے سپردگی میں تاریخِ آزادی تحریک اور اردو صحافت کی ایک مکمل اسکیچ تخلیق کر کے قاری کو اپنی ایک سحرانگیز شخصیت سے متعارف کرایا اور اپنی صلاحتوں کا لوہا منوایا ہے۔(اسالیبِ فکر کا ایک نغمۂ بے پناہ : ڈاکٹر ضیا الرحمٰن صدیقی-از:صغیر اشرف-ص:65)

-ان افسانوں میں اظہار اور افکار کی روشنی میں گھر کی سالمیت،ازدواجی رشتوں کی حفاظت اور ان رشتوں سے پھوٹتی ہوئی کونپلوں سے انسیت اور انسیت سے وقت شعور اور مٹی کا مطالعہ ڈاکٹر رینو بہل کی فکری ترجیحات میں شامل ہیں۔(بدلی میں چھپا چاند-از:صغیر اشرف-ص:70)

باب دوم کو انتظار کی صلیب،حرفِ سخن،انتخاب:حرفِ سخن،سگندھ میرے دیش کی،سہانی دھوپ کا صحرا کے نام سے تقسیم ہے اور ان ٹائٹل کے تحت کچھ اچھے اچھے مضامین پیش کئے گئے ہیں''انتظار کی صلیب'' کے عنوان سے صغیر اشرف صاحب کے کہانیوں کا مجموعہ پر ڈاکٹر سہیل آذر کا مضمون'نفسیات وفطرت کی خوبصورتی کی کہانیوں کا خالق:صغیر اشرف'شامل ہے۔ڈاکٹر آذر فرماتے ہیں:

-صغیر اشرفؔ کے افسانوں میں جذبات کی فراوانی،خیالات کی گہرائی اور الفاظ کی برجستگی جگہ جگہ ملتی ہے۔خوبصورت الفاظ کے پیکر میں اپنے احساسات وخیالات کو ڈھالنے کا فن انہیں خوب آتا ہے۔ (ص:77)

حرفِ سخن کے عنوان کے تحت جن مضامین کو شامل کیا گیا ہے اس طرح ہیں۔'زندگی کی رعنائیوں، تلخیوں اور فطرت کی رنگینیوں کا عکاس:صغیر اشرف-از:دیپک بدکی'،'حیات و معاشرت کے ترجمان:سچے شاعر صغیر اشرف'،ادب کے بیکراں سمندر کے ایک ماہر تیراک۔از:ڈاکٹر ابوعدنان'،'نئی جہت،نئی سوچ،نئے اظہار کا امانت دار شاعر:صغیر اشرف'-از:عزیز بلگامی'،'حرفِ سخن کے آئینے میں-از:ڈاکٹر شہریار پرواؔز'،'صغیر اشرف کا مجموعۂ کلام،حرفِ سخن-از دیپک روحانی'،'حرفِ سخن:ایک مطالعہ-از:صبیحہ سُنبل'،'اپنی انفرادی شناخت،خود بنائی: صغیر اشرف نے-از ڈاکٹر مینا نقوی'،'زندہ معجزے سے کم نہیں صغیر اشرف کی تحریر-از سید حلیم حسین زیدی'،'تخلیقی قوت کا بہترین اظہار-از راجیش آنند اسیرؔ'،'اردو ادب کی ہمہ جہت شخصیت:صغیر اشرف-از:محمد اشہر سوداگر'،'افکار صغیر اشرفؔ-از:مہربان کاشی پوری'اور صغیر صاحب کی شاعری میں منظر نگاری بہت اچھے انداز میں پائی جاتی

ہے-از نورعلی‘۔ان مضامین کے چند اقتباس اس طرح ہیں:

-صغیر اشرف کے یہاں کلاسیکی اور روایتی غزل ملتی ہے جس میں جدائی بھی ہے اور انتظار بھی، امید بھی ہے اور مایوسی بھی، ہجر بھی ہے اور وصال بھی۔ان کے انداز بیان میں جدّت اور انفرادیت دونوں صاف طور پر نظر آتے ہیں اور وہ اکثر و بیشتر چھوٹی بحروں کا استعمال کرتے ہیں۔(-ص:81)

-صغیر اشرف اپنی ذات میں ایک انجمن ہیں۔ان کی ہمہ جہت اور فعّال شخصیت یہ یک وقت افسانہ نگار اور حسّاس شاعر کے روپ میں بھی جلوہ گر نظر آتی ہے اور ایک صحافی و انشاء پرداز کی حیثیت سے بھی اپنی اہمیت کا لوہا منوانے کی صلاحیت رکھتے ہیں۔(ص:92)

-بہر کیف، غموں کو اپنے دل کی امانت بنائے ملّت کا یہ غمخوار شاعر اپنے تخلیقی سفر میں آگے ہی آگے بڑھتا نظر آتا ہے۔اس دورِ شاعرانہ کے سے خود اعتمادی لے کر وہ شعر کہنے کا ہنر جان گیا ہے۔

(ص:98)

-صغیر اشرف صاحب ان شاعروں میں ہیں جنھوں نے غزل کو عشق و محبت کی سنکری گلیوں سے نکال کر ہر عام آدمی کے درد اور ہنسی کو جوڑ دیا ہے۔نفرت کے ان گھنے بادلوں اور درد کی بے رحم بارش کے بیچ کچھ سکھد پلوں کے لئے ’سہانی دھوپ کا صحرا‘ کسے عزیز نہ ہوگا۔ (ص:177)

انتخاب: حرفِ سخن میں صغیر اشرف صاحب کے مجموعہ کلام سے: ایک حمد، دعا، 25 غزلیں اور سات نظموں کو جگہ دی گئی ہے۔’سگندھ میرے دیش‘ کی عنوان کے تحت آٹھ مضامین رکھے گئے ہیں۔جن میں کچھ ہندی سے ترجمہ بھی ہیں، میری ناقص رائے میں مترجم کا نام دیا جانا چاہئے تھا اور اگر مرتب نے خود ترجمہ کیا ہے تو بھی نام دیا جانا بہتر ہوتا۔باب سوم میں تبصرے کے عنوان سے چار مختلف ادیبوں کے صغیر اشرف صاحب کی کتابوں پر تبصرے پیش کئے گئے ہیں۔

اس مجموعہ میں مضمون، تبصرے، تاثرات کے ذریعے، نہ صرف اردو بلکہ ہندی کے بھی کئی معتبر ادیبوں نے صغیر اشرف صاحب کی خوب سراہنا کی ہے اس سے نتیج کیا جا سکتا ہے کہ وہ ایک معتبر اور اچھے ادیب ہونے کا ساتھ ساتھ اچھے مصور بھی ہیں، اچھے تبصرہ نگار اور ایک اچھے انسان بھی۔یہ کتاب ان کی معتبریت کو مصدق کرتی ہے۔

میری ناقص رائے میں اس کتاب میں کچھ سوال جواب کے بطور صغیر اشرف صاحب کا محاسبہ بھی رکھا جا سکتا

تھا۔جس سے انہیں سمجھنے میں اور زیادہ سہولت ہوتی۔صغیر اشرف صاحب نے بھی اپنی مصوری کے تعلق سے کھل کر کہیں ذکر نہیں کیا ہے۔اس طرح کی کتاب جو کہ تحقیقی حیثیت کی حامل ہیں ان سب باتوں کا دھیان رکھا جانا چاہئے تھا جو حوالہ کے لئے استعمال کئے جاسکتے تھے۔کتاب میں بڑے پیانے پر مضامین پیش کئے گئے ہیں۔صغیر اشرف صاحب کی تمام تصنیفات کا بیورا نہیں دیا گیا ہے۔ایک جگہ 283 صفحہ کے آخری پیرا پران کی کتابوں کے نام درج ہیں۔اگر ان کی تصنیفات اتنی بھی ہیں تو بھی انہیں ایک جگہ سنِ اشاعت کے لحاظ سے رکھا جانا چاہئے تھا اور اگر کچھ غیر مطبوعہ کلام ان کے ہونگے (ہونی چاہئے)،ان کا کچھ ذکر کے ساتھ نمونہ بھی پیش کردی جاتی تو اچھا ہوتا۔

باب چہارم میں تاثرات کے عنوان سے بیس تاثرات پیش خدمت ہیں۔پھر منظوم تاثرات میں۔صغیر اشرف کے لئے کہی گئی منظوم تاثرات کو جگہ دی گئی ہے،جن کی تعداد،بارہ ہیں۔مصور:صغیر اشرف صاحب کے پانچ اسکیچ پیش کئے گئے جو معنی خیز تو ہیں ہی پر کشش ہونے کے ساتھ اپنے مصور کی تاثرات کا اظہار بھی ہے۔باب پنجم میں دو عنوان ہیں،صغیر اشرف:خطوط کے آئینوں میں،کے تحت صغیر اشرف کے نام بائس ادیبوں کے خطوط شاملِ اشاعت کی گئی ہیں۔اور پھر اختتامیہ عنوان کے تحت

،امین جس پوری صاحب کی'یوں ہی مل گیا تھا.....'جس میں صغیر اشرف صاحب کے سارے کارناموں کا احاطہ نہایت خوبصورتی اور معصومیت کے ساتھ کیا گیا ہے ساتھ ساتھ ادیبوں کے چند آراء بھی پیش کئے گئے ہیں۔

اس کتاب سے یہ رائے قائم کیا جاسکتا ہے کہ صغیر اشرف کثیر الجہات افکار و نظریات کے ادیب کے بطور معتبریت کے حامل ہیں۔ان کی طرز نگارش ہی اس کی شاہد ہے کہ موصوف ایک معتبر ادیب ہیں۔ان کی نئی جہت،نئی سوچ اور نئی اظہاریت اس کی تصدیق کرتی ہے۔ان کے نئے خیالات،نئے اسلوب نئی طرزِ نگارش نیا لہجہ، نئی ہنرمندی،نئے خلاقانہ انداز ان کے مضامین میں محسوس کئے جاسکتے ہیں۔

ادب محض تفریح کا سامان نہیں ہیں اس کو سنجیدگی کے ساتھ سمجھنا اور برتنا چاہئے۔ادب اپنے عہد اور اپنے دور کی اخلاقی اقدار کا تابع ہوتا ہے۔بنیادی طور پر ادب کا مقصد مسرت پیدا کرنا ہے۔ان کی فن کاری اپنے عہد کی اخلاقیات کی ترجمانی کرتی ہے۔آج جب معاشرہ تنزلی کے کگار پر ہے،مبالغہ اور تعیش کی عادی ہوگئی ہے، حقیقت اور سچائی کو سننا نہیں چاہتی ہے۔اخلاقی اقدار تہس نہس ہوکر رہ گئی ہے۔سماج جس دور میں زندگی کے حقائق سے منہ موڑنے لگا ہے۔ایسے ماحول میں ایسی حدت بھرا ادب تخلیق کرنا نہایت مشکل امر ہے۔صغیر اشرف صاحب نے کہیں بھی ناصحانہ اور خطیبانہ انداز نہ اپناتے ہوئے،اخلاقی اور اقدار کی باتیں بالواسطہ کہنے کی کوشش کی ہے

۔شعری اشاروں کنایوں سے کام لیا ہے اور شعری لوازمات کا خوب خوب خیال بھی رکھا ہے۔ان کے شعر کو شعری محاسن کے ساتھ پیش کرنا ہی ان کی کہنہ مشقی کی دلیل ہے اور احترام کے قابل بھی۔

صغیر اشرف نہ صرف اردو کے اچھے ادیب ہیں بلکہ ہندی ادب میں بھی اچھا دخل رکھتے ہیں۔ان کی ہندی تخلیقات اس کے شاہد ہیں۔انہوں نے ہندی میں 'سہانی دھوپ کا صحرا (شعری مجموعہ)،سگندھ میرے دیش کی (مضامین کا مجموعہ) اور گل مہر اور املتاس کا اسپندن (ہندی کویتاؤں کا مجموعہ) جیسی تین کتاب بھی تخلیق کی ہے۔ان کی ہندی تخلیق پر بھی ،ہندی ادب سے جڑے کئی معتبر ادیبوں نے خامہ فرسائی کی ہے۔زیر نظر کتاب میں مجموعہ 'سگندھ میرے دیش کی' پر جن مضامین کو دیا گیا ہے وہ اس طرح ہیں: تاریخ ،ادب ،تحقیق پر ایک دستاویز: سگندھ میرے دیش کی-از: مہابیر روانلٹا ،ادبی بھگتی کا بودھ کراتی پستک-از: تارادت پانڈے ادھیر ،سگندھ ساگر کا اوگاہن-از: ڈاکٹر سدھیشور سنگھ، دیش کو سمان دلاتی دستاویز-از: ڈاکٹر میرا ابھر دواج قلم کی جنبش کے سلسلے کی ایک کڑی:صغیر اشرف-از: ڈاکٹر ستہ پرکاش مشرا،امن شانتی اور محبت کی تلاش کرتا سنت-از: راجارام ویدیارتھی، اور اچھوتی باتیں-ازمنو بھاردواج منو۔

اسی طرح ان کا مجموعہ'' سہانی دھوپ کا صحرا'' کے تعلق سے بھی پانچ مضامین شامل کئے گئے ہیں۔باب سوم میں چار تبصرے شامل ہیں۔ان کے عنوان اس طرح ہیں:صغیر اشرف ایک نہ تھکنے والا مسافر-از: ناصرہ شرما،صغیر:اشرف واکبر ہے-از: ڈاکٹر سردار ضیاء، ادبی شعور سے زیادہ قریب شاعری-از: ڈاکٹر ظل ہما، اور سرابوں سے ابلتا ہوا دریا-از: راشد جمال فاروقی۔

باب چہارم، تاثرات کے لئے وقف ہے جس میں 20 بیش تاثرات شامل ہیں، جبکہ منظوم تاثرات بھی 12 بارہ شامل ہیں۔باب پنجم، صغیر اشرف: خطوط کے آئینوں میں کے عنوان سے ہے۔جس میں 30 تیش خطوط شامل ہیں۔کچھ ہندی ساہتیکاروں کے تبصرے اس طرح ہیں:

''اشرف صاحب ایک غزل کار ہی نہیں، ایک کہانی کار، اور ایک پتر کار بھی ہیں۔انہوں نے ساہتیہ کی الگ الگو دھاؤں میں اتیہاس، تصوف، کاویہ، شاعری، کہانی، سنگیت (موسیقی)، گائیکی اور کھوج پرکھ، لیکھ آلیکھ سے دیش ودیش کے استریہ(معیاری) پتر پتریکاؤں میں سیکڑوں رچناؤں کے پرکاشن کے مادھیم (ذریعہ) سے علم و ادب کے پاٹھکوں

میں اپنی اُپستھیتی درج کرائی ہے۔''

(زندگی کا ایک بڑا حصہ ساہتیہ سرجن کو دیا صغیر اشرف نے -از: روپ چند شاشتری-ص:217)

صغیر اشرف صاحب کی مصوری پر بحث کرتے ہوئے جس پوری صاحب یوں رقمطراز ہوئے ہیں:

''ان کا جوفن ان کی روح کی تسکین کا بہترین مشغلہ ہے اس کا اظہار انہوں نے بہت کم کیا ہے، لیکن اس کو اپنی زندگی کا بہت وقت دیا ہے۔ ان کا یہ فن ہے باریک قلم سے افسانوی انداز کی شبیہوں کی مصوری۔ سیکڑوں تصاویر اسکیچ کرنے کے بعد انسانی چہروں کی تاثراتی فیچر کو نقش کرنے میں ان کو کمال کی دسترس حاصل ہو چکی ہے۔فطری مناظر کی عکاسی سے بھی انہیں عشق ہے۔''

(تفریظ-ص:251)

صغیر اشرف صاحب نے اپنی ادبی ذمہ داری جس انداز سے نبھائی ہے ان کی تمام تخلیقات اس کی شاہد تو ہیں ہی ان کے تعلق سے لکھے گئے تبصرے، تاثرات سے بھی ان کی ادبی حیثیت کا خلاصہ ہوتا ہے۔جس کا ایک مثبت ثبوت ان کا مجموعہ ''وآئینہ در آئینہ'' ہے اور یہ ثابت ہوتا ہے کہ صحیح معنوں میں موصوف ایک کثیر الجہات ادیب ہیں۔انہوں نے جس انداز میں شاعری کی، اسی تقاضے کے ساتھ فکشن نگاری بھی کی ہے۔انہوں نے اردو کے ساتھ کئی اچھی تخلیقات ہندی ادب کے حوالے بھی کئے ہیں۔وہ کئی ادبی تنظیموں سے بھی براہِ راست جڑے ہوئے ہیں۔لفظوں کی مرصع سازی ان کی خصوصیت ہے۔ان کی فنی پختگی میں خامۂ تفکر کا استقلال و انضباط ہی نہیں،انہوں نے افسانوں میں جس انداز میں ہئیت پر زور دیا،لفظوں کی لسانی تشکیلات اور اظہاریت کو برتنے کی بنت کاری کی ہے ان کی فنی وابستگی کو مستحکم کرتی ہے۔موصوف وہیں نہیں رُکے بلکہ ایک قدم آگے نکل کر مصوری کے ساتھ ساتھ صحافت کے میدان میں اچھی کارکردگی کا بہترین مظاہرہ کیا ہے۔ہر ایک تبصرہ نگاروں نے ان کی تخلیقی صلاحیت کا اعتراف کیا ہے۔جس سے ہٹ کر کچھ کہہ لینا مشکل ہے۔یہ اقتباس بھی بغور پڑھے جانے کے قابل ہے:

''صغیر اشرف واقعی گلشنِ فکر میں تحریر کے گل کھلانے کا ہنر جانتے ہیں۔

ان کو دھرتی پہ بکھرے حسن سے عشق ہے۔ وہ اندر دھنوشی صفات
رکھنے والے شاعرِ مست قلندر، محبت کے جام سی لبریز شخصیت کے حامل
ہیں۔ جہاں مخلص شخص، وسیع النظر، ادب شناس ایک مست قلندر کا مزاج
رکھتے ہیں وہیں بحرِ ادب کے ماہر غوّاص اور تیراک بھی ہیں۔''

(ص:289)

یوں تو صغیر اشرف صاحب ایک اچھے غزل گو اور بہترین فکشن نگار ہیں لیکن جس صنف میں ان کا اصلی جوہر نکھرا ہے وہ ہے ان کی نظم نگاری، جہاں وہ اپنی تمام تکلفات سے آزاد ہو کر اپنے اندر کی دنیا ہمیں دکھاتے ہیں۔ ان کی نظموں میں جذبات کی شدت بھی ہے اظہار کی برجستگی بھی۔ موصوف اپنی نظموں کے ذریعے اپنی شاعرانہ صلاحیت کا نہایت سلیقگی سے اور ہنرمندی سے استعمال کرتے ہوئے حالات کی تلاطم خیزی کو جس صناعی سے تصویر کشی کی ہے ان کی بت گری کی دلالت کرتی ہے۔

اس مختصر مضمون میں چاہتے ہوئے بھی وہ سب کچھ نہیں رکھا جا سکا جو صرف اور صرف کتاب کا مطالعہ سے ہی مل سکتا ہے۔ اس کتاب کا مطالعہ سے صغیر اشرف صاحب کے متعلق اور بھی تمام چیز جاننے کا استیاق ہونے لگتا ہے۔ زیرِ نظم کتاب
'آئینہ در آئینہ دراصل سمندر جیسی موصوف کی ادبی شخصیت کو کوزے میں سمیٹنے کوشش قابلِ تحسین ہے۔ امید ہے اردو کے قاری اس کتاب کو پسند کریں گے۔

☆

کتاب کا نام : **نیا حمام**

مصنف : ڈاکٹر ذاکر فیضی مبصر : **ایس ایم حسینی**

صفحات : 203، قیمت: 250/روپئے سن اشاعت: 2020ء

مطبع : روشان پرنٹرس، دہلی

"نیا حمام" پانچ افسانچے اور پچیس زندہ کہانیوں پر مشتمل دو سو تین صفحات پر پھیلا ہوا ذاکر فیضی کا پہلا افسانوی مجموعہ ہے، جس کے کردار ہمارے اور آپ کے درمیان ہی سانس لیتے ہیں اور چلتے پھرتے نظر آتے ہیں، ڈاکٹر ذاکر فیضی نے جواہر لال نہرو یونیورسٹی سے پی ایچ ڈی کی ہے اور اس وقت تدریس سے وابستہ ہیں، نیا حمام

منظر عام پر آنے کے بعد ذاکر فیضی کا نام کسی الجھن کا شکار نہیں، آپ کا تعلق شہر مراد آباد سے ہے اور فی الوقت دہلی میں رہائش ہے، ذاکر فیضی تین دہائیوں سے لکھ رہے ہیں اور اردو کے معتبر رسائل و جرائد میں آپ کی کہانیاں، تنقیدی و تحقیقی مضامین مسلسل شائع ہوتے رہے ہیں، مزید پاکستان سے شائع ہونے والے افسانوی انتخاب سرخاب میں آپ کی ایک کہانی بھی شامل ہے۔

"نیا حمام" کی کہانیاں اسلوب، انداز، بیان اور ہیئت کے اعتبار سے ایک نیا احساس اور انفرادیت لی ہوئی ہیں، جس میں فن کے لوازمات کا پاس اور تخلیقی رو کا بہترین استعمال ملتا ہے، ذاکر فیضی کی کہانیوں پر اجنبیت کا نقاب نہیں پڑا ہے بلکہ انہوں نے اپنے افسانوں میں جو تصویر دکھائی ہے وہ ہمارے آج کے معاشرے کا عکس ہے، ان پر قدامت و رجعت کا ٹھپہ نہیں لگایا جا سکتا، آپ کے قلم کے نیچے زمانہ کی نبض دھڑکتی ہوئی محسوس ہوتی ہے، جس نے ذاکر فیضی کو واقعی "فرضی کہانی کار" ہونے سے بچا لیا ہے، آپ کے افسانوں میں کشمکش اور دائمی اضطراب کی کیفیت ملتی ہے، ذاکر فیضی تجربے اور احساسات کی نئی صورتیں وضع کرتے ہیں جو زیادہ مانوس، زندگی سے قریب اور سچی معلوم ہوتی ہیں، افسانوں کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ آپ نے زندگی کو بہت قریب سے، گہری اور حساس نظروں سے دیکھا ہے۔

کتاب کی ابتداء میں غلام عباس نیر کی نظم "خواب کو موت آتی نہیں" شامل ہے، ایک صفحہ پر مشاہیر کے اقوال ہیں، اگلے صفحات پر رضی شہاب اور ڈاکٹر رغبت شمیم کے تاثرات کے علاوہ مصنف نے اپنے قلمی، تعلیمی اور لکھنے سے چھپنے تک کا مرحلہ طے ہونے کی مختصر روداد بیان کی ہے، پہلا افسانہ "نیا حمام" ہے اور یہی کتاب کا نام بھی ہے، جس میں ڈاکٹر فیضی نے میڈیا کے اس تاریک اور پوشیدہ حصے سے نقاب اٹھایا ہے جو آج عام ہو کر بھی ایک دائرہ میں قید محسوس ہوتا ہے، ہم سمجھتے بوجھتے ہوئے اس سے نظر پھیر رہے ہوتے ہیں، کہانی میں مرکزی کردار گودی میڈیا ہے اور اسکرپٹ رائیٹر، رپورٹر، کیمرہ مین، چینل ایڈیٹر، این جی اوز کے صدر، فلاحی تنظیمیں اور ادارے، بزنس مین وغیرہ ایسے مہرے جو آنکھوں پر مفاد پرستی کا عینک چڑھا کر اپنا بھرپور رول ادا کرتے ہوئے نظر آتے ہیں اور جرم میں بھی جواز کی شکل ڈھونڈ لاتے ہیں، کہانی میں ٹی آر پی کے لئے میڈیا کی ان شرمناک حرکتوں کا بیان ہے جو انسانیت سے اعتماد اٹھانے کے لئے کافی ہے، معاشرے کے افراد میں مادیت پرستی کے عناصر ایسے پیوست ہو چکے ہیں کہ انسان جرم کے ارتکاب سے بھی گریز نہیں کرتا اور ایسے طریقے اپناتا ہے جس سے سیاہ بھی سفید نظر آنے لگے، کہانی پڑھ کر قاری ایک بار چونکتا ضرور ہے، فیضی صاحب نے اتنے آہستہ روی سے یہ کہانی بنی ہے کہ قاری تشنج میں

مبتلا ہو جائے، کہانی کی ابتدا چونکانے اور قاری کو باندھ لینے والی ہے جس کے اختتام پر ماں کی ممتا کا عکس دھندلا ہو جاتا ہے۔

افسانہ "ٹوٹے گملے کا پودا" انسانی رشتوں کی شکست وریخت کی ایک مضطرب کہانی ہے، آج کا انسان محبت بانٹنا بھولتا جارہا ہے جس سے نئے نفسیاتی مسائل جنم لے رہے ہیں، جو کسی تپکن سے کم نہیں ہوتے، یہ افسانہ "پدرم سلطان بود، بے جانا اور خود فریبی کا عکاس ہے، "فنکار" ایک چبھتا ہوا افسانہ ہے، ہر شخص اپنے فن اور آرٹ کی آڑ لے کر اپنی تسکین اور مفاد دیکھتا ہے، وہ اذیت کی تصویر تو کھینچ دیتا ہے لیکن اذیت اس کے لئے ایک کہانی، ایک پینٹنگ اور ایک تصویر سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتی، اصل فنکار تو وہ ہیں جو اس کرب سے گزرتے ہیں، خاموش مصائب کو جھیلتے ہیں اور ان کے خشک لبوں سے مسکراہٹ لمحہ بھر کو بھی نہیں بجھتی، یہ ایک تیزاب زدہ لڑکی کہانی ہے، جس میں کچھ نہ کہہ کر بہت کچھ کہہ دیا گیا ہے، مثلاً ہزاروں سال سے عورتوں کا استحصال ہوتا چلا آرہا ہے لیکن اب اس کا طریقہ کار بدل گیا ہے، جس کی ذمہ دار عورتیں نہیں مرد خود ہیں، افسانہ کا ایک اقتباس پڑھئے اور غور کیجئے:

"چوتھے نے تینوں کو باری باری دیکھا اور مسکراتے ہوئے کہا: یہ تو حقیقت ہے کہ مردوں کے لئے استعمال ہونے والی چیزوں بھی لڑکیاں ہی نظر آتی ہیں، مگر کیا کبھی ہم نے یہ سمجھنے کی کوشش کی ہے کہ ان پروڈکٹ کی کمپنیوں کے مالک بھی زیادہ تر مرد حضرات ہی ہوتے ہیں، اور ایڈ بنانے والی ایجنسیوں کے مالک بھی مرد ہی ہوتے ہیں، آخر وہ کیوں لڑکوں کا استعمال نہیں کرتے، آخر پبلک تو وہی دیکھتی ہے جو کمپنیاں دکھاتی ہیں، اس اعتبار سے معاشرے کی گرتی ہوئی قدروں کے ذمہ دار عورتیں نہیں ہیں"۔

"ٹی او ڈی" کے عنوان سے لکھا گیا افسانہ، افسانہ نہیں بلکہ ہماری اور آپ کی حقیقی داستان ہے، یہ ان کی کہانی ہے جو خواب دیکھتے ہیں اور اس کا ٹیکس اپنی سانسوں سے ادا کرتے ہیں، یہ کہانی حکومت کی تاناشاہی اور من چاہے فیصلوں کو بیان کرتی ہے، جسے پڑھ کر گزشتہ سالوں کے واقعات ذہن میں تازہ ہو جاتے ہیں، "وائرس" ایک نفسیاتی قسم کی کہانی ہے، جس میں قاتل پر مقتول کے آخری جملے اثر انداز ہوتے ہیں اور وہ نفسیاتی الجھن، تناؤ اور بے چینی کا شکار ہو کر ایک زندہ لاش بن جاتا ہے۔

"اسٹوری میں دم نہیں ہے" بچوں سے زیادتی اور ان کے جسمانی استحصال پر مبنی ہے، ساتھ ہی نیوز رپورٹرس اور تھانے داروں کی بخیہ ادھیڑی گئی ہے، لیکن جملے بے ربط ہیں، اور روانی سے خالی ہیں، کہانی بس ٹھیک ہے، "ہریا کی حیرانیاں" میں جمود اوقت کا استعارہ ہے، یہ ایک دلچسپ کہانی ہے جو پڑھنے سے تعلق رکھتی ہے، "میں آدمی وہ

انسان "اس کہانی میں بتایا ہے کہ آج بھی کچھ افراد ایسے ہیں جن کے اندر کا انسان ابھی بھی زندہ ہے اور وہ اس بھری پُری بے ڈول دنیا میں بغیر کسی غرض اور مقصد کے محض ہمدردی کے جذبہ سے لوگوں کا دکھ درد بانٹتے ہیں، "اتفاق" یہ ایک استعاراتی کہانی ہے، جس میں ترقی یافتہ گھرانے کے ماحول، بے حیائی، بڑھتی ہوئی بے شرمی اور ان خواتین پر بھر پور چوٹ کی ہے جو شوہر کی غیر موجودگی کا فائدہ اٹھاتی ہیں اور ہر وہ کام انجام دے لینے کی ہمت رکھتی ہیں جو اپنے شوہر کے ساتھ نہیں کرتیں، کہانی کا اختتام دلخراش اور حیرت زدہ کرنے والا ہے۔

یادیں ہمیشہ ہمارا پیچھا کرتی رہتی ہیں، بطور خاص زمانہ طالب علمی کے ایام اور وہ جگہ جہاں یہ دن گزارے گئے ہوں شدت سے یاد آنے لگتے ہیں، بے جان چیزوں سے بھی آپ کو بعض وقت لگاؤ ہو جاتا ہے اور چھوٹی سے چھوٹی بات بھی خوشی دیتی ہے، افسانہ "میرا کمرہ" اسی جذبہ اور احساس کی عکاسی کرتی ہے، آپ کے اندر کا ہنس مکھ اور کھلنڈر جوان ہمیشہ زندہ رہتا ہے اور کالج لائف کی مٹر گشتیاں دل کے کہیں کسی گوشہ میں چھپی بیٹھی رہتی ہیں، "جنگ جاری ہے" یہ افسانہ ضمیر، ایمان، شیطان، سچ، جھوٹ، حال، مستقبل کے ذریعہ بُنی گئی ہے، لفظوں کی بنت مزیدار نہیں ہے، البتہ کہانی ہمارے حال کی آئینہ دار ہے جس میں سماجی، معاشرتی و سیاسی منظر نامہ کی بھر پور تصویر کشی کی گئی ہے، "ہم دھرتی پر بوجھ ہیں" ایک عجب کہانی ہے جس کی ابتداء اور اختتام نرالا ہے، جس کا موضوع افلاس، پریشانی، کشمکش، تعصب، فرقہ وارانہ فسادات ہیں، ساتھ ہی افسانہ نت نئی بیماریوں لوگوں کی کسمپرسی، لاچاری و بیچارگی کو بیان کرتا ہے، یہ پورا افسانہ بولتا ہوا محسوس ہوتا ہے جس کی آواز کی گونج وقتاً فوقتاً ہم اپنی آنکھوں سے دیکھتے اور سہتے رہتے ہیں، "عجوبہ کا عجائب گھر" یہ کہانی خاندانی شرافت، بے لوث محبت، خلوص اور اخلاقیات کا درس دیتی ہے، " گیتا اور قرآن" میں مطلب پرستی اور مفاد پرستی کو درشایا گیا ہے، جس میں بتایا گیا ہے کہ کہانی کار فرضی قصوں میں مرچ مسالہ لگا کر، سچ و جھوٹ کا مکسچر کر کے اپنی مارکیٹ بنانے کے لئے کس طرح لوگوں کے جذبات سے کھیلتا ہے، حالانکہ قصے کا اختتام دوسرے رنگ اور ڈھنگ سے بھی کیا جا سکتا تھا۔

"پروفیسر صمدانی نے گاڑی میں بیٹھتے ہوئے کہا: بھ، بات یہ ہے کہ مارکیٹ بھی کوئی چیز ہوتی ہے، بازار واد ہے، مارکیٹ کا زمانہ ہے، ڈیمانڈ اور سپلائی کا معاملہ ہے، آج کل ایسی ہی کہانیوں، افسانوں اور ناول کی ڈیمانڈ ہے، مارکیٹ ہے تو میرے ذہن نے اسی کو سپلائی کیا، انہیں لفظوں کے ساتھ پروفیسر صمدانی کی گاڑی آگے بڑھ گئی"۔

" آدمی مانو" ریپ، لوٹ مار، عورتوں کے استحصال پر ایک اچھی کہانی ہے، آج کی جو صورت حال ہے وہ یقیناً

زمانہ قدیم کی طرف ہمیں ڈھکیل رہی ہے، "مُردوں کی الف لیلی" نے مجھ پر ایک خاص تاثر قائم کیا، افسانہ کے اختتام پر لمحہ بھر کو سکتہ سا رہا، اس میں جیتے جاگتے شخص کو مردے سے، گھر کو قبر سے تشبیہ دے کر پریشانیوں اور مصیبتوں کو جن سے ایک انسان جھوجھتا ہے کیڑے مکوڑوں سے تعبیر کرتے ہوئے پورا افسانہ بہترین پیرائے اور دلکش انداز میں لکھا گیا ہے، جس کے اخیر میں وہی مردہ یادداشت کھونے کا ڈرامہ رچتا ہے:

"مردہ اب جلد ہی گھبرا جاتا ہے، یہ دیکھ کر کہ بڑی بیٹی کی شادی کا قرض سر پر ہے، چھوٹی بیٹی جوان ہو چکی ہے، یہ دیکھ کر کہ بڑا بیٹا بے روزگار ہے، سرکاری نوکری کے علاوہ زندگی کی جنگ لڑنا نہیں چاہتا، یہ دیکھ کر کہ چھوٹے بیٹے کی پڑھائی ادھوری ہے، یہ دیکھ کر کہ قبر کا ایک تختہ گل گیا ہے"۔

"دوست جاتے وقت مردے کی گود میں کاغذ کا ایک ٹکڑا ڈال گیا، ٹکڑے پر لکھا تھا، "اے مردے! یادداشت کھو جانے کا ڈرامہ بند کر دے، یہ بہت خطرناک ہوتا ہے۔۔۔ یہ ڈرامہ میں خود پر آزما چکا ہوں"۔

"کوڑا گھر" "ورثے میں ملی بارود" "کلائمکس" "اخبار کی اولاد" اور "بدری" میں لڑکی کی پیدائش پر اظہار نفرت، غربت، مفلسی، بے روزگاری، رشوت خوری، پولیس والوں کی کمینگی اور چھپری باز لونڈوں کی حرکتوں کا ذکر ملتا ہے، " کھڑکی لرزتی ہے" آج کے نوجوانوں کی محبت اور عشق پر ایک شاندار افسانہ ہے، "دعوت نون وتیج" پڑھتے ہوئے لگتا ہے یہ کہانی بچوں کے لئے لکھی گئی ہے، لیکن پروٹسٹر، آتنک وادی جیسے الفاظ پڑھ کر یہ خیال غلط ثابت ہوتا ہے، بہر حال ایک عمدہ اسٹوری ہے، جس میں موجودہ صورتحال کی بھرپور عکاسی کی گئی ہے۔

کتاب میں شامل افسانچے "جھٹکے کا گوشت" "اکیسویں صدی کی داستان" "دلہن" "انسان کی موت" اور " کپڑوں میں پیشاب کرنے والے" اپنے اندر نیا پن اور انفرادیت لئے ہوئے ہیں، "اکیسویں صدی کی داستان" دردو کرب میں لپٹا ایک دلچسپ افسانچہ ہے، جس کا ایک جملہ نذر قارئین ہے: "یہی کہ ان کے پیٹ میں روٹی ہے، بوڑھے نے یہ کہہ کر انٹلیکچوئلی کا بھاری گٹھر سر پر لاد لیا اور لرزتی، کانپتی سوکھی ٹانگیں آگے بڑھ گئیں"۔

ذاکر فیضی کہانی نہیں لکھتے ہیں تصویر میں رنگ بھرتے ہیں اور ساکت مجسمہ میں لفظوں سے روح ڈالنا آپ کے لئے کوئی مشکل عمل نہیں ہے، کمال تو یہ ہے کہ نہ صرف روح ڈالتے ہیں بلکہ ساکت مجسمہ کو بولنے پر مجبور کر دیتے ہیں، آپ کی کہانیوں کا کینوس بہت وسیع ہے جو بیک وقت کئی چیزوں کو اپنے اندر سموئے ہوئے ہے، سیدھا صاف اسلوب، سلیس زبان و بیان چونکا دیتا ہے اور قاری اس میں محو ہو جاتا ہے جیسے کوئی الٹی سگریٹ بے خیالی میں ہونٹوں پر رکھ لے، تصنع اور تکلف میں لپٹی زبان اور لفاظی بگھار کر قاری اور کہانی کے بیچ کے تعلق کو بوجھل

نہیں کرتے ہیں یوں سمجھئے کسی نے سگریٹ کا کش لے کر سانس چھوڑی ہے اور دھواں اپنے حساب سے فضا میں تحلیل ہورہا ہے، طباعت اور کاغذ عمدہ و دیدہ زیب ہے، کتاب کا جاذب نظر سرورق ایک معمہ معلوم ہوتا ہے جسے دیکھ کر ذہن کے کینوس پر مختلف شکلیں بنتی اور بگڑتی رہتی ہیں۔

☆

کتاب کا نام : **شوق ہر رنگ**

مصنف : اسلم بدر مبصر: **ڈاکٹر حسن نظامی**

اشاعت : 2020ء، قیمت : 500روپئے

اسلم بدؔر ادبی دنیا میں ایک باصلاحیت، نبّاض اور منفرد غزل گو شاعر کی حیثیت سے جانے پہچانے جاتے ہیں۔ انہوں نے تقریباً نصف درجن سے زائد کتابیں مختلف اصنافِ سخن پر لکھ ڈالی ہیں۔ 'کن فیکون' ان کی دستاویزی کتاب ہے جو اردو ادب میں سرمائے کی حیثیت رکھتی ہے۔ حالانکہ یہ کتاب جتنی شہرت کے حامل تھی خاطر خواہ پذیرائی نہیں ہوئی۔ اسے بھی ناقدوں کے غیر منصفانہ رویّے کا شکار ہونا پڑا۔ ان کی دیگر کتابیں خواہ وہ شعری ہوں یا نثری بڑی محنت سے لکھی گئی ہیں۔ تخلیقی عمل میں ان کی جنونی کیفیت کا بڑا دخل رہا ہے۔ وہ ہر کام کو عبادت کی طرح کرتے ہیں۔ خود کو دنیا و مافیہا سے اس وقت تک بے خبر کر لیتے ہیں جب تک کہ آغاز کیا ہوا کام اپنے انجام تک نہ پہنچ جائے۔ ٹھیک اسی طرح کی کیفیت سے دو چار ہونے کے بعد زیر نظر شعری مجموعہ ''شوق ہر رنگ'' منصۂ شہود پر آیا ہے۔ جس کا اجراء ۴؍دسمبر ۲۰۲۱ء کو کریم سٹی کالج جمشید پور کے وسیع و عریض ہال میں سعودی عرب کی ادبی تنظیم کاوش کے زیر اہتمام عمل میں آیا۔ اس مجموعے میں بھرپور شعری غنائیت اور عصری حسیت موجود ہے۔ نادر استعاروں کی جلوہ گری ہے، بولتا ہوا شعری آہنگ مقناطیسی قوت رکھتا ہے۔ اس کے علاوہ نئی زمین نئی ردیف کا شعوری انتخاب اسلم بدر کو دیگر شعراء میں ممتاز کر رہا ہے۔ واقعات و سانحات، عشق و محبت، اثبات و نفی، فطرت و جبلت، تخلیقِ کائنات، وجہِ تخلیقِ کائنات، خالقِ کائنات ان کی غزل کے رگ و پے میں سمائے ہوئے ہیں۔ تخیلات کا ایک تسلسل ہے جس کے حصار سے قاری باہر نکلنے میں عافیت محسوس نہیں کرتا اور اس کی لطافت سے حظ اٹھانا اپنی خوش بختی سمجھتا ہے۔ ان کی شاعری ایک کھوج ہے۔ ایسی کھوج جہاں متلاشی تجسس کی چاہ میں ایک سفرِ ناتمام پر نکل پڑتا ہے جہاں کامرانی کے ہزاروں دریچے وا ہوتے نظر آتے ہیں۔ اس لئے ان کی شاعری میں روحانی لذّت محسوس کی جاتی ہے۔ دراصل ان کی شاعری تصوف سے لبریز امکان کی شاعری ہے۔ ان کے یہاں

سائنسی اور جغرافیائی تصدق پورے وثوق کے ساتھ جلوہ گر ہے۔اخلاقی ،سماجی ،معاشرتی احساسات ،مشاہدے کی حد تک ہے۔عشقیہ رنگ آگے بڑھ کر تصوف کے رنگ میں رنگ جاتا ہے۔قاری کو یہ امتیاز کرنا مشکل ہوتا ہے کہ ان کے کس شعر کو رومان پرور اور کس کو تصوف سے آگاہ کرے۔ان کے بیشتر اشعار قرآن حکیم کی ہدایات اور احادیث کے روشن خیالات سے استفادہ شدہ ہیں۔اسلامی تاریخی پس منظر کے حوالات بھی جگہ جگہ موجود ہیں۔ان کے یہاں لطیف اشاروں سے شعر گڑھنے کا عمل بار ہا دیکھا جا سکتا ہے۔تتلی جیسی سوچ ان کی پاکیزہ ذہنی کو اجاگر کرتی ہے۔ذہن حقیر سے حقیر شئے کو بھی دامنِ شعر میں سمیٹنے کا مشتاق رہتا ہے۔معمولی لفظ سے غیر معمولی شعر پیدا کرنے کا ہنر ان کے یہاں موجود ہے۔اسلم بدر کے کشکولِ فکر سے نکلنے والا شعر اپنے اندر جاذبیت اور بھر پور جامعیت رکھتا ہے۔

ایک دھنک سا شعر دھند لکے سے نکلا
تتلی جیسی سوچ کو چھونے سے نکلا

دھیان آئینہ مرا، شعر ہیں صورت میری
لفظ کو زعم کہ 'احساس کا پیکر ہوں میں'

اسلم بدر کی شاعری میں مشاہدات کی زبردست جلوہ گری ہے۔وہ فرماتے ہیں کہ حالات کے شکنجے سے باہر نکلنے کی جب کوئی امید نظر نہیں آتی تو یہ شکستہ دل پھر اسی کیفیت سے مانوس ہو جاتا ہے لیکن تغیر پذیری چونکہ کائنات کی فطرت ہے اس لئے پازیبِ زندانی سے پاؤں پھر باہر نکل آتا ہے۔

بہت جھنکار سے مانوس ہوتا جا رہا تھا دل
مگر اب پاؤں سے پازیب زندانی نکلتی ہے

زندگی کے نشیب و فراز،عروج و زوال سے دو چار ہونا فطری عمل ہے۔ہمیشہ یکساں رُت قائم نہیں رہتی۔تمام قدریں زوال پذیر ہیں۔کسی کی موجودگی ،عدم موجودگی سے زمانے کو کچھ فرق نہیں پڑتا بلکہ حسبِ معمول سارے کام جوں کا توں ہوتے رہتے ہیں۔بچوں کے بڑے ہوتے ہی بزرگوں کی خود سری ختم ہو جاتی ہے وہ خود کو بے بس اور تابع سمجھنے لگتے ہیں۔ان کی شعلہ بیانیاں معدوم پڑ جاتی ہیں۔ان کا ماضی، حال کے ہاتھوں شکست خوردہ معلوم پڑتا ہے۔ان خیالات کی ترجمانی کرتے ہوئے اسلم بدر کے اشعار ملاحظہ فرمائیں۔

دشت چھان کر لوٹے جب بھی اپنے آنگن میں

پھول بھی کھلے دیکھے پیڑ بھی ہرا پایا
پھر کیا ہوا کہ چھن گئیں شعلہ بیانیاں
بوڑھے شجر چنار کے زردائے تو بہت

اسی قبیل کا ایک سچا شعر جو درد کا سیلاب سمیٹے ہوئے ہے۔ ملاحظہ فرمائیں۔

میرے بچے مرا سہارا ہیں
ہیں وہی اب ترا سہارا، گھر

شاعر یہاں اپنی محکوم زندگی کا المیہ پیش کر رہا ہے کہ ایک وقت آتا ہے جب قویٰ کام نہیں کرتے تب وارثین ہی گھر کے مالک و مختار ہو جاتے ہیں۔ گھر کی ذمہ داریوں سے سبکدوشی حاصل ہو جاتی ہے اور بچوں کی حکمرانی غالب آ جاتی ہے۔ یہ گھر جواب مالکانہ شفقت سے محروم ہو رہا ہے اپنے مالک کی طرف متوجہ کا طلبگار ہے لیکن صاحبِ مکان کے پاس اپنے بچوں کی طرف اشارہ کرنے کے سوا کوئی چارہ نہیں دکھتا۔ ہائے رے بے بسی انسان کی

معاشرے میں بے حسی اس درجہ قائم ہے کہ کوئی کسی کی جانب جھانکتا بھی نہیں۔ سب اپنے اپنے طور پر زندہ ہیں اور یہی وجہ ہے کہ مثبت قدریں پامال ہو رہی ہیں۔ کوئی کسی کی مدد کو نہیں آتا۔ یہی بے حسی شر پسندوں کو ماب لنچنگ میں مددگار ثابت ہو رہی ہے۔ جدید ترین دنیا میں جدید طرز زندگی کا غلبہ ہے۔ اب تو فلیٹ نما زندگی میں گھر سے متصل پڑوس کے بارے میں بھی معلومات نہیں ہوتی۔ شاعر اس طرح کی بے حسی سے باہر نکلنے کی استدعا کرتا ہے۔

کچھ شور ہو گلی میں تو باہر نکل پڑیں
اتنا ہی کر سکیں مرے ہمسائے ، تو بہت

گماں اور یقیں دونوں کا رشتہ بڑا ہی مربوط و مبسوط ہے۔ ایک دوسرے کے بغیر دونوں ادھورے ہیں۔ 'نہیں' ہے تو ہی 'ہاں' کا تصور کیا جا سکتا ہے۔ تاریکی ہی، تابناکی، کی بنیاد ہے۔ دکھ کے بعد ہی سکھ کی لذت آشنائی ممکن ہے۔ اس تصور کو جناب اسلم بدرؔ نے بڑی فنی چابکدستی سے پیش کیا ہے۔

خار سے گل کا ہے اک معکوس رشتہ
ہر نہیں کی شاخ پر اگتا ہے ہاں بھی

خدا کی صناعی ہر شئے میں موجود ہے خواہ وہ حیوانات ہوں، جمادات ہوں، نباتات ہوں یا کائنات کی کوئی بھی شئے ہو۔خشک وتر کی زندگی اور سانسوں کی دھڑکن خدا کی کاریگری ہی نمونے ہیں۔سمندر میں گھر سازی اور سیپوں کا اس عمل میں سرگرداں رہنا کتنا ششدر کرنے والا ہے۔

ہر سمندر میں گھر سازی تری ہے
کام تیرا کر رہی ہیں سیپیاں بھی

اللہ کی نشانیاں ہر طرف بکھری ہوئی ہیں۔ ہر شئے خوبیوں سے مزین و آراستہ ہے۔ یہ خوبیاں ان کی اپنی نہیں ہیں بلکہ خدا کی عطا کردہ ہیں۔سورج اللہ کی نشانیوں میں سے ایک ہے۔وہ پوری کائنات کو روشنی بخشتا ہے لیکن اس کی یہ روشنی تو خدا کی عطا کردہ ہے۔انسان اس بات کو بھول کر اس کی ظاہری ہیئت اور اس کی قوت وتوانائی کا پیروکار ہو جاتا ہے جبکہ اس کے پیچھے جو باطنی قوت ہے اس کی طرف سے وہ غافل ہے۔اسلم بدر نے اس حقیقت کی طرف اس طرح اشارہ کیا ہے۔

اجالا ہر طرف پھیلا ہوا ہے
تو کیا یہ مان لیں سورج خدا ہے ؟

یہاں اسلم بدؔر کا مخاطبہ جارحانہ ہے۔حق بیانی پر وہ مصالحت کے لئے تیار نہیں ہوتے بلکہ آستین کھینچ کر کھڑے ہو جاتے ہیں۔ان کی شاعری میں استعارات وتشبیہات کی نادرہ کاری کے باوجود اللہ کی وحدانیت کا اعتراف موجود ہے اور وہ برجستہ کلام کرنے کی قوت رکھتے ہیں۔اسی برجستگی کی ایک بہترین مثال آمر صدیقی کے اس شعر میں بھی دیکھا جا سکتا ہے۔

بلند تر سہی بام عروجِ عصرِ رواں
تو کیا یہ مان لیا جائے کچھ نہیں ہے فلک

(آمر صدیقی)

ممتاز شاعر صدیق مجیبی کا ایک مقبول ترین شعر ہے۔

اپنا سر کاٹ کے نیزے پہ اٹھائے رکھا
صرف یہ ضد کہ مرا سر ہے تو اونچا ہوگا

اسی لب ولہجے کا ایک شعر اس مجموعے میں بھی شامل ہے جس میں اسلم بدر نے دستار کو نیزے پر اٹھائے

رکھنے کی بات کی ہے۔ یہاں دستار پوری تہذیب کی علامت ہے۔ دستار نہیں تو سر کا کٹنا لازمی ہے۔ شعر ملاحظہ کیجئے۔

اٹھائے رکھتے ہیں دستار اپنی، نیزے پر
کہ ہم بھی اپنے سلیقے سے مرنے والے ہیں

یہاں تقابلی جائزہ مقصود نہیں ہے بلکہ اس امر کو واضح کرنا ہے کہ ذہنی مواصلت کے باوجود دونوں شعرا اپنی جگہ انفرادیت کے حامل ہیں۔

اسلم بدر حیات و کائنات کی پُراسراریت کو تجسس نگاہوں سے دیکھنے کے خواہاں ہیں۔ ان کا تخلیقی تجسس ایسے حیرت انگیز موضوعاتِ سخن کو جنم دیتے ہیں جہاں ہماری فکر کی رسائی ممکن نہیں۔ ان کی تشبیہاتی قوتِ متخیلہ کو مستحکم کرنے کے لئے ان کے چند اشعار پیش کئے جاتے ہیں۔

انگلیاں بند شب ٹٹولتی ہیں
پیرہن خواب ہے، بدن ہے خواب

غبار رہگذر چادر ہے میری
جہاں گر جاؤں تھک کر ، گھر ہے میرا

سوچ ! کیوں اس قدر ہے سناٹا
دیکھ ! دانے پہ جال سا کیوں ہے

ایک روندا ہوا بستر ہے زمیں
ایک تکیہ ہے سرہانے کب سے

بند ہوجائیں نہ دل کے راستے
خون میں ہیجان اتنا بھی نہ ہو

شاخوں پہ دھوپ بیٹھی تھی منقار زیر پر
منڈلا رہی ہے شام تو بن بولنے لگا

دم بدم شورِ دمادم پہ تھرکتے ہوئے پاؤں
اور مچاتے ہوئے دھمال ، قلندر بادل

224 صفحات پر مشتمل زیر نظر شعری مجموعہ ''شوق ہر رنگ'' نہایت ہی خوش اسلوبی کے ساتھ اسلم بدر صاحب کے صاحبزادے اقبال اسلم نے قارئین کے حوالے کیا ہے وہ اس کتاب کے مرتب ہیں۔ یہ کتاب کثیر رنگوں سے مزین و آراستہ ہے۔ ورق پلاسٹک کوٹیڈ اور نہایت ہی نفیس ہے۔ اس کی ایک خاص بات یہ ہے کہ ہر غزل کا ایک نمائندہ شعر سرخ رنگ سے نمایاں طور پر جلوہ گر ہے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اس شعر کی مناسبت سے غزل کی پیشانی پر ایک خوبصورت مصوری کی گئی ہے جو پورے شعر کے مفہوم کی وضاحت کر رہی ہے۔ پوری کتاب نہایت ہی دیدہ زیب اور پرکشش ہے۔ کتاب کی پشت پر اسلم بدر صاحب کی بولتی ہوئی تصویر ہے جو 'شوق' کو ہر رنگ میں پیش کرتی نظر آ رہی ہے۔

مکتوبات

(عالمی فلک کے پانچویں شمارے کو دیکھ کر)

'فلک عالمی' لائے احمد نثار
شگفتہ ادب کا جو ہے لالہ زار

ہیں وہ ماہ و انجم کی تابانیاں
زمیں پر اتر آئی ہے کہکشاں

جو قائم کتابی کیا سلسلہ
مرقع ہے یہ اعلیٰ تخلیق کا

ہے تخلیق ایسی ہر اک مرحبا
کہ پیغام جیسے ہو محبوب کا

نفاست، لطافت کا دفتر ہے یہ
کہ لفظوں و معانی کا گوہر ہے یہ

عظیم اہلِ فن ہی کی تخلیق سے
کتاب ایسی آراستہ کر گئے

دکھائی ہیں ایسی ہنر مندیاں
کہ ہیں علم و دانش کی رعنائیاں

یہ اردو کی بے شک ہے خدمت بڑی
مدیر و مدیرہ کی محنت بڑی

سبھی اعلیٰ فنکار آتے نظر
یہ ہے بزمِ قد آوراں سربسر

شمارہ مجھے پانچواں جو ملا
تو بے ساختہ شعر ہونے لگا

مبارک یہ کاوش ہو احمد نثار
لٹاتے رہیں گوہرِ آبدار

پروفیسر طرزی

محترم آداب

آپ اپنے رسالے کا ہر شمارہ مجھے عنایت کرتے ہیں مگر میں اس قدر نالائق ہوں کہ آپ کو کبھی رسید نہیں بھیجتا۔ کیا معذرت سے کام چل سکتا ہے؟ تازہ شمارہ نمبر ۵ بہت خوبصورت اور کارآمد ہے۔ اگر صاحب گوشہ کی کوئی تخلیق بھی شامل ہوتی تو بہت اچھا تھا۔ حقانی اور ڈاکٹر سرور حسین کے مضامین خوب ہیں۔ فکشن اور منظومات کے بعد ''اور زبانوں کا ادب'' بہت شاندار ہے۔ اس حصے پر اور محنت اور وسعت کی ضرورت ہے۔

تبصرے بھرپور اور معلوماتی ہیں، کل ملا کر پرچہ اپنے نام کی طرح کارآمد ہے۔ اتنے اچھے انتخاب کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

مرغوب علی

محترم احمد نثار صاحب ! سلام و نیاز

خدا کرے آپ بخیر ہوں۔ ایسے حالات میں جب رسائل بند ہو رہے ہیں۔ عالمی فلک کی اجراء خوش کن خبر کی طرح ہے۔ ۵واں شمارہ میرے رو برو ہے۔ جو افتخار عارف کے حمد یہ کلام سے شروع ہوتا ہے۔ افتخار عارف ایسی خوبصورت اور نورانی حمد کہتے ہیں جی خوش ہو گیا۔ ڈاکٹر ثروت خان پہ گوشہ باوقار اور بھرپور ہے کہ لکھنے والوں میں انتہائی معتبر نام شامل ہیں نثار عالم فاروقی، رتن سنگھ، عتیق اللہ، علی احمد فاطمی، غضنفر، انور پاشا، پیغام آفاقی، مولا بخش جیسے قلم کاروں نے ثروت خان کی شخصیت اور ان کی تخلیقات کی تفہیم میں ذکر کیا ہے۔ ظفر اقبال ظفر خوش نصیب ہیں کہ حقانی القاسمی جیسے بڑے نقاد نے ان کی شاعری پر جم کر لکھا ہے۔ صابر علی سیوانی نے حقیقی ادب بہت جانفشانی سے تحریر کیا ہے لہٰذا مضمون معلوماتی اور افادیت سے بھرپور ہے۔ نظموں اور غزلوں کے انتخاب میں آپ کا ادبی تجربہ جھلکتا ہے۔

عالم خورشید کے اس شعر نے دل کھینچ لیا۔

عبث اداس ہیں تعبیر کے تعاقب میں
ملی ہیں آنکھیں ہمیں خواب دیکھنے کے لئے

فکشن کو میں آرام سے دیکھوں گا۔ لیکن بڑے فکشن نگاروں کی شمولیت اس کے معیار کی گواہی دیتی ہیں۔ اکبرالہٰ آبادی پر اسیم کاویانی کا مضمون تحقیق کے نئے در وا کرتی۔

شموئل احمد سینئیر فکشن نگار ہیں۔ انہیں حق ہے کہ اپنی بیلاگ رائے دیں۔ جو انہوں نے کیا اور آپ نے مدیرانہ ایمان داری کا ثبوت فراہم کرتے ہوئے ان کے خط کو اولیت دی۔ یہ فراخ دلی دل کو چھوگئی۔ والسلام

راشد جمال فاروقی

عالمی فلک کے کتابی سلسلہ ۵ پر نگاہ پڑی تو پتلیاں کچھ دیر تک سرورق پر جمی رہ گئیں گوشہ ثروت خان نے میرے ذہن میں شمارے کا وہ اشتہار ابھار دیا جسے کچھ روز قبل آپ نے فیس بک پر پیش کیا تھا اور جس میں ثروت پر تحریر کردہ میرے خاکے کا عنوان بدل گیا تھا جسے دیکھ کر میں خاصا برہم بھی ہوا تھا کہ اس بدلے ہوئے عنوان میں وہ جھلک نہیں دکھائی دے رہی تھی جو دکھائی دینی چاہئے تھی۔ مگر میری برہمی کے شعلے کو آپ کی نرم گفتاری اور خاکساری نے یک لخت بجھا دیا تھا۔ تھوڑی دیر کے بعد آپ نے یہ بھی اطلاع دی کہ رسالے کے اندر متن میں اصل عنوان

جیوں کا تیوں موجود ہے۔اس اطلاع نے آپ کی جو امیج ابھاری اس لئے نہ صرف یہ کہ میرے غصے کو پوری طرح ٹھنڈا کر دیا میرے ذہن میں اک معقول اور اچھے انسان کی شبیہ بھی ابھار دی۔

سرورق الٹا تو گوشے کی فہرشت سامنے آ گہی بہت سارے معتبر اور اہم نام دیکھ کر اندازہ ہوا کہ گوشۂ ثروت میں قلب ونظر کو عافیت ضرور ملے گی۔ کچھ تحریروں سے تو پہلے بھی میری آنکھوں کو ٹھنڈک پہنچ چکی تھی البتہ اس باران کے خالقوں کے ناموں کو دیکھ کر آنکھیں گیلی بھی ہوگئیں۔رتن سنگھ، پیغام آفاقی اور مولا بخش تینوں کو جنت کی چھاؤں میں ٹھنڈک عطا کرے۔آمین !

مضامین کے گوشے پر نظر پڑی تو صابر علی سیوانی کے مضمون کے عنوان ''حقیقی ادب اور ادب کا حقیقی منظر نامہ'' نے چونکایا اور مجبور کیا کہ پہلے ذرا دیکھ لوں کہ اس نوجوان کی نگاہ میں حقیقی ادب کا کیا تصور ہے اور اس کے سامنے ادب کا حقیقی منظر نامہ کیسا ہے؟

مضمون شروع کیا تو آگے بڑھتا چلا گیا۔صابر نے کافی تفصیل سے اپنے موضوع کا جائزہ لیا ہے اور نہایت دل جمعی سے تقریباً تمام پہلوؤں کا احاطہ کرنے کی معروضی کوشش کی ہے۔ان کی کچھ باتوں سے اختلاف کیا جاسکتا ہے اور بعض لفظون کے املا پر بحث کی گنجائش ہے مگر ایک بات کی داد دی جانی چاہئے کہ انہوں نے بڑی دلیری اور بے باکی سے بعض حقائق کو طشت از بام کیا ہے۔

حقانی صاحب کا مضمون بھی اچھا لگا۔وہ جس پر لکھتے ہیں اسے قابلِ توجہ بنا دیتے ہیں اور قاری کی دلچسپی فن کار اور اس کے فن میں بڑھا دیتے ہیں یہی ایک اچھی تنقید کا کمال اور ایک اچھے نقاد کا فریضہ بھی ہے۔ان کے یہاں تنقید میں بھی تخلیق کی چاشنی ملتی ہے۔جمالیاتی تنقید شاید ایسی ہی تنقید کو کہا جاتا ہے۔

باقی حصہ ابھی پڑھ نہیں پایا ہوں مگر اندازہ ہے کہ ان میں سے بیشتر نگارشات معیاری ثابت ہوں گی۔

ثروت خان کو مبارک باد کہ ان پر اتنا اچھا گوشہ ترتیب دیا گیا اور احمد نثار کو داد کہ انہوں نے اس گوشے کے چراغ سے ثروت خان کے فکر وفن کے مختلف گوشوں کو روشن کیا۔مدیر کو اس بات کی بھی داد کہ اچھے لکھنے والوں کو اپنے فلک پر جمع کیا جن سے ادبی ستاروں کی ایک کہکشاں سج گئی ہے۔

ستاروں کو بھی مبارک باد اور نیک خواہشات۔

غضنفر

جناب احمد نثار صاحب السلام علیکم !

عالمی فلک ۵؍گوشۂ ڈاکٹر ثروت خان اور دیگر مشمولات پر مشتمل شارہ بہت بھر پور ہے۔ عالمی فلک کا ایک تہائی حصہ ''ثروت مند'' ہے اس طرح کے گوشے کے خواہش مند اگر عالمی فلک سے رجوع کریں تو یہ اردو ادب کی بڑی خدمت ہوگی۔ اس میں ثروت خان صاحبہ کا توقیت نامہ بھی ہوتا تو تعارف بہتر ہو جاتا۔

محترم حقانی القاسمی صاحب نے ظفر اقبال ظفر کے صحرا سمندر اور سراب کے حوالے سے بڑا جامع مضمون لکھا ہے اور انہیں ظفریاب قرار دیا، ''حقیقی ادب اور ادب کا حقیقی منظر نامہ'' میں جناب صابر علی سیوانی نے فکر و فن کا گوشہ تشنہ نہیں چھوڑا۔ اردو شعر و ادب، محفل و رسائل و جرائد اردو اکاڈمیاں، کتابوں کی اشاعت اور ان پر انعامات سب کا خوب جائزہ لیا ہے۔ انہوں نے کئی مشاہیر ادیبوں کے خیالات بھی Quote کر کے اپنی بات کی ہے۔ نعمان وحید بخاری کے حوالے سے لکھا گیا ہے کہ'' گذشتہ نصف صدی سے کوئی نئی اصطلاح اردو زبان کا حصہ نہیں بنی''۔ اس سلسلے میں صرف اپنی ایک مثال پیش کرنا چاہتا ہوں۔......

مغرب میں لاعلاج مریضوں کو دواخانے سے نکال کر ایک ایسے مقام پر رکھا جاتا ہے جہاں صرف Painkiller دوائیں دے کر لمحہ لمحہ مرتے ہوئے مریض کو راحت پہنچانے کا ناٹک کیا جاتا ہے۔ اس مقام کو Hospice کہا جاتا ہے۔ اس ہاس پس کے لئے میں نے ایک نیا لفظ ڈھالا (Coin) کیا ہے مرزخ بروزن برزخ رالف رسل کو ستمبر ۲۰۰۸ء سے ان کے مرنے تک ایسے ہی Hospice یعنی مرزخ میں رکھا گیا تھا۔''

(ملاحظہ ہونا چیز رؤف خیر کی کتاب۔ حق گوئی و بے باکی۔ ایجوکیشنل بلشنگ ہاؤس نئی دہلی مطبوعہ ۲۰۱۳)

صابر علی سیوانی صاحب نے اردو میں مروج بعض غلط الفاظ کی نشاندہی بھی کی ہے۔ انہوں نے رسم اجرائی، کم سوادی، تقرری جیسے الفاظ پر توجہ بھی دی ہوتی تو بہتر ہوتا۔ رسم اجراء کم سواد تقرر کہنا ہی کافی ہے۔

ڈاکٹر عبدالمتین (دھنباد) کا ''اردو میں مقالہ نگار کے اصول'' بہت رہنمایانہ ہے۔ سیمیں کرن کا پاگل خانے کے دستور بہت اچھا افسانہ ہے جو حقیقت سے بہت قریب ہے۔ جناب حافظ کرناٹکی کی رباعیات دلچسپ ہیں۔ پروفیسر طرزی تو ماشاءاللہ ہر فن مولا ہیں۔ ان کی غزلیں بھی خوب ہیں۔ میری غزلیں شائع فرمانے کا شکریہ۔ تسلیم نیازی بھی خوب کہتے ہیں۔ اللہ مغفرت کرے۔ لطیف ساجد کی غزلیں تو شمارے کی جان ہیں۔ خلیل جبران کی

زندگی پر مشتمل ان کہی داستان رینو بہل نے خوب ترجمہ کیا ہے۔ خالد عبادی کے شعری مجموعے ''نہایت پر جناب اظہار خضر نے نہایت ہی بے باکانہ تبصرہ کیا ہے۔اظہار خضر کی بات نہایت مدلل اور سمجھ میں آنے والی ہے جب کہ عبادی کے اشعار سمجھنے میں دشواری ہوتی ہے۔آج اردو ادب کا جو حال ہے اس کے پیش نظر سیدھی سیدھی بات کہنے کی ضرورت ہے۔ادب پر شب خون مارنے کا زمانہ چلا گیا۔

شموئل احمد نے خود کو خاکسار لکھتے ہوئے خط میں لکھا کہ سب سے گھٹیا مضمون ابوالمجاہد زاہد پر احمد سجاد کا ہے۔''ابوالمجاہد زاہد نے شعر و ادب کے لئے زندگی وقف کر دی تھی۔ڈاکٹر احمد سجاد ایک ذمہ دار نقاد ہیں۔ان پر کوئی تنقید حیران کن ہے۔اس سے پہلے کے ایک شمارے میں جناب اسیم کاویانی صاحب نے بھی لکھا تھا کہ اگر کوئی شخص کہے میں خدا کو نہیں مانتا تو یہ اس کا ذاتی عمل ہے اس کا کسی اور سے لینا دینا......'' میں نے اپنے مضمون میں آنجہانی رشید حسن خاں میں لکھا تھا کہ رشید حسن خاں اگر اللہ تعالیٰ کو نہیں مانتے ہیں تو اس کا تقریباً ہر خط میں یہ اصرار ذکر کرنا کیا ضروری ہے۔مسلمانوں جیسا نام رکھنے والا اگر اپنے خالق کو نہ مانے تو آئینہ دکھانا پڑتا ہے۔جیسے اگر کوئی شاعر بے وزن و بے بحر شعر کہے گا تو اس کو توجہ دلانا پڑے گا ہی اب یہ تو نہیں کہا جا سکتا کہ بے بحر شاعری اس کا ذاتی عمل ہے۔چلئے رشید حسن خاں کی خدا بیزاری کو اگر کچھ لوگ نظر انداز کرنے ہی پر قائل ہیں تو رہا کریں۔میں نے اپنے مضمون میں رشید حسن خاں کی زبان و بیان کی بعض غلطیاں بھی دکھائی ہیں کسی اللہ کے بندے نے ان کے دفاع میں ان کی طرف سے فرض کفایہ ادا کرنے کی ہمت ہی نہیں کی۔میرا مذکورہ مضمون ایسے لوگوں کے لئے آج بھی ایک چیلنج ہے۔انہیں چاہئے کہ وہ ایک بار اور میرا مضمون پڑھ لیں اور ٹھنڈے دل سے غور کریں۔رشید حسن خاں ادبی، تنقیدی و تدوینی خدمات اپنی جگہ مگر کوتاہیاں اپنی جگہ۔

ڈاکٹر رؤف خیر

برادر محترم احمد نثار صاحب سلام و اکرام

عالمی فلک بابت اکتوبر تا دسمبر ۲۰۲۱ء باصرہ نواز ہوا گوشۂ ڈاکٹر ثروت خان بہت خوب اور انتہائی جامع ہے۔افتخار عارف کی حمد کا کیا کہنا، مضامین میں تنوع کا خیال رکھا گیا ہے۔فکشن میں سیمیں کرن، سرور غزالی اور ڈاکٹر اختر آزاد ایسے نام ہیں جن کے معیار کی توثیق نہیں ہوتی۔نظموں کا حال بھی کم و بیش ویسا ہی ہے۔غزلوں میں تسلیم نیازی، خورشید اکبر اور عالم خورشید کی موجودگی سے طمانیت محسوس ہوئی۔لطیف ساجد (پاکستان) کی غزلیں بھی اچھی ہیں۔اداریہ میں آپ نے جس منظر نامے کی عکاسی اور اس تعلق سے اپنے درد دلی کا اظہار کیا ہے خدا کرے اس کے

ازانے کی جلد ہی کوئی صورت پیدا ہو جائے۔

خالد عبادی

محترم احمد نثار صاحب

سلام مسنون!

عالمی فلک کا کتابی سلسلہ نمبر ۵ کئی دنوں قبل ہی موصول ہو گیا تھا۔ ۳۲۰ صفحات پر مشتمل اس معیاری، ضخیم اور خالص ادبی رسالے کی سنجیدہ قرأت میں وقت لگ ہی جاتا ہے۔ عالمی فلک اب اپنی پانچویں منزل پر پہنچ کر ادب کے سنجیدہ قارئین کے دلوں میں اپنی مستقل جگہ بنا چکا ہے، جس کے لئے سارا کریڈٹ یقینی طور پر آپ کی بے تکان محنت اور لگن کو جاتا ہے۔ مالی خسارہ ایک طرف، میں سمجھتا ہوں رسالے کی ترتیب اور انتخاب میں کسی اچھے تخلیق کار کا بہت سارا وقت لگ جانا بھی اس کا تخلیقی نقصان ہی ہے۔ خیر، مجھے لگتا ہے کہ آپ کا نام اردو کے ادبی رسائل کی تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائیگا، اللہ آپ کے حوصلوں کو استقامت عطا فرمائے، آمین۔

اس بار آپ نے اداریہ میں ایک اہم موضوع کی طرف اشارہ کیا ہے وہ یہ کہ بہار اور جھارکھنڈ میں اردو کو دوسری سرکاری زبان کا درجہ حاصل ہونے کے باوجود عملی طور پر اردو زبان محض کاغذ پر ہی محدود ہے۔ واقعی یہ ایک تشویشناک بات ہے، اردو زبان کی خدمت کا دم بھرنے والوں کو چاہئے کہ وہ اس زبان کی ترقی اور فلاح و بہبود کے لئے عملی اقدام کریں۔ آپ کی اس بات سے کون متفق نہ ہوگا کہ اردو ملک میں بے شمار لوگوں کی مادری زبان ہے۔ اردو ہی فراق، پریم چند، چکبست، رتن ناتھ سرشار، جگن ناتھ آزاد وغیرہ کی مادری زبان رہی ہے۔ مگر آج کتنے فی صد غیر مسلموں کی مادری زبان اردو ہے؟۔ اس کا جواب شاید نفی میں ہی آئے گا لہٰذا ہمیں تسلیم کر لینا چاہئے کہ اردو دشمن عناصر اپنے ارادوں میں کامیاب ہو چکے۔ اب اردو زبان کو بچانے کی ذمہ داری ہماری ہے۔ ہمیں اب نام نہاد اردو اکادمیوں اور اردو کے دیگر سرکاری اداروں کی طرف حسرت سے دیکھنے کی بجائے اپنے بچوں کو گھر پر ہی سہی، عربی کے ساتھ اردو تعلیم کا بھی نظم کرنا چاہئے۔

افتخار عارف کی حمد اور عزیز بلگامی کی نعت کے بعد تقریباً ایک صد صفحات پر مشتمل ثروت خان کی شخصیت اور فن پر ایک تفصیلی گوشہ شامل ہے جو یقینی طور پر توجہ اور دلچسپی سے پڑھے جانے لائق ہے۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی کے ذریعہ لئے گئے انٹرویو میں ثروت خان نے سوالات کے تفصیلی جوابات دیے ہیں۔ انٹرویو کی تاریخ کہیں درج نہیں ہے مگر ایک سوال کے جواب میں انہوں نے یہ ضرور کہا ہے کہ ان کا ادبی سفر ۱۹۹۹ سے شروع ہوا ہے۔ یعنی

محض ۲۲ برس کے ادبی سفر میں ہی ان پر اتنا وقیع گوشہ شائع ہونا اعزاز کی بات ہے، جس کے لئے ثروت خان قابلِ مبارک باد ہیں۔ انٹرویو میں ایک سوال کے جواب میں ان کی اس بات سے اختلاف کی گنجائش نکلتی ہے کہ دورِ حاضر کا تخلیق کار کسی ازم کو لے کر نہیں چل رہا۔ رتن سنگھ نے ثروت خان کی کہانی میں بڑی خوبصورت بات لکھی ہے کہ جب تک عدم مساوات کی وجہ سے پیدا ہونے والا اندھیرا مٹ نہیں جاتا، ثروت خان کا قلم، خوبصورت سے خوبصورت افسانوں کی شکل میں شمعیں جلاتا رہے گا۔ عتیق اللہ نے اپنے فکر انگیز مضمون میں ثروت خان کی تنقیدی صلاحیتوں کا نہایت باریک بینی سے جائزہ لیا ہے۔ تانیثیت کے حوالے سے ان کے موقف کو بیان کرتے ہوئے مضمون نگار نے لکھا ہے کہ ''ثروت خان کا سارا درد ہی یہ ہے کہ عورت کو ایک انسانی ہستی کے بجائے حیوانوں کی طرح دوسری جنس میں شمار کیا جاتا ہے۔ ڈاکٹر علی احمد فاطمی کے مطابق بلاشبہ ثروت خان اکیسویں صدی کی افسانہ نگار ہیں۔ یہ بات ان کے افسانوں کی روح، ان کی فضا، ان کی افہام و تفہیم سے صاف واضح ہے جہاں انسان، عورت اور مرد کے دائروں میں بھی قید ہے۔ غضنفر کے لفظوں میں اس کی شخصیت کے اس جوہر نے وہ وہ پڑھوایا جو عام طور پر عورتیں نہیں پڑھتیں اور وہ کچھ لکھوایا جسے لکھتے وقت مردوں کے بھی ہاتھ کپکپا اٹھتے ہیں۔

پیغام آفاقی نے ثروت خان کی کہانی لوک عدالت پر گفتگو کرتے ہوئے لکھا ہے کہ کچھ لوگ ادب کے بوڑھے، ناکارہ، مصلحت پسند اور مفاد پرست نقادوں کی زبان میں مجھ سے پوچھ سکتے ہیں کہ اس کہانی کا افسانے کے فن سے کیا تعلق ہے؟ تو میں صرف یہ کہوں گا کہ اس پہلو کو لوک عدالت سے نکال دیجئے تو اس میں کچھ نہیں بچے گا۔ مولا بخش نے ڈاکٹر ثروتِ خان کے مقبول ناول ''اندھیرا پگ'' کا تجزیاتی مطالعہ کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ ناول پہلی بار اردو میں راجستھانی تہذیبی زندگی، سماجی ہمواریوں اور دقیانوسی اصولوں کی بھینٹ چڑھتے ہوئے، دبے کچلے مرد اور عورت کی المناک زندگی کے خلاف احتجاج کا فن کارانہ رویہ قاری کے ذہن میں پیدا کرتا ہے۔ ثروت خان بحیثیت ناقدہ اپنے مقالوں میں ایک برافروختہ عورت کے روپ میں ابھرتی ہیں لیکن اپنے افسانوں اور بالخصوص اس زیرِ بحث ناول میں انہوں نے انسانیت نواز تانیثیت کے اصولوں کو پیشِ نظر رکھا ہے۔ ڈاکٹر شہاب ظفر اعظمی کے مطابق ڈاکٹر ثروت خان کے شعور کی ایک سطح بہت نمایاں ہے اور ناول کی ہر سطر میں اپنے ہونے کا احساس دلاتی ہے۔ وہ سطح، عبارت ہے موجودہ انسانی معاشرے میں عورت کے وجود کی معنویت سے۔ اس کی تقدیر اور گرد و پیش کی دنیا میں اپنی شراکت سے۔ ''اندھیرا پگ'' کے حوالے سے تقریباً یہی خیال احمد صغیر کا بھی ہے، ان کے مطابق ثروت خان نے اس ناول کو راجستھان کے کلچر کو سامنے رکھ کر لکھا ہے اور سارا منظر

علاقائی نقطۂ نگاہ سے پیش کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

ظفر اقبال ظفر کی شاعری پر اظہارِ خیال کرتے ہوئے حقانی القاسمی نے ان کی شاعری میں استعمال کیے گئے کلیدی استعاروں کی معنویت کے حوالے سے بڑی عمدہ گفتگو کی ہے، ان کے مطابق ظفر اقبال ظفر کی شاعری کا فطرت سے بہت گہرا رشتہ ہے۔ظفر اقبال ظفر کی شاعری میں وہی انسانی جذبات واحساسات ہیں جن سے شب و روز ہر فردِ بشر گزرتا ہے ان کے الفاظ ان کے احساس سے مکمل طور پر ہم آہنگ نظر آتے ہیں اور شاعری میں بھی انہوں نے جن استعارات کا استعمال کیا ہے وہ آج کی زندگی سے مربوط ہیں۔

عالمی فلک کے زیرِ نظر شمارے میں صابر علی سیوانی کا ایک طویل مضمون بعنوان ''حقیقی ادب اور ادب کا حقیقی منظر نامہ'' کے عنوان سے شامل ہے جسے توجہ اور دلچسپی سے پڑھنے کی ضرورت ہے۔اس مضمون میں موجودہ عہد میں ادب کی حقیقی صورتِ حال اور ادیب کے سامنے درپیش مشکلات اور ادیبوں کے درمیان موجود حسد کو نہایت عمدگی سے پیش کیا گیا ہے۔انہوں نے یہ سوال بھی قائم کیا ہے کہ کیا اردو کے شاعر و ادیب صرف منفعت کے لئے ادب تخلیق کر رہے ہیں یا معاشرے میں صحیح اور فعال رول ادا کر رہے ہیں؟اس سوال کا جواب بھی انہوں نے خود ہی دیا ہے کہ ظاہر ہے ادیب و شاعر ایمانداری سے اپنا فریضہ ادا نہیں کر رہے ہیں۔ان کا یہ سوال اور جواب دونوں سے ہی اختلاف کی گنجائش موجود ہے۔ایک جگہ اور لکھتے ہیں کہ اب تو حالت یہ ہے کہ ادیبوں میں مسابقت کی جگہ حسد نے لے لی ہے۔ ہندی والے اصطلاحات سازی اور تراجم میں ہم سے آگے ہیں۔میرے نزدیک فاضل مضمون نگار کے سوالات اور خیالات پر تفصیلی گفتگو اور مذاکرے کی ضرورت ہے۔یہاں سوال پیدا ہوتا ہے کہ اگر آج کے ادیب و شاعر حسد کا شکار ہیں تو کیا پہلے یا میر و غالب کے زمانے کے شعرا اور ادبا میں باہم حسد موجود نہیں تھا، یا وہ اپنی معاشی ذمہ داری پوری ایمانداری سے انجام دے رہے تھے۔یہاں ایک بات اور عرض کرنی ہے کہ اردو کی موجودہ صورتِ حال کا موازنہ ہندی سے کرنا کہاں تک مناسب ہے، ایسے میں جب کہ ہندی سرکاری زبان ہے اور اسے حکومتِ وقت کی سرپرستی بھی حاصل ہے۔خیر، میری خواہش ہے کہ ان موضوعات پر اہلِ علم بے باکی سے اپنی آرا پیش کریں۔عبدالصمد کے ناول کشکول پر ڈاکٹر سرور حسین کا مضمون بے حد اہم ہے۔انہوں نے کشکول کا جائزہ لیتے ہوئے رقم کیا ہے کہ ناول کا بیانیہ سہل، عام فہم اور رواں ہے اور یہ ناول عصری سماجی و سیاسی زندگی کے پس منظر میں سماج کے ایک مخصوص طبقے کے حوالے سے کئی اہم اور نازک پہلوؤں کو زیرِ بحث لانے میں کامیاب ہے۔اردو میں مقالہ نگاری کے اصولوں پر گفتگو کرتے ہوئے ڈاکٹر عبدالمتین نے موجودہ عہد میں ادب

کے نئے قلم کاروں کی تربیت کرنے کا کام کیا ہے۔

فکشن کے باب میں عالمی فلک کے تازہ شمارے میں سب سے پہلا افسانہ سیمیں کرن کا افسانہ ''پاگل خانے کے دستور'' ہے۔ جس کا مرکزی کردار ایک عورت ہے، جس نے اپنی تعلیم یافتہ ماں پر اپنے کم پڑھے لکھے باپ کا ظلم اور تشدد دیکھا جس کے نتیجے میں اس کے اندر کی باغی عورت نے سر اٹھایا تو اس نے خود پر بھی اپنے دو چھوٹے بھائیوں اور باپ کا ظلم و تشدد دیکھا۔ اس کے عورت ہونے کے دکھ نے گھر کو ایک پاگل کھانے سے تعبیر کیا جہاں موجود مرد کو اس نے ایک ذہنی مریض اور پاگل قرار دیا۔ پھر اس کے باپ نے عمر میں اپنے سے ذرا سے کم، محلے کی مسجد کے امام عبدالمجید ے اس کی شادی کر دی، وہاں بھی اسے ظلم و تشدد ہی ملا۔ اسے لکھنے پڑھنے کا شوق تھا مگر اسے آزادی سے تعلیم حاصل کرنے کا موقع نہیں ملا، اس طرح اسے دوسرا پاگل خانہ ملا۔ ایک دن اپنے شوہر کی پٹائی سے بچنے کے لئے اس نے بھی ڈنڈا اٹھالیا، نتیجے میں اسے طلاق ملی۔ افسانے کے مرکزی کردار کی دوسری شادی جمشید نامی ایک شخص سے کر دی گئی اس طرح اسے ایک اور پاگل خانہ ملا۔ یہ افسانہ دراصل ایک ایسے معاشرتی نظام کی نشاندہی کرتا ہے، جہاں عورت کو برابری کا درجہ حاصل نہیں ہے، اسے محض پیر کی جوتی سمجھا جاتا ہے، اسے عورت پاگل خانے کے دستور سے تعبیر کرتی ہے اور اتنے پاگل خانوں کے سبب اسے پوری دنیا ہی ایک پاگل خانہ لگتی ہے اور اس کے نزدیک جس کا سب سے سنہری اصول غالباً یہی ہے کہ اتنے پاگلوں کا مقابلہ کرنے کے لئے عورت کو خود ہی پاگل ہونا پڑے گا۔

عالمی فلک میں شامل دوسرا افسانہ لومبارڈی ہے جو مغربی معاشرے کے تہذیبی اقدار اور سماجی رشتوں کو بیان کرتا ہے۔ سرور غزالی کا یہ افسانہ اٹلی کے ایک سیاحتی مقام لومبارڈی میں مقیم تھامس کی گلوکارہ کی پوتی قلوپطرہ کی کہانی ہے جو ہوان کے ایک میوزک کنسرٹ سے اتنی مشہور ہو جاتی ہے کہ وہ اپنے بوائے فرینڈ مائیکل سے کنارہ کشی اختیار کر کے ہوان کے ساتھ رہنے لگتی ہے مگر جب کورونا کی وبا اٹلی میں اپنے پاؤں پسارتی ہے تو ہوان اپنے ملک واپس چلا جاتا ہے اور پھر قلوپطرہ کا فون بھی نہیں اٹھاتا ہے۔ تھامس کورونا کی زد میں آ کر اسپتال میں داخل ہو جاتا ہے اور اس کا سابقہ بوائے فرینڈ کچھ دن کے لئے بچوں کو اپنے ساتھ لے جاتا ہے اور قلوپطرہ کو بھی ساتھ چلنے کے لئے کہتا ہے تو قلوپطرہ اپنے دادا کو جانکنی میں چھوڑ کر نہیں جاتی۔ مگر جب اس کے دادا کی موت واقع ہو جاتی ہے تو اس کی زندگی میں اداسی اور اندھیرا پھیل جاتا ہے۔ وہ اپنے دادا کا آخری دیدار بھی نہ کر سکی اور نہ ہی اس کی میت میں شامل ہو سکی۔ بظاہر کہانی میں کوئی غیر معمولی واقعہ نہیں کیونکہ مغربی معاشرے میں عورت اور مرد کے

درمیان رشتوں میں احترام اور استحکام کی گنجائش کم ہوتی ہے اور وہ اپنے ہم سفر حالات، وقت اور ضرورت کے لحاظ سے بدلتے رہتے ہیں۔اس کہانی میں سرور غزالی نے بیانئے کا جو لہجہ اختیار کیا ہے وہ سادہ اور متاثر کن ہے۔

دیگر افسانوں میں ڈاکٹر اختر آزاد کا افسانہ گھر کا چراغ اور ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی کا افسانہ سوراخ بھی توجہ اور دلچسپی سے پڑھے جانے کا متقاضی ہیں۔ڈاکٹر اختر آزاد موجودہ افسانوی ادب میں نمایاں مقام رکھتے ہیں۔

منظوم حصے میں ڈاکٹر شعیب نظام، کہکشاں تبسم، سید انجم رومان اور احمد نثار کی نظمیں موجودہ سیاسی اور سماجی صورتِ حال اور کرب کو رقم کرنے میں کامیاب ہیں۔غزل کے باب میں پروفیسر طرزی، ڈاکٹر رؤف خیر ،خورشید اکبر، عالم خورشید، لطیف ساجد اور قربان آتش کی شمولیت سے عالمی فلک کے وقار میں اضافہ ہوا ہے۔دیگر زبانوں کے ادب کی شمولیت کا سلسلہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس سے اردو کے قارئین تقابلی مطالعہ کرسکیں گے۔ رینو بہل کی ترجمہ شدہ ان کہی داستاں کی دوسری قسط بھی دلچسپ ہے۔مصری کہانی، فارسی غزل اور ہندی نظموں کا امتزاج خوبصورت ہے۔جس کے لئے ساح حسن حامد، اخلاق آہن اور ایس ایم حسینی کی کاوشات قابلِ تحسین ہیں۔حسبِ معمول کتابوں پر تفصیلی تبصرے اور قارئین کے خطوط کی شمولیت خوب ہے۔

مجموعی اعتبار سے دیکھیں تو عالمی فلک کا ہر شمارہ اپنے سابقہ شماروں سے بہتر ہو رہا ہے جس کا سارا کریڈٹ آپ کو جاتا ہے۔اللہ آپ کے حوصلوں کو توانائی عطا کرے۔آمین

سلیم انصاری ،جبل پور

السلام وعلیکم .... محترم احمد نثار صاحب، خلوص فراواں

ضخیم اور کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان سہ ماہی عالمی فلک کے ۴ اور ۵ دو شمارے میرے گھر کے افراد کو آپ کی خصوصی محبت کے روپ میں اس وقت ملے جب میں ممبئی میں تھا۔واپس ہوا تو سوچا تھا مطالعہ کے بعد تفصیلی تاثرات آپ کی خدمت میں ارسال کرونگا۔مگر اس بیچ میرے کئی ادبی دوستوں کی رحلت اور کچھ دن پہلے ایک ۴۲ سال پرانے ادبی دوست امین جس پوری صاحب کی وفات سے گہرے صدمے میں رہا اللہ غریق رحمت کرے۔آمین!

اپنی تمام رعنائیوں کے ساتھ عالمی فلک کے معیاری مشمولات اور قابلِ قدر موضوعات پر وقیع مواد اور اس کی دستاویزی پیش کش و اشاعت کے ساتھ آپ کی صحافتی کارکردگی اور مدیرانہ صلاحیتوں سے بے حد متاثر ہوا۔

نثر و نظم پر شامل تمام مشمولات لائق تحسین اور ادب کے تعلق سے دعوتِ فکر اور نئے نکتۂ نظر کے شہید ہیں۔ مگر باب مضامین میں خورشید حیات کا مضمون تنقید کی کشتی پر سوار دو سندباد، زم زم خانم کا ٹیگور اور پریم چند کے افسانوں کا تقابلی مطالعہ، سید محمود کریمی کا اقبال کا پیغام عمل، حقانی القاسمی صاحب کا صحرا سمندر اور سراب، صابر علی سیوانی کا حقیقی ادب اور ادب کا حقیقی منظر نامہ۔ فکشن افسانہ اور منظومات کے علاوہ اور زبانوں کا ادب میں مصری کہانی کا ترجمہ۔ بالخصوص ڈاکٹر رینو بہل سلسلہ وار مترجم تحریر۔ ان کہی داستان۔ خاص طور سے گوشۂ ڈاکٹر ثروت خان کی شخصیت پر تحریر اعلیٰ مرتب کے مضامین و مقالے۔ ان کے نظریات اور ادبی بصیرت کا احاطہ اور ہم جہت پہلوؤں کو انتہائی چابکدستی سے تحریر کیا ہے۔

میں دعا گو ہوں کہ آپ کی ادارت میں عالمی فلک اُفق ادب پہ ماہِ کامل بن کر روشن ہوتا رہے۔

صغیر اشرف

مکرمی ! تسلیمات

عالمی فلک نے کامیابی کے ساتھ اپنی اشاعت کے ایک سال پورے کر لئے جس کے لئے آپ مبارکباد کے مستحق ہیں کہ ایسے حالات میں بھی ثابت رہے جبکہ کورونا کا بھیانک روپ نظروں کے سامنے تھا جس نے کئی مشاہیر ادب کو بھی ہم سے چھین لیا۔ پیش نظر شمارے کو آپ نے خوب سے خوب تر بنانے کی کوشش کی ہے جس میں آپ کو کامیابی بھی ملی ہے۔ آپ نے مدیرانہ روایت کو متزلزل نہیں ہونے دیا۔ اداریہ میں اردو قارئین کی دن پر دن کمی دیکھ کر آپ نے افسوس کا اظہار کیا ہے اس پر ہم سب کو غور کرنا چاہئے کہ ہماری نئی نسل انگلش میڈیم میں تعلیم حاصل کرنا پسند کرتی ہے جو درست ہے۔ لیکن کیا ہم اپنی اولاد کو اردو کی تعلیم کا بندوبست اپنے گھر میں نہیں کر سکتے؟ اس مسئلے پر سارے لوگوں کو غور کرنا چاہئے جن کی مادری زبان اردو ہے اور ان کے بچے بھی اردو ہی میں بات چیت کرتے ہیں لیکن اردو رسم الخط سے واقف نہیں ہیں۔

بہر کیف یہ مسئلہ حل طلب ہے۔ مزید برآں اردو کے اخبارات و رسائل کی بقا بھی ایک مسئلہ ہے۔ ابھی اردو کے پرانے قارئین ان کی نگہبانی کرر رہے ہیں جبکہ ان کے بعد نئی نسل کو بھی اپنے اسلاف کی نیابت کے لئے تیار کرنا ضروری ہے۔ ان باتوں سے ہٹ کر جب ہم آپ کے عالمی فلک پر نظر ڈالتے ہیں تو مسرت محسوس ہوتی ہے کہ آپ نے ۳۲۰ صفحات پر محیط اس رسالے کو لائق مطالعہ اور مفید معلومات پر مضامین سے سجا کر پیش کیا ہے کہ

قارئین کو مایوسی نہیں ہوتی۔

حمد ونعت اور اداریہ کے بعد تقریباً سو صفحات پر محیط گوشہ ڈاکٹر ثروت خان جس میں چودہ مشاہیر کے مضامین موصوفہ کی حیات فکر ونظر اور ان کے فن کے تعلق سے معلومات کی روشنی قارئین کو پہنچاتے ہیں۔ بشیر بدر کی غزلوں میں معنی کی طلسم کشائی پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی نے خوب کی ہے۔ حقانی القاسمی نے ظفر اقبال ظفر کی شاعری پر بعنوان صحرا، سمندر اور سراب عمدگی کے ساتھ اظہار خیال کیا ہے۔ جبکہ صابر علی سیوانی نے حقیقی ادب اور ادب کا حقیقی منظر نامہ پیش کر کے اپنی ناقدانہ بصیرت کا ثبوت دیا ہے۔ اور عبدالصمد کے ناول کشکول پر ڈاکٹر سرور حسین نے بھی اپنی آرا کا اظہار خوب کیا ہے۔

اردو میں مقالہ نگاری کے اصول ڈاکٹر عبدالمتین، دھنباد کا مضمون مفید کارآمد اور معلومات افزا ہے۔ بطور خاص نئے مقالہ نگاروں کو مستفیض ہونے کا موقع اس مضمون سے فراہم ہوگا۔ نیز پرانے مقالہ نگار کو بھی اس سے فائدہ پہنچے گا۔ اسی طرح پاگل خانے کا دستور سیمیں کرن (پاکستان) کا فکشن بھی عمدہ ہے۔ اور لومبارڈی، سرور غزالی (برلن جرمنی) کا مطالعہ ہمیں ایک نئے جہان کی سیر کراتا ہے جس میں ماضی کے واقعات ہماری نظروں کے سامنے ہوتے ہیں۔ ڈاکٹر ولاء جمال العسیلی (قاہرہ، مصر) کی کہانی سوراخ حقیقت پر مبنی پر تجسس ہے جو قارئین کو اپنی گرفت میں رکھتی ہے۔ اور گھر کا چراغ ڈاکٹر اختر آزاد کا ایک ایسا افسانہ ہے جو ہندوستانی سماج کی عکاسی کرتا ہے۔

بقیہ منظومات کا حصہ بھی خوب ہے اور تبصرے کی روایت کو بھی آپ نے برقرار رکھا ہے۔ قارئین کے خطوط پڑھ کر عالمی فلک کی مقبولیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

حلیم صابر

محترم احمد نثار صاحب،

عالمی فلک کا تازہ شمارہ۔ ۵، اکتوبر تا دسمبر) کچھ روز پہلے موصول ہوا۔ اس عنایت کا بے حد شکریہ۔

ڈاکٹر ثروت خان اردو ادب کی مصروف شخصیت ہیں اور ان کی ادبی خدمات سے کون نہیں واقف۔ ڈاکٹر نثار احمد فاروقی نے انٹرویوں کے ذریعے ان کی پوری زندگی کا خاکہ قارئین کے سامنے کھینچ کر دکھ دیا۔ ان پر لکھے مضامین بھی ان کی ادبی خدمات کی بھرپور عکاسی کرتے ہیں۔ ایک بات کی کمی محسوس ہوئی۔ اگر ان کا لکھا کوئی افسانہ یا ان کے ناول کا باب بھی اس گوشے میں شامل ہوتا تو چار چاند لگ جاتے۔ خیر، اس کامیاب گوشے کے لئے

ڈاکٹر ثروت خان اور مدیر صاحب کو بے حد مبارک۔

سیمیں کرن کا افسانہ ''پاگل خانے کے دستور'' بے حد پسند آیا۔عورتوں پر ہونے والے تشدد، گھٹن بھری زندگی کو نہ صرف اسے محسوس کیا بلکہ بڑی سنجیدگی سے اس موضوع کے ساتھ انصاف کیا ہے۔ Feminism کا علمبردار بھی کہا جا سکتا ہے کیونکہ عورت کی زندگی سے جڑے مرد کے ہر رشتے چاہے وہ باپ ہو، بھائی ہو، شوہر ہو یا بیٹا سب اس کو دبوچ کر رکھنا چاہتے ہیں۔اعزازِ بیان دل کو چھو گیا۔سرور غزالی کا ''لومبارڈی'' موجودہ دور کے حالات میں اٹلی کے ۳ بھورت گاؤں لومبارڈی کی خوشحالی، خوبصورتی اور پھر کرونا کی چپیٹ میں آنے کے بعد کا دل خراش بیان اس کہانی کو خوبصورت بناتا ہے۔

ڈاکٹر ولا جمال کا افسانہ ''سوراخ'' بدلتے دور اور ٹیکنولوجی کے کم سن جوان ذہنوں پر ہونے والے اثرات کو لے کر ایک فکرمند ماں کے جذبات کی عکاسی بڑے اچھے سے کی ہے۔

ڈاکٹر اختر آزاد کا افسانہ ''گھر کا چراغ'' پڑھ کر طبیعت خراب ہوگئی۔ان کے پہلے بھی کئی افسانے پڑھ چکی ہوں۔وہ ایک معروف افسانہ نگار ہیں مگر افسوس ان کے قلم کی لغزش نے بڑا مایوس کیا۔

''خزانے کا نقشہ'' معنی خیز اور خوبصورت افسانہ ہے۔ترجمے کے ذریعے دوسری زبانوں کے ادب سے بھی آشنائی ہو جاتی ہے۔شاعری کا حصہ بھی معیاری اور دلچسپ ہے۔اس شمارے کو معیاری اور دلچسپ بنانے کے لئے جو محنت کی گئی ہے وہ صاف نظر آتی ہے۔خوبصورت رسالہ پڑھنے کو دینے کے لئے بہت بہت شکریہ۔

ایک اور بات کہنا ضروری ہے۔میری نظر میں مدیر صاحب کی عزت اور بھی بڑھ گئی جب میں نے مکتوبات میں سب سے پہلے خط شموئل احمد صاحب کا پڑھا۔وہ چاہتے تو اسے رد بھی کر سکتے تھے۔مگر اس خط کو چھاپ کر انہوں نے ایمانداری کا ثبوت دیا ہے۔سلامت رہیں۔

رینو بہل، چنڈی گڑھ

جناب نثار صاحب سلام مسنون!

عالمی فلک کا ۵واں شمارہ موصول ہوا۔شمارہ کئی اعتبار سے اہمیت کا حامل ہے۔ڈاکٹر ثروت خان پر بھرپور گوشہ شائع کیا گیا ہے۔دیگر مشمولات بھی خوب ہیں۔معیاری کتابی سلسلہ کے لئے مبارک باد اور نیک خواہشات۔

سراج اصلاحی